پاکستانی اُردو کے خدوخال
مرتبہ
ڈاکٹر عطش دُرّانی
PAKISTAN
GOLDEN
50
ANNIVERSARY
JUBILEE
مقتدرہ قومی زبان
پاکستان

پاکستانی اُردو کے خدوخال

مرتبہ

ڈاکٹر عطش دُرّانی

مقتدرہ قومی زبان

پاکستان

سلسلہ مطبوعات: ۳۲۸

عالمی معیاری کتاب نمبر: ۹-۱۷۶-۴۷۴-۹۶۹ ISBN (مجلد)

عالمی معیاری کتاب نمبر: ۰-۱۷۵-۴۷۴-۹۶۹ ISBN (پیپر بیک)

○

طبع اول ———— ۱۹۹۷ء

تعداد ———— پانچ سو

قیمت ———— مجلد : ۱۳۰ روپے

پیپر بیک : ۹۰ روپے

فنی تدوین ———— شکیل منگلوری

کمپوز کاری ———— منظور احمد انجم

پروف خوانی ———— محمد بخش ہاشمی، حاجی غلام مہدی

سرورق ———— قسور علی خاموش

اہتمام ———— اجمل وجیہہ

مطبع ———— ایس ٹی پرنٹرز، گوالمنڈی، راولپنڈی

ناشر ———— افتخار عارف

صدر نشین

مقتدرہ قومی زبان، ایچ ۸/۴،

پطرس بخاری روڈ، اسلام آباد۔

○

پیش لفظ

گولڈن جوبلی تقریبات کے حوالے سے "پاکستانی اردو کے خدوخال" پیش خدمت ہے۔ پاکستان کی قومی زبان اردو معتبر عالمی اداروں کے اعدادوشمار کے مطابق دنیا بھر میں اختصاص رکھتی ہے۔ اردو پاکستان کے علاوہ بھارت، بنگلہ دیش سمیت دیگر ممالک میں بھی بولی، پڑھی اور سمجھی جاتی ہے مگر ہمارا خیال ہے کہ بنیادی نظری، تہذیبی، معاشرتی، سیاسی اور دیگر اسباب کی بنا پر پاکستانی اردو کے خدوخال اور جگہوں پر مستعمل اردو کے مقابلے میں مختلف ہوتے جا رہے ہیں۔ یہ ایک ایسا موضوع ہے جس کی کئی جہتیں اور متعدد تشریحیں ہیں، اس لیے اس امر کا علمی سطح پر جائزہ لینا بہت ضروری ہے۔ پاکستانی اردو نہ صرف وجود میں آ رہی ہے بلکہ وجود رکھتی ہے۔ مسئلہ صرف اس کے علمی تناظر کا ہے اور اس کتاب میں ہم نے صاحبان نظر کو اسی طرف متوجہ کیا ہے۔ ہمیں یہ احساس ہے کہ تمام مسائل اور پہلوؤں کا احاطہ نہیں کیا جا سکا ہم نے پوری کوشش صرف کی ہے کہ اس کے زیادہ سے زیادہ گوشے اُجاگر کر سکیں، تاہم یہ اعتراف لازم آتا ہے کہ ابھی بہت سے پہلو تحقیق طلب ہیں، بہت سی جہتیں توجہ چاہتی ہیں۔

"پاکستانی اردو" ڈاکٹر عطش درانی کا پیش کردہ ایک ایسا فرضیہ تھا جسے انھوں نے بہت محنت، توجہ اور سلیقے سے اہل نظر کے سامنے پیش کیا اور پھر اس سلسلے میں دیگر صاحبان علم نے اپنے اپنے خیالات کا اظہار فرمایا جن کا فرداً فرداً شکریہ بھی واجب ہے۔ علمی مسائل پر اختلافِ رائے مکالے کا سبب بنتا ہے اور مسئلے کی تفہیم و تفسیر میں نئے زاویے سامنے آتے ہیں۔

زبان کے بہت سے ایسے شعبے ہیں کہ جن میں تحقیقی و علمی کام سرانجام دیا جانا چاہیے۔ جب ہم "زبان" کی بات کرتے ہیں تو اس سے ہماری مراد صرف اس مخصوص طرز سے نہیں ہوتی جو علم و ادب، تحریر و تقریر کے شعبوں یا فنون اور ذرائع ابلاغ کے حوالے سے وجود میں آتی ہے بلکہ اس کے وہ تمام سماجی لسانی (Sociolinguistic) انواع مراد ہوتے ہیں جو ہماری زندگی کے متنوع انداز، رنگارنگی اور بوقلمونی کے حوالے سے سماجی و لسانی ابلاغ کے پورے تناظر میں ہمیں نظر آتے ہیں۔ زبان ایک زندہ کُل کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ تحریر، تقریر، گفتگو اور اشارات و علامات کے حوالے سے ادیبوں اور اہل قلم کی دنیا سے ماوراء مدرسوں، دانش گاہوں، مذاکروں، سیمیناروں، مسجدوں، منبروں، سیاسی جلسوں، کمپوزروں، کمپیوٹروں، اشتہاروں، ادویہ اور اشیائے صرف کے ڈبوں، دکانوں، اڈوں، بازاروں، گلی محلوں، گانوں، فلموں، مکالموں اور ترجموں تک کے متعدد عضویوں کو ملا کر شعوری یا لاشعوری طور پر ایک نامیاتی عمل کی تشکیل کرتی ہے۔ زبان کا یہی عمل کسی قوم میں متنوع وسیلوں اور ماخذوں کے تانے بانے سے زبان کا اپنا انوکھا اور منفرد

گلدستہ وجود میں لاتا ہے۔ پاکستانی اردو کے خدوخال ایسے ہی پہلوؤں سے تخلیق پائے ہیں۔

اس مجموعے میں بعض ایسے پہلوؤں پر مضامین بھی شامل کیے گئے ہیں جو چند خصوصی جہتوں کو سامنے لاتے ہیں جیسے انگریزی کے اردو پر اور اردو کے انگریزی پر اثرات کے حوالے سے یا پاکستان کی دیگر زبانوں کے ساتھ سماجی لسانی تعاملات کا ذکر۔ اردو کے بعض ادیبوں اور شاعروں کے اپنے تجربات کا بیان بھی شامل ہے جن کی تحریریں لسانی تشکیلات میں تبدیلی کے سلسلے میں مذکور ہوتی ہیں یا پھر بعض ایسے تجزیے جو اردو کی ادبی، علمی، تعلیمی، سائنسی، اشتقاقی اور ثقافتی نوعیتوں کو پیش کرتے ہیں۔

ایک طرح سے یہ پاکستان میں اردو کے پچاس سال کا تذکرہ ہے۔ آزادی کے جشنِ زریں کے موقع پر اسے شائع کرکے ہم نے اس مناسبت سے بھی اپنا کردار ادا کرنے کی کوشش کی ہے۔.....

——— افتخار عارف

مشمولات

حصہ چہارم

حصہ پنجم

حصہ ششم

حصہ اول

پاکستانی اردو کے بدلتے ہوئے خدوخال

پاکستانی اردو کے خدوخال

ڈاکٹر عطش درانی

اردو برصغیر کی زبانوں، بولیوں، روزمروں، محاوروں، بول چال، شعر و ادب اور علم و تحقیق کی ایک ایسی مشترکہ تہذیبی میراث ہے، جو اپنے بولنے والوں کی وجہ سے نہیں، بلکہ استعمال کرنے والوں کے باعث پہچانی جاتی ہے۔ اس لحاظ سے یہ دنیا کی واحد اور منفرد زبان ہے، جس کے "بولنے والوں" کی اپنی کوئی الگ اور دوسری زبان (مادری، مقامی، علاقائی) بھی ہو سکتی ہے۔ اس لیے دنیا بھر کے زبان شماری کرنے والوں کو زبان بولنے والوں (speakers) کے حوالے سے ایک عجیب سی مشکل درپیش ہوتی ہے اور اس میں وہ عموماً ٹھوکر ہی کھاتے ہیں۔ اپنے صوتیاتی، ساختیاتی، معنویاتی، قواعدی، نحوی اور لغوی اصولوں اور املا کے لحاظ سے یہ دیگر مقامی زبانوں سے اس حد تک مماثل اور مربوط ہے کہ بعض اوقات اسے مادری زبان سے جدا کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے دیسی (Indigenous) اور مقامی (Native) بولنے والوں (Speakers) میں امتیاز نہیں ہو پاتا۔ عرف عام اور گروہی سیاست نے قطع نظر اردو بولنے والے (Urdu speaking) کی اصطلاح معانی کو بہت محدود کر دیتی ہے جبکہ اردو استعمال کرنے والے (Urdu users) ہی اس مفہوم کے صحیح حقدار ٹھہرتے ہیں۔ اردو بولنے اور لکھنے والا خواہ دوسری کوئی بھی زبان بولتا اور لکھتا ہو، وہ اردو بولنے اور لکھنے والا ہی شمار ہوتا ہے۔ اقبال، فیض اور ظفر علی خان زبان کے حوالے سے اسی طرح سند کی حیثیت رکھتے ہیں، جیسے میر، غالب، ابوالکلام، محمد حسین آزاد وغیرہ۔ اس حوالے سے صرف برصغیر میں ان کی تعداد پچاس کروڑ سے زائد ہے

اور یوں یہ دنیا کی تیسری بڑی زبان (انگریزی اور چینی کے بعد) ٹھہرتی ہے۔

ویسے بھی اردو بول چال کے سانچے (Registers) بے حد کم اور محدود رہے ہیں نیز بہت بڑے عرصے تک اردو ادبی کینڈوں (Genres) سے باہر نکل نہیں سکی، اس لیے یہ کبھی بھی بولی (dialect) کی سطح پر جا کر "اُردو بولنے والے" کی صحیح مصداق نہیں ٹھہر سکی۔ عرف عام میں "اُردو بولنے والے" اردو بولی نہیں بولتے تھے بلکہ عادتاً صرف اردو بول چال کا کینڈا (Genre) استعمال کرتے تھے۔ چنانچہ یہ کینڈا کوئی بھی استعمال کرتا ہو وہ اردو بولنے والا (Urdu speaking) ہی شمار ہوگا۔

اردو زبان کا آغاز پنجاب سے ہوا یا دکن سے، شمالی ہند میں پروان چڑھی یا اس نے کلکتہ میں ادبی فروغ پایا، سندھ میں اس کی جڑیں ہیں یا سرہند میں، مگر پاکستان بننے کے بعد اسے برگ و بار لانے کے لیے جو آزاد فضائیں یہاں میسر آئیں، وہ اس سے پہلے مفقود تھیں، سوائے چند ریاستوں (حیدر آباد، بھوپال، بہاول پور، خیر پور وغیرہ) کی سرپرستی کے یا کسی حد تک انگریزوں کے کالجوں میں منشیوں کی قلم فرسائی کے۔ تحدید اور تسدید کے باوجود اس زبان نے قیام پاکستان سے قبل برصغیر میں اپنی حیثیت منوا رکھی تھی اور ہر پہلو سے ایک وسیع ذخیرۂ ادب کا سیل رواں تھا، جو لاکھوں اہل قلم اور کروڑوں قارئین کو اپنے جلو میں لیے ہوئے تھا۔ تحریک پاکستان اور اردو ہندی تنازع کے سبب سیاسی توجہ بھی حاصل تھی اور یوں قیام پاکستان کے ساتھ ہی اسے پاکستان کی قومی زبان کا مقام ملا۔ رسمی طور پر ہی سہی مگر آج تک اردو پاکستان کے ہر آئین کی رو سے قومی زبان ہی کا درجہ رکھتی ہے اور اس کے فروغ کے لیے مقتدرہ قومی زبان کے علاوہ بھی سینکڑوں ادارے کام کر رہے ہیں۔

پاکستان میں اردو کو پھر سے یہاں کی دیگر زبانوں کے ساتھ میل ملاپ کے مواقع میسر آئے۔ باہمی لین دین کا عمل وسیع پیمانے پر جاری ہوا۔ سرکار دربار میں رسوخ نہ

پانے کے باجود یہ سیاستدانوں کی ضرورت بھی بنی رہی اور باہمی رابطے، اشتراک و یک جہتی کے ساتھ ساتھ دفتروں، عدالتوں اور تعلیمی اداروں، مذہبی درسگاہوں اور علم و فن کی ضرورتوں کی زبان بھی ٹھہری۔ سائنس اور ٹکنالوجی کے فروغ میں بھی اس نے اپنا کردار ادا کیا اور طبی، انجینئری اور زرعی درسگاہوں میں بھی بہت حد تک تشریح و تدریس کی زبان بنی رہی۔ چنانچہ آزادی کے ان پچاس برسوں میں پاکستان میں رفتہ رفتہ اس باہمی تعامل سے اردو کا ایک نیا لہجہ، منفرد آہنگ اور جدا اسلوب وضع ہو چکا ہے۔ ہمارا بنیادی اور مسلمہ مفروضہ (Assumption) یہ ہے کہ اردو نے اپنے تمام رنگ برصغیر کی مقامی زبانوں ہندکو اور پالی (شمالی پنجاب)، ہندی/ہندوی (وسطی پنجاب)، دکھنی (جنوبی ہند)، اُپ بھرنش (شمالی ہند) اور کھڑی بولی (اطراف دہلی) وغیرہ سے حاصل کیے ہیں، جیسے قدیم زمانے میں یونانی، بعدازاں فارسی، عربی، پھر یورپی زبانوں خاص طور پر انگریزی کے ساتھ اشتراک عمل سے اپنا رنگ و روپ ملا۔ پاکستان میں اب یہ زبان پھر سے اپنے ماخذوں کے ساتھ ترقی کی اگلی منزلوں میں تعامل کر رہی ہے اور آئندہ ایسے استفادے کے امکانات مزید بڑھتے جائیں گے۔

پچھلے پچاس برسوں سے پاکستان میں اردو کا جو کینڈا (genre) فروغ پا رہا ہے اور اس نے جس طرح زبان کے نئے نئے سرچشموں اور رنگا رنگ ماخذوں سے استفادہ کیا ہے، اس سے اب پاکستانی زبان کے واضح خدوخال ابھر کر سامنے آ چکے ہیں۔ آج کی پاکستانی اردو بالکل اسی طرح کلاسیکی اردو سے ممتاز، جدا اور منفرد ہو چکی ہے، جس طرح امریکی انگریزی اپنے ہجوں، املا، معنی، تسمیہ، لفظ سازی اور نولفظیت کے حوالے سے الگ پہچانی جاتی ہے۔ اگلے پچاس برس میں یقیناً یہ ایک جدا زبان ٹھہرے گی۔ اس جائزے میں جو بات ہم بطور فرضیہ (Hypothesis) یا یہ ثبوت (Thesis) تک پہنچانا چاہتے ہیں، وہ یہی ہے کہ پاکستانی اردو کی اپنی الگ رنگت (shade) ہے اور

اس رنگت کو فروغ انہی اصولوں کی روشنی سے ملتا ہے جو یہاں کے باشندوں کے اردو بولنے کے لہجوں اور لکھنے کے اسلوبوں سے وضع ہوتا ہے۔ یہ اصول واضح اور اظہر من الشمس ہیں۔ انھیں تقابلی بیانیہ (Comparative descriptive) انداز سے جانچنے اور نکات وار بیان کرنے اور مرتب کرنے کے بعد اردو کی لسانی ترقی کے کام کو آگے بڑھایا جاسکتا ہے۔

پاکستانی اردو کا تاریخی ورثہ اتنا متمول اور اس کا تذکرہ اس قدر عام ہے کہ اسے یہاں دہرانے کی ضرورت نہیں۔ یہ ورثہ جہاں اردو کے کلاسیکی شعری و ادبی ذخیرے، علمی و سائنسی تحریروں اور صحافت و سیاست کے خارزاروں سے نکل کر سامنے آیا ہے، وہاں بازاروں میں لین دین، تعلیم یافتہ اور ان پڑھ ہر دو قسم کے افراد کے روزمرہ استعمال، ادبی نگارشات نیز مختلف اور متنوع روزمروں اور محاوروں کے بولنے والوں نے بھی اس کے فروغ میں خاطر خواہ حصہ لیا ہے، یہی عمل اب پاکستان میں دہرایا جارہا ہے۔ یہ عمل بول چال کے سانچوں (Registers)، ثقافتی کینڈوں (genres) اور تحریری محضروں (discourses) سبھی میں دہرایا گیا ہے۔

پاکستانی اردو کے بڑے ماخذ ہمارے کلاسیکی اور روایتی شعر و ادب، مشاعروں کی ریت اور ادبی نگارشات کے تنوع اور تجربات کے علاوہ مقامی الفاظ، معانی، روزمروں، محاوروں، قواعد و انشا کے طریقوں، صوتیاتی انداز اور دخیل و دوغلے الفاظ کی تشکیل جیسے بیسیوں پہلوؤں سے سامنے آتے ہیں۔ پاکستان کی دیگر زبانوں کے علاوہ اب انگریزی بھی دخیل الفاظ کا ایک بہت بڑا ماخذ ہے بلکہ بول چال میں تو اسما (Nouns) سے بڑھ کر اب افعال، مصادر اور اسم مجرد (Abstract) و کیفیت تک کے الفاظ اور ترکیبیں انگریزی سے وارد ہونے لگی ہیں، جن کی جھلک ادبی تحریروں میں بھی عام طور پر دکھائی دے رہی ہے۔ الفاظ کے قدیم معنی بدل رہے ہیں، نئے روزمرے اور محاورے تو شامل

ہو ہی چکے ہیں، جملوں کی ساخت اور صرفی و نحوی تبدیلیاں بھی واضح ہیں، مقامی اصوات اور عالمی زبانوں کے اثرات کے باعث حروف تہجی کی تعداد اور املا کے قواعد بھی بدل رہے ہیں۔ ایسے چند گوشوں کا ایک اجمالی سا جائزہ یہاں پیش کیا جا رہا ہے۔

پاکستان میں اردو ایک نئی اور اجنبی زبان نہیں۔ چند دور دراز علاقوں کو چھوڑ کر یہ آزادی سے پہلے صدیوں سے مقامی بول چال، لین دین، شعر و ادب، مراسلت اور درس و تدریس کا ذریعہ رہی ہے۔ لیکن زیادہ تر زور ادبی مخصوص (discourses) تک رہا۔ چنانچہ اس کا کینڈا وقت کے ساتھ ساتھ بدلتے رہنا ایک لازمی اور لابدی امر تھا، جو اب بھی وقوع پذیر ہے۔ کوہلر اور ینوسکی جیسے ماہرین بشریات کا کہنا ہے کہ سماجی و تاریخی قوتیں ثقافتی نمونے اور انداز وضع کرتی ہیں۔ ثقافت زبان کا انداز متعین کرتی ہے اور جواباً زبان کسی قوم کا اجتماعی شعور پروان چڑھاتی ہے۔ جب کوئی غیر ملکی زبان استعمال کی جاتی ہے تو وہ اپنے ساتھ ثقافتی اثرات لے کر آتی ہے اور انہی اثرات سے زبان کا کینڈا بھی بدلتا ہے۔ لسانی تعامل کی بات کریں تو ماہر لسانیات ایف ڈی سائیسر جیسا ماہر کہتا ہے کہ زبانوں کے میل جول کا عمل دو طرفہ ہوتا ہے، وہ جدت طرازی کو زبان کی شکستگی کے حوالے سے روکتا ہے اور مثبت پہلو یہ ہے کہ اسے عام کر کے زبانوں کے میل کو پسند کرتا ہے۔ لسانیات کی اصطلاحوں میں بات کریں تو ہمیں اوریل وینریچ جیسے ماہر کے ساتھ ہم آواز ہو کر کہنا پڑتا ہے کہ جب دو زبانیں باہم تعامل کرتی ہیں تو وہ صرفیہ (Morpheme) کی سطح پر باہم ملتی ہیں (جیسے ریل گاڑی، چوکی دار، اگال دان)۔ یہ تعامل چار طرح سے سامنے آتا ہے:-

(الف) دخیل الفاظ: جیسے صابن، پرات، تولیہ، لالٹین، ہسپتال تو مغربی زبانوں سے تاریخ کے بعد داخل تھے ہی، ان کے علاوہ "کفنانا"، "فلمانا"، "فراڈیا"، "فلائیٹ" وغیرہ بھی اب اردو میں دخیل اور مروج ہو چکے ہیں۔ علاوہ ازیں توڑ مروڑ کا عمل بھی جاری

ہے، جیسے "تلاشنا"، "تعبیرنا" جیسے فعل متعدی۔

(ب) معنویاتی تبدیلی: جیسے خصم، زحمت، عنایت، تکلیف، بندہ، "اپنا پن"، "پس رو"، "چلت انداز"، "بندہ بننا"۔

(ج) ترجمہ کاری: جیسے "ماہ عسل"، "جزوقتی"، "غسل آفتابی"، "جشن سیمیں"۔

(د) دوغلے الفاظ: جیسے "گنجلدار"، "ریل گاڑی"، "تھانیدار"۔

ان میں معنویاتی تبدیلی کے ساتھ ہم قواعدی تبدیلی بھی شامل کر سکتے ہیں جیسے صرفی انداز میں تبدیلی مثلاً جمع متکلم مونث "ہم جائیں گے"، کی بجائے اب "ہم جائیں گی" پاکستانی درسی کتب میں اور عام بول چال میں بھی مستعمل ہے اور نحوی ترکیب میں تبدیلی جیسے "نے" اور "کو" کا استعمال مثلاً "مجھے لاہور جانا ہے" کی بجائے "میں نے لاہور جانا ہے" اب درست معلوم ہوتا ہے بلکہ اکثر ادیب اسے استعمال کر رہے ہیں۔ املا میں امالے کا استعمال "میں کوئٹے سے آیا، گھوڑے پر بیٹھا" وغیرہ۔ املا میں ہائیہ آوازوں کی تبدیلی جیسے "پودہ"، "راجہ" میں "ہ" کا استعمال وغیرہ۔ معنویاتی تبدیلی میں اسلوبیاتی انحراف بھی شامل ہوتے ہیں جیسے محاوروں، روزمروں، ترکیبوں میں فرق مثلاً "شب اجالنا"، "نیلے پانیوں کی مسافتیں"، "پھنے خان"، "خوابوں کی چاندنی"، "چھکتی ہوئی کھڑکی" وغیرہ۔ یہ کام شاعر یا ادیب عام طور پر انجام دیتا ہے۔ کیا یہ زبانوں کی شکست وریخت ہے یا نئے تجربات کے نتائج؟

پاکستانی اردو کے ادیبوں نے اپنے متون (Texts) میں فکری اور ساختمانی سطح پر بھی ان گنت تجربے کیے ہیں، جن کا جائزہ کسی تنقیدی مضمون میں لیا جاسکتا ہے تاہم انھوں نے اسلوبیاتی حوالے سے قواعدی معیارات سے جو انحراف کیا ہے اس کا تجزیہ

ہمارے موجودہ دائرہ کار میں آتا ہے۔ انحراف کے یہ تجربے نہ صرف ہو رہے ہیں بلکہ بڑھتے چلے جا رہے ہیں اور اب تو یہ اس قدر بڑھ چکے ہیں کہ کلاسیکی اردو کے تعلیم یافتہ فرد کے لیے انھیں سمجھنا بھی بعض اوقات مشکل ہو جاتا ہے۔ "شب کو اجالنے کا ہنر" (گلزار بخاری) کا ذکر معنویاتی انحراف کے ضمن میں ہم کر چکے ہیں۔ اس طرح معیار سے انحراف کی مزید چند مثالوں کو ذیل میں پیش کرنے سے پاکستانی اردو کے خدوخال کے اس بنیادی قواعدی پہلو کی طرف توجہ دینے اور غوروخوض کرنے میں آسانی ہو گی:۔ ع

زمیں پہ پاؤں دھرا تو "زمین چلنے" لگی (شکیب جلالی)

مرے کمرے میں "یادیں سو رہی ہیں" (کفیل آذر)

"مہکتے میٹھے" دریاؤں کا پانی (ناصر کاظمی)

وہی لمحہ میری "آنکھوں میں چمٹ جائے گا" (شہزاد احمد)

میں جس مکان میں رہتا ہوں اس کو "گھر کر دے" (افتخار عارف)

حد افق پر "شام تھی خیمے میں منتظر" (وزیر آغا)

گزرتے موسموں کے "قہر سے گھائل بدن سنولا گئے" (ریاض مجید)

چھت پر "پگھل کے جم گئی" خوابوں کی چاندنی (عادل منصور)

یہ پیڑ "دھوپ نہائیں" جو ابر چھٹ جائے (راشد متین)

وہ "چھکتی ہوئی کھڑکی"، نہ "مہکتے در و بام" (سلطان اختر)

"رات کے ہاتھ" مرے جسم کو سہلاتے ہیں (توصیف تبسم)

"نیند کے در" پہ ہوتی ہے دستک (وحید اختر)

"خواب تصنیف کر رہا تھا" (نثار ناسک)

"جلی ہے شاخ ثمر"، خواب "پا بریدہ" ہوئے (ممتاز کنول)

پھول کی طرح مرے "جسم کا ہر لب کھل جائے" (پروین شاکر)

وہ چاند بن کے مرے "جسم میں پگھلتا رہا" (پروین شاکر)

میں "بکھرے پانیوں" میں زمین تک اتر گیا (بشیر سیفی)

لپٹی ہے شاخ شاخ سے "سانپوں کی شوک" بھی (یوسف حسن)

"چاندنی کا گھر" میرے گاؤں میں تھا (اسلم کولسری)

پھر سمندر سے یہ "گھرائی جلی جائے گی" (سلیم کوثر)

جسم "پگھلی ہوئی آگ" میں غسل کرنے لگے (شہریار)

یہ انحرافات صرف نظم ہی میں نہیں، پاکستانی اردو نثر میں بھی در آئے ہیں۔ واقعیت پسندی، حقیقت نگاری اور کائنات شناسی کے رجحانات نے جہاں شاعری میں کئی اسالیب وضع کیے ہیں وہاں ان رجحانات نے اردو نثر کو بھی بہت حد تک متاثر کیا ہے، اگرچہ ان کا جائزہ یہاں نہیں لیا جا سکتا۔ اردو نثر کی دیگر مثالوں کا تفصیلی تذکرہ ہم آگے چل کر کریں گے۔ یہاں معیار سے انحراف کی کچھ مثالیں پیش کیے بغیر ہم آگے نہیں بڑھ سکتے:۔

(الف) انگریزی لفظ کے ترجمے کے معیار سے انحراف:

وہ "کرائسس" جو اس فقرے میں سمٹ آیا۔ (آصف فرخی ۱۹۹۴ء۔ نقاد بطور دشمن، "دریافت")

(ب) ثقیل اصطلاحوں کی طرز پر معنویاتی انحراف:

شاعرانہ زبان "علمی دبازت" کی متحمل نہیں۔ (ادیب سہیل، ۱۹۹۴ء، فارمل ازم، "صریر")

(ج) قدیم ضرب الامثال /محاوروں کی طرز پر وضع جدید:

"مرا ہوا آدمی" اپنے کام کا نہ دوسرے کے کام کا" (انور سجاد ۱۹۹۴ء۔ تھیٹر کی تلاش، "ادبیات")

تاریخی حوالے سے دیکھا جائے تو پاکستانی اردو کا واضح نکھار ۱۹۶۵ء کے بعد سامنے آتا ہے۔ اس سال پاک بھارت جنگ نے پاکستانی اردو کی انفرادیت کو بہت حد تک آگے دھکیلنے اور کلاسیکی اردو کا رخ موڑنے کے لیے کسی طاقتور بم کا سا کردار ادا کیا۔ بلکہ ۱۹۷۱ء میں سقوط مشرقی پاکستان کے بعد تو اس پاکستانی اردو نے بھی نئے نئی سمتوں کا واضح تعین کر لیا ہے جن میں معنویاتی "انحراف" زیادہ واضح ہے۔ اردو شعر و ادب میں ایسی ہزاروں مثالیں ملتی ہیں، جن سے پاکستانی اردو کے اس اصول "معیار سے انحراف" کا ثبوت فراہم ہوتا ہے۔ معیار سے یہ انحراف معنویاتی اور قواعدی دونوں طرح سے ہو رہا ہے۔

تحریری زبان کے حوالے سے پاکستانی اردو کے دیگر خدوخال کا جائزہ لینے کا آغاز ہم حروف تہجی کی بحث سے کرتے ہیں۔ قیام پاکستان کے وقت عام خیال یہ تھا کہ اردو میں حروف تہجی کی تعداد ۳۶ یا ۳۷ ہے۔ بعض افراد ہمزہ کو شامل کرتے تھے۔ بعض بھاری یا ہائیہ اصوات کے حروف بھ، پھ، تھ کو شامل کر کے ۴۷ قرار دیتے تھے۔ ان میں لھ، مھ، نھ شامل نہیں تھے۔ یعنی کولھو، دلھن، تمھارا، تمھاری، انھیں، جنھیں وغیرہ کو کولہو، دلہن، تمہارا، تمہاری، انہیں، جنہیں لکھا اور بولا جاتا، مگر اب ایسا نہیں ہے۔ اسی

طرح "رھ" کی صوت "سرھانا" وغیرہ میں مستعمل ہے اور یوں آج یہ حروف ۵۵ یا ۵٦ سمجھے جاتے ہیں۔ پہلے "آ" کو الگ حروف شمار نہیں کیا جاتا تھا۔ اسے دو الف کے برابر قرار دیا جاتا تھا مگر اب شان الحق حقی، وارث سرہندی، ڈاکٹر سہیل بخاری اور ڈاکٹر فرمان فتحپوری جیسے اہل علم و قلم اور اسحاق جلالپوری، تاج محمد اور ڈاکٹر ممتاز منگلوری جیسے ماہرین تعلیم اس امر پر متفق ہیں کہ یہ ایک الگ آواز یا صوت ہے اور اسے "الف مد آ" کی بجائے صرف "آ" بولنا چاہیے۔ اسی طرح ایک اور بھاری صوت "وھ" کی انگریزی الفاظ "وھیل" (بمعنی پہیہ)، "وھیل مچھلی"، "وھائٹ ہاؤس" وغیرہ کے ساتھ اردو میں شامل ہو چکی ہے۔ اسی طرح نون غنہ (ں) الگ حرف صوت ہے اور ںھ (نھ) بھی ایک الگ حرف ہے، جیسے مونھ، بانھ وغیرہ۔ ان حروف کی ترتیب بھی پہلے اب پ ت ٹ ث وغیرہ ہوا کرتی تھی، جن میں ہائیہ اصوات شامل نہیں کی جاتی تھیں، انھیں آخر میں الگ سے لکھ دیا جاتا تھا مگر "اردو لغت" کی ترتیب اب ان کی شمولیت کے ساتھ یوں بنتی ہے:

ا، آ، ب، بھ، پ، پھ، ت، تھ، ٹ، ٹھ، ث، ج، جھ، چ، چھ، ح، خ، د، دھ، ڈ، ڈھ، ذ، ر، رھ، ڑ، ڑھ، ز، ژ، س، ش، ص، ض، ط، ظ، ع، غ، ف، ق، ک، کھ، گ، گھ، ل، لھ، م، مھ، ن، نھ، ں، ںھ، و، وھ، ہ، ء، ی، ے۔ ان اصوات میں اگر "پانی" اور "رانی" میں آنے والی صوت "ڼ" جو پنجابی، سرائیکی اور سندھی میں بھی پائی جاتی ہے، الگ شمار کر لی جائے اسی طرح نگ کی آواز جو جنگ، بنگ، رنگ میں آتی ہے الگ آواز اور جیسا کہ ڈاکٹر سہیل بخاری جیسے ماہرین نے تجویز کیا ہے کہ اس میں حرف کے اندر نقطے کی بجائے دائرہ دیا جائے تو اسے الگ حرف کے طور پر بھی شامل کیا جا سکتا ہے۔ یعنی ڼ۔ اس طرح اردو حروف تہجی کی تعداد ۵۸ ہو جاتی ہے۔ تدریس کے لحاظ سے ان کی ترتیب بھی ڈاکٹر ممتاز منگلوری اور بہت سے ایسے محققین کے خیال میں تعدداً استعمال

(frequency) کے حوالے سے ہونی چاہیے جو ان کی تحقیق کے مطابق یوں بنتی ہے:۔

ا، ے، ن، ر، ی، ک، و، ہ، م، ل، ت، س، ب، د، پ، گ، ج، ء، چ، ش، ع، آ، ح، تھ، ق، خ، ڑ، ز، ف، کھ، ٹ، بھ، ص، چھ، ض، ط، گھ، دھ، ٹھ، پھ، غ، ڑھ، جھ، نھ، ث، ڈ، ذ، ظ، مھ، ڈھ، ژ، رھ، لھ۔ ان میں اگر ان کے بعد "وھ"، "نھ"، ں اور ن کو شامل کر لیا جائے تو یہ ترتیب تعددِ استعمال کی ہو گی۔ لیکن یہ ترتیب یاد کرنے کے اعتبار سے بہت مشکل ہے۔ ہم صوت اور ہم شکل حروف زیادہ آسان ہوتے ہیں۔ پھر بھی پاکستان کے ٹیکسٹ بک بورڈ بڑے حروفِ علت (vowel) "ا"، "ی"، "و" کو شروع میں لانا ضروری سمجھتے ہیں۔ یہ رجحان ابھی ترقی پذیر ہے۔ دیکھیں آگے چل کر حروف تہجی کی ترتیب بھی کیا بنے۔ فی الوقت اردو لغت بورڈ کراچی کی مذکورہ بالا ترتیب یعنی ا، آ، ب، بھ، پ، پھ، ہی تسلیم کی جاتی ہے۔ وارث سرہندی کا "علمی اردو لغت" اور شان الحق حقی کا "فرہنگ تلفظ" بھی اسی ترتیب کے ساتھ شائع ہوئے ہیں۔

پاکستانی اردو کے دیگر خدوخال میں اردو الفاظ کے استعمال کی حد تک (۱) "انگریزی آمیزی یعنی انگریزی سے دوغلانا (۲) انگریزی سے ترجمہ (۳) انگریزی افعال کا بعینہٖ استعمال (کرنا، ہونا جیسے متعدی اور لازم مصادر کے ہمراہ)، (۴) عربی سے گریز اور فارسی امر کا زیادہ استعمال، (۵) مقامی الفاظ و تراکیب، روزمروں اور محاوروں کا استعمال اور (٦) مقامی زبانوں کے لہجے اور انداز پر اردو کی نو لفظیت (Neologisms) (۷) نئی اصطلاح سازی شامل ہیں۔ ذیل میں ہم ان کا ایک اجمالی جائزہ پیش کرتے ہیں:۔

جہاں تک انگریزی آمیزی کا تعلق ہے، یہ رجحان بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ اس کی ایک وجہ تو بولنے اور لکھنے والوں کی تن آسانی ہے۔ کون ترجمہ کرے اور کیا ترجمہ کرے۔ مفاہیم کا تنوع بھی حائل ہے۔ دوسری بڑی وجہ کا ذکر ہم کر چکے ہیں کہ اہل اردو

نے ادبی ثقافت کے فروغ کے شوق میں اردو بول چال کے سانچے ترقی نہیں کرنے دیے جس کے باعث اس بحران اور خالی جگہ کو انگریزی سانچوں کے ٹکڑوں نے پُر کیا۔ اردو اخبارات میں عام طور پر انگریزی الفاظ ہی نہیں، ترکیبیں اور جملے تک بعینہ ملیں گے۔ اخباری زبان سانچوں اور کینڈوں کو ساتھ ساتھ لے کر چلتی ہے، اس لیے ہمیں زیادہ تر اخباری زبان ہی کا تجزیہ پیش نظر رکھنا چاہیے۔ یہ خالی جگہیں کبھی انگریزی سے اور کبھی مقامی زبانوں سے پُر ہوتی رہیں۔ ان میں خاص طور پر جمع کے لیے انگریزی "S" کو اردو میں "ز" کی حیثیت حاصل ہے جیسے "فارم" کی جمع "فارمز"، کلاس کی جمع "کلاسز" وغیرہ اردو تحریروں میں عام ہیں۔ پہلے انھیں اردو طرز پر جمع بنالیا جاتا تھا، جیسے فارموں، کلاسوں، لیڈران، ہیڈماسٹروں، ایڈیٹروں، ایڈیٹران، ممبران وغیرہ۔ مگر اب تو یہ تکلف بھی نہیں کیا جاتا۔ اسی طرح "ازم" (ism-) جس کے لیے پہلے "یت" یا "پسندی" کے لاحقے اور امر استعمال ہوتے تھے، اب اکثر تن آسان ادیبوں کے ہاں متروک ہو رہے ہیں۔ پہلے انگریزی کے الفاظ ٹریٹمنٹ، ہول ٹائم، ڈسپلن، کامیڈی، ٹریجڈی وغیرہ اسما اردو میں لکھ دیے جاتے تھے اب تو ایسے انگریزی الفاظ کے اردو املا کا التزام بھی نہیں ملتا، انگریزی حروف ہی سے کام چلا لیا جاتا ہے۔ خاص طور سے اردو کے بڑے افسانہ نگاروں اور تنقید نگاروں کے ہاں اس کی کثرت ہے۔ کہیں کہیں دونوں طریقے یعنی اردو املا اور انگریزی ہجے ایک ہی جملے میں بھی ملتے ہیں۔ مثلاً:

"جب کوئی تہوار ہوتا Thanks Giving یا "لیبر ڈے" تو اچانک"

(بانو قدسیہ، ۱۹۹۴ء۔ موسم سرما میں نیلی چڑیا کی موت، "ادبیات")۔

"یہ بات محض Exposure کے خوف سے نہیں" یا پھر "نقاد کی دشمنی کا تصور یقیناً ایک تنقیدی Concept ہے۔ (آصف فرخی، محولہ بالا، ۱۹۹۴ء)۔

"دوسروں سے Share کرنے کی خواہش"

(سحر انصاری ۱۹۹۴ء، ممتاز حسین، اردو تنقید کا ایک معتبر نام، "قومی زبان")۔

"روسی فارملزم کی طرف آنے سے پہلے" یا "اگر اس ادبی Regimentation پر کسی جانب سے"۔ (ادیب سہیل، محولہ بالا، ۱۹۹۴ء)۔

"یہ اس کا پہلا "نائٹ میر" تھا"

(سلیم اختر، ۱۹۹۴ء، روشن دن کا تاریک رات میں سفر "تخلیق")۔

"وہ Chain Lover ضرور ہوگا۔ ۔ ۔ ۔ صرف یادوں کے Butt End سمیٹتا رہ جائے گا"۔

(پروین شاکر ۱۹۹۴ء۔ فراز کی شاعری۔ پاکستانی ادب ۱۹۹۴ء، حصہ نثر)۔

"طوفان میں خود کو خوش رکھنا بھی تو "نفسیاتی سبجیکٹ" ہے"

(آغا بابر، ۱۹۹۴ء۔ ناٹک سے وابستگی، "ادبیات")۔

اردو اخبارات میں یہ روش عام ہے، دیکھیے "اخبار اردو" کے ۱۹۹۵ء کے شمارے جن میں اس طرف خصوصی طور پر توجہ دلائی گئی ہے: "ان فٹ امیدوار"، "پروموشن بورڈ کا اجلاس"، "پلاٹوں کی الاٹ منٹ"، "پریشر گروپ ضروری ہو گیا"، "سٹریٹ پاور کے ذریعے"، "ڈیڈلاک ختم"، "ریفرنڈم کا اختیار"، "گرینڈ آپریشن کا سلسلہ"، "پولیس کا جنرل ہولڈاپ"، "پروڈکشن آرڈر جاری کر لیا گیا"، "غلط مارکیٹنگ کے خلاف احتجاج"، "میڈیا ٹرائل کرنا" وغیرہ انگریزی کے حوالے سے اور "پولیس کا تک مکا"، "دس لاکھ کا تیل دے گیا"، "چوروں نے چوکا لگا دیا"، "حکم امتناعی کی سلامی"، "کرپشن کے چھپڑ میں ڈبکیاں" جیسے الفاظ مقامیت آمیز کے ذریعے صحافتی مضر

(Discourse) وضع کرنے کی ایک کوشش ہے۔ یہاں تک تو بات درست ہے کہ صحافت بول چال، سنسنی اور خبر کے لیے جن سانچوں اور کینڈوں پر انحصار کرنا چاہتی ہے اس کی کمی دوسری زبانیں پوری کریں گی لیکن اردو کے ثقہ ادیبوں کی طرف سے تن آسانی کا یہ رویہ اور یہ لسانی آلودگی افسوس ناک بھی ہے اور قابل نفرین بھی۔ انگریزی آمیزی کے منفی رجحان میں ایک اور پہلو زیادہ قبیح ہے اور وہ ہے انگریزی افعال کو اردو مصادر "کرنا" یا "ہونا" سے ملا کر مصادر بنانا مثلاً: فیل کرنا، لیٹ آنا، ڈسمس کرنا، کنٹراسٹ کرنا، ایڈووکیٹ کرنا، پریکٹس کرنا جیسے افعال بول چال میں تو عام استعمال میں آ چکے ہیں۔ بعض بہت دور کے افعال، جن کا ترجمہ اردو میں آسان ہے لیکن انھیں بعینہٖ اردو املا میں لکھنا مشکل ہے، اب پاکستانی اردو تحریروں میں عام طور پر ملتے ہیں جیسے آئیڈیالائز کرنا، پرائیویٹائز کرنا، وغیرہ۔ نیز ایسے جملے عام ہیں: "یہ تصویر مجھے بہت ہانٹ کرتی ہے"۔ "میں ایڈجسٹ کر رہا ہوں"۔ "الرٹ کر دیا ہے"، "ہم بھی واک کر آئیں"۔ ایسے جملے ہمیں روزمرہ گفتگو کے علاوہ اردو ادبی تحریروں میں بھی عام ملتے ہیں۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:۔

"Socialize نہیں کر سکتی۔۔۔۔"

یا "کمپرومائز کر لو"

یا پھر "ڈرنک آفر کر رہی تھی"

(بانو قدسیہ، محولہ بالا)۔

"وہ بہت دنوں تک فری لانسنگ کرتا رہا"

(حمید اختر، ۱۹۹۴ء۔ دکن کا تحفہ۔ "تخلیق")۔

"ہم اس چیز کو Discard کر دیتے ہیں"

یا "انسان کو Cope کرنا آجائے"

یا "Compromise کر لیں"

(بانو قدسیہ، محولہ بالا)۔

"اپناوی سی آر خود آپریٹ کرو"

یا "ڈاکٹر نے اس سے ریلیکس ہونے کے لیے کہا"

(ممتاز احمد خاں، ۱۹۹۴ء۔ ایک روبوٹ کی کہانی۔ "صریر")۔

"پارٹ کس نے کیا تھا"

یا "خوش مزاج شخص کو Avoid کرتے رہے"

(آغا بابر، محولہ بالا)۔

اردو شاعری اس لسانی آلودگی سے ابھی تک پاک تھی اور پاکستانی شاعری میں یہ بات ایک امتیاز کی حیثیت رکھتی تھی مگر پچھلے دنوں ایک شاعر کا ایسا کلام بھی دیکھنے کو ملا چونکہ نام بڑا نہیں، اس لیے قابل تذکرہ نہیں۔ تاہم اس سے شاعری میں بھی آلودگی کے خطرے کی گھنٹی ضرور بجتی سنائی دے رہی ہے۔ تاہم اردو کے نثری ادیبوں میں یہ لسانی آلودگی اس تیزی سے بڑھ رہی ہے کہ بہت جلد یا تو اردو کا وجود نہ رہے گا یا پھر اب جسے ہم منفی رحجان قرار دے رہے ہیں شاید آگے چل کر یہ "اینگردو" یا "بگڑی (Pidgin) اردو" کا روپ دھار لے۔ افسانہ نگار یا ڈراما نگار کے ہاں کردار کی زبان بیان (Narration) کے حوالے سے کسی حد تک قابل معافی ہے اور انگریزی زدہ مترجم ا

اخاذ نقاد کو بھی معاف ہی کرنا پڑے گا لیکن بیانیہ (Narrative) میں جہاں ادیب کی طرف سے اظہار مطلب کیا جارہا ہو وہاں تو اردو کا مزاج خراب کرنے کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ البتہ ایک تاریخی تقاضا ہماری ڈھارس بندھاتا ہے۔ جب ہم فارسی سے اردو کی طرف آئے تھے تو مقامی یا قدیم اردو میں فارسی نے پوری جگہ لے رکھی تھی اور جملے یا مصرعے میں کہیں کہیں اردو حروف اور الفاظ استعمال میں آتے تھے۔ شاعری میں ریختہ کی مثال سامنے ہے۔ بعد ازاں پورے سے نصف جملے فارسی کے ہونے لگے اور پھر تان صرف فارسی ترکیبات پر آن کے ٹوٹی۔ اردو آگے بڑھتی رہی۔ جس اردو کو انشاللہ خان "دریائے لطافت" میں غیر فصیح کہتے تھے، وہی بالآخر فصحا کا معیار ٹھہری۔ اب یہی صورت کچھ انگریزی سے اردو کی طرف آنے کی ہے۔ ابھی تو ہم "انگریزی میڈیم" کے زور اور شور میں ہیں۔ بلکہ ہمارے بہت سے لکھاری انگریزی پڑھ کر اردو لکھتے ہیں کہ انگریزی میں تو وہ جگہ بنا نہیں پائیں گے، چلو اردو والوں کو "بنائیں"۔ اسی "بنانے" کے چکر میں یہ سب کچھ ہو رہا ہے۔ اشفاق احمد، بانو قدسیہ، انور سجاد، آغا بابر جیسے ادیب شاید محض اپنی تحریروں کے "رعب اور دبدبے" کی خاطر ایسا کرتے ہیں جبکہ آصف فرخی اور ادیب سہیل جیسے نقاد محض تحریریں بوجھل کرنے کے شوق میں آگے بڑھ رہے ہیں۔ اگر وہ اپنی نگارشات پر چند گھنٹے اس "انگریزیت" کو سنوارنے میں صرف کر دیں تو شاید وہ اردو زبان کے محسنین میں شمار ہوں۔ پاکستانی اردو کا انگریزیت کا یہ رجحان کس کروٹ بیٹھے گا، اس کا ایک اندازہ تو مذکورہ بالا نکات کے علاوہ اردو کے ذخیرہ میں اس کی "وسعت" سے ہو سکتا ہے، اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ فہیم اعظمی نے "صریر" مئی ۹۷ء میں جدت اور تجربے یا سہل انگاری کے حوالے سے لکھا ہے کہ ارادتاً اور عمداً استعمال کرنا ہمارے خیال میں قابل قبول نہیں۔

انگریزی آمیزی کے بعض مثبت پہلو بھی ہمارے سامنے ہیں۔ ان میں انگریزی

سے ترجمہ کر کے بعض نئے الفاظ تو اردو کو ملے تھے، نئے انداز کی تراکیب اور نئے روزمرے اور محاورے بھی انگریزی طرز پر اردو میں ترجمہ ہو کر چلے آرہے ہیں۔ مثلاً اطلاعی گھنٹی (Call bell)، آفتابی غسل (Sun Bath)، پردہ سیمیں (Silver Screen)، پرواز (Flight)، تجربی علوم (Practical Sciences)، اطلاقی علوم (Applied Sciences)، جزوقتی (Part-time)، جشن زریں (Golden Jubili)، جشن سیمیں (Silver Jubili)، چھٹی حس (Sixth Sense)، دہرا قتل (Double Murder)، ذہنی غسل (Brain Washing)، زیرزمین (Under Ground)، سرد خانہ (Cold Storage)، ماہ عسل (Honey Moon)، قرطاس ابیض (White Paper)، شام بخیر (Good Evening)، صبح بخیر (Good Morning)، علامتی ہڑتال (Token Strike)، غسل لینا (Take Bath)، کالادھندا (Black Market)، کھلا چیک (Open Cheque)، کھلے ذہن (Open Mind)، کھلے عام (Openly)، ماں بولی (Mother Tongue)، محفوظ (Reserved)، میکانیہ (Mechanism)، نصف بہتر (Half Better)، یوم سیاہ (Black Day)، قومیت (Nationality)، کلیت پسندی (Collectivism)، کرداریات (Characterology) وغیرہ۔

ایسے ہزاروں الفاظ اور تراکیب وضع ہو کر استعمال ہو رہے ہیں، جن کی سند معروف ادیبوں کے ہاں عام طور پر مل جاتی ہے۔ مثلاً:۔

اعتماد میں لینا Take into confidence۔

"مجبوراً مرزا کو اپنے اعتماد میں لینا پڑا"۔

(مشتاق یوسفی۔ ۱۹۶۴ء۔ "فنون")

الفاظ واپس لینا (Take Words Back)۔

گفتگو ہونا تھی جتنی ہو چکی بس کیجیے
آپ توبہ کیجیے، الفاظ واپس لیجیے

(فدا حسین حشم)

حاضر منڈی (Spot Market)

جب تیل خریدنا ہو پیارے
حاضر منڈی کے بھاؤ لینا

(خدا یار خاں حاصل)

دستخط لینا (Take Singatures)۔

"ذرا صاحب کے دستخط لے لینا"

(فرخندہ لودھی ۱۹۹۴ء۔ بسکہ دشوار ہے ۔۔۔۔ "راوی")۔

یہ رحجان بعض حکام کی پیروی میں بول چال اور ذرائع ابلاغ کی حد تک ہی سہی، عام ہے، جیسے "اقدام لینا" (Take Step) وغیرہ۔

تارید یعنی اردوانے کا عمل تو اردو میں آغاز ہی سے جاری ہے، ہسپانوی، پرتگالی، ولندیزی، انگریزی الفاظ جانے کس کس طرح سے ادل بدل کر اب اردو کے الفاظ بن گئے، "تولیہ، صابن، پرات، لالٹین" کی مثال پہلے آ چکی ہے۔ ایسی سینکڑوں دیگر مثالیں موجود ہیں۔ پاکستانی اردو میں یہ عمل کچھ اور طرح سے آگے بڑھا ہے، چند مثالیں

ملاحظہ ہوں:

"فراڈیا" کی طرز پر "فٹ پاتھیا" ع

ہر جگہ مل جائیں گے اس شہر میں فٹ پاتھیے

(خالد عرفان)

"بوریت" (اکتاہٹ کے معنی میں)۔

"گرمی اور انتظار کی بوریت نے ماحول کو تلخ تر بنا رکھا تھا"

(ریاض انور، ۱۹۶۱ء "نئی قدریں")۔

"فلائیٹ"، "اڑان" کے ساتھ ساتھ "پرواز" کے معنی میں بھی مستعمل ہے۔ بلکہ اس سے مصدر "فلائیٹ پکڑنا" اکثر ادیبوں کے ہاں مل جاتا ہے۔

عربی سے گریز اور فارسی کی طرف رجحان بھی پاکستانی اردو کا ایک اہم پہلو ہے۔ عربی کا مضمون لازم ہونے یا حکام کی طرف سے "امّہ" جیسے عربی الفاظ اردو میں داخل کرنے کی ناکام کوششوں کے باوجود اردو الفاظ میں خاص طور پر اصطلاح سازی کے حوالے سے عربی ذرا سی پیچھے ہٹی ہے اور اس کی جگہ فارسی نے لی ہے۔ عربی کا استعمال "ئیہ" کے لاحقے کی حد تک آگے آیا ہے۔ جیسے استقبالیہ، ابتدائیہ، اشاریہ، دیوالیہ، دورانیہ، عشائیہ، مزاحیہ، نشریہ، بحریہ، فضائیہ وغیرہ بلکہ یہ نولفظیت بھی معنویاتی انحراف کی حد تک جا چکی ہے جیسے سراج منیر نے "امکانیہ" کا لفظ "امکان" کی نشانی کے معنی میں استعمال کیا ہے۔ (بحوالہ ۱۹۷۹ء، ماہنامہ "کتاب")۔

فارسی امر نے لاحقہ کی صورت میں اب اردو میں خاصی جگہ بنالی ہے اور تیزی سے آگے بڑھ رہا ہے۔ جیسے "کار"، "پسند"، "گرد"، "گیر"، "پرست" وغیرہ بطور لاحقہ

عام استعمال ہو رہے ہیں۔ مثلاً بنکار، تخریب کار، تخلیق کار، تقسیم کار، سیاست کار، صدا کار، تخریب پسند، حریت پسند، دہشت پسند، عینیت پسند، شہرت پسند، دہشت گرد، وحشت گرد، زبان گیر، وقت گیر، دادا گیر، مادہ پرست، مفاد پرست، کے علاوہ زبان گیر، پھڈے باز، اعصاب شکن جیسے الفاظ معنویاتی انحراف کی مثال کے طور پر پیش کیے جا سکتے ہیں جیسے:

اس صف میں منٹو جیسا "تجزیہ کار" اور "زبان گیر" (زبان کے معنوں میں) کیسے شامل ہے"، (ڈاکٹر حنیف فوق۔ "افکار" ندیم نمبر)۔

"علم نجوم بسا اوقات "اعصاب شکن" (تحیر خیز کے معنوں میں) حد تک صحیح اور اٹل ثابت ہوتا ہے"۔

(انوار علیگی، ۸ جون ۱۹۸۰ء، "جنگ" کراچی)۔

انحراف کی یہ صورتیں اسم کے علاوہ صفت میں بھی ہمارے سامنے آتی ہیں جیسے:

خود مرادی (مطلبی، خود غرضی کی بجائے)۔

"خود غرضی اور خود مرادی اس کا دستور ہے"

(جون ایلیا، مارچ ۱۹۷۰ء، عالمی ڈائجسٹ)۔

عقائداتی (عقیدوں کی۔ عقائدی کی بجائے)

"عقائداتی پیچیدگیاں پیدا ہو جاتی ہیں"

(ڈاکٹر سید عبداللہ، "جام نو" احسان دانش نمبر)۔

"انہ" کا لاحقہ بھی اسما کے ساتھ استعمال میں عام دیکھنے میں آتا ہے جیسے،

ظہرانہ، عصرانہ، میلانہ، گزانہ، سرگانہ وغیرہ۔

پاکستانی اردو کی ایک اور شناخت اسم مجرد یا اسم کیفیت کے سلسلے میں پیش قدمی سے ہوتی ہے جو اب واضح تر ہوتی جا رہی ہے۔ اسم مصدر اور اسم مجرد کے لیے کوئی امتیاز موجود نہیں تھا۔ علامت مصدری کا لاحقہ "انا" ہی کام میں لایا جاتا تھا، جیسے قومیانا، اسلامیانا وغیرہ۔ اب اسم مجرد کے لیے فارسی لاحقوں "کاری"، "داری"، "سازی" یا اسم کیفیت کے لیے عربی لاحقہ "یت" استعمال میں لایا جا رہا ہے مثلاً To Nationalize اور Nationalization دونوں کے لیے "قومیانا" ہی کا لفظ استعمال ہوتا تھا اب ing- اور tion- کے لیے فارسی لاحقے استعمال میں لائے جاتے ہیں۔ سوداکاری (Bargaining)، اور "نج کاری" (Privatization) جیسے لفظوں کا چلن اس کا بڑا ثبوت ہے۔ (ity-) کے ترجمے کے لیے "یت" کا لاحقہ عام مستعمل ہے، جیسے Nationality کے لیے "قومیت" کی طرز پر ایمانیت (صفت ایمانی کےلیے)، ایمائیت (اشارہ و کنایہ کا اسم کیفیت)، روانیت روانی)، بیگانیت (بیگانگی)، لذتیت (لذت)، جبریت (جبر)، جذباتیت (جذباتی پن)، ڈرامائیت (ڈراما پن)، فراریت (فرار) اور کلیت وغیرہ۔ بعض ایسے اسما ادیبوں نے معنویاتی انحراف کرتے ہوئے بھی استعمال کیے ہیں جیسے:

تجربیت (تجربے سے):

"اس تجربیت کا دامن تمام اصناف پر محیط ہے"

(حاصی کرنالی، "سیارہ" عبدالعزیز خالد نمبر)

ذاتیت (صفت ذاتی)

آپ کو دیکھتے نہیں ہر گز
آپ کی ذاتیت کو دیکھتے ہیں

(راحت شکیل)

حساسیت (جذبہ احساس)

ان کی چشم کرم سے شکوہ ہے
میری حساسیت نہیں جاتی

(اکرم شوقی)

عاصیت (گناہ گاری)

عاصیت کے بھنور میں سفینۂ ہستی

(ابرار عابد)

فارسی لاحقے کی مثالیں سینکڑوں ہیں۔ سودا کاری، نج کاری وغیرہ کا ذکر ہو چکا ہے۔ اسم مجرد کے لیے خاص طور پر "کاری"، "سازی" اور "بندی" کے لاحقے استعمال میں آ رہے ہیں، جیسے صداکاری، قومیت سازی، فلم بندی، عکس بندی، صدا بندی وغیرہ۔ علاوہ ازیں بعض کیفیات کے لیے بھی ادیبوں نے اس روش کو استعمال کیا ہے، جیسے:

تصویر کاری (محاکات کے معنوں میں)

"ہمارا یہ شاعر تصویر کاری پر فریفتہ ہے"

(ڈاکٹر سید ناظر حسن زیدی، "سیارہ" عبدالعزیز خالد نمبر)

تہہ داری (گہرائی کی شدت ظاہر کرنے کے لیے)

"اس میں تہہ داری موجود ہے"

(علی حیدر ملک۔ "افکار" ندیم نمبر)۔

جان تابی (زور یا قوت کے معنوں میں)

"ترے قلم نے دکھائی قلم کی جانتابی"

(سلیمان اختر)

پاکستانی اردو کے عناصر میں جس سب سے بڑے پہلو کی طرف ہم آنا چاہتے ہیں اور جس کی مثالیں درج کرنے کو کثرت سے ملتی ہیں، وہ ہے مقامیت کا اثر۔ سانچے، کینڈے اور منضر کے حوالے سے ہم صحافتی زبان میں اس کا ذکر کر چکے ہیں لیکن ادبی منضر میں بھی یہ شدت سے سامنے آیا ہے۔ روزمرہ، محاورہ، ترکیب اور تشبیہ و استعارہ میں مقامی زبانوں کے (۱) "دخل" اور (۲) "طرز" نے خاصا اثر دکھایا ہے۔ سندھی اور پشتو جیسی زبانوں سے ذرا کم اور پنجابی، سرائیکی سے ذرا زیادہ اثر مرتب ہوا ہے۔ ان زبانوں سے اردو کے ادیبوں کی زیادہ تعداد بھی اس کا ایک بڑا سبب ہے۔ اب سندھی کا اثر بھی قدرے بڑھ رہا ہے۔ دخل کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

اوپَرے، اوپرے (اوپر کا)، اوپر سے (باہر کا، اجنبی)، اوپرے دل سے (ظاہرا)۔ گل بات، گنجلدار، ماسی (ملازمہ)، سوٹا (کش)، کڑکی (مفلسی)، ہڈحرام (مفت خور) اور لشکارا (آب و تاب) جیسے بیسیوں الفاظ امڈے چلے آ رہے ہیں۔

مثالیں ملاحظہ ہوں :۔

بکواس ہونا (بیکار ہونا)

"اوہ زوبیہ تم تو نری بکواس ہو"

(اسما اعجاز، مئی ۱۹۷۹ء، "آنچل")

اوپرے دودھ (اوپر کا دودھ)

"یہ رواج عام تھا کہ بچے کو اوپرے دودھ سے پالا جائے"۔

(ناصر زیدی، جولائی ۱۹۸۰ء، "سکھی گھر")۔

بھرواں (ابھرا ہوا)

"گول گول بوٹیاں، گوڈے کی بھرواں ہڈیاں"

(بیگم آمنہ نازلی، ۴ دسمبر ۱۹۷۹ء، "جنگ")۔

گند مچانا (گڑبڑ کرنا)

سب کو بنا رہا ہے ملزم
پھر گند مچا رہا ہے ظالم

(شیدا اجمال)

فٹا (پیمانہ)

"فٹا مار کر قلم پکڑنا سکھایا کریں"

(سید قاسم محمود، اکتوبر ۱۹۷۹ء، "سیارہ ڈائجسٹ")۔

شو میں آنا (شان دکھانا)

"خواہ مخواہ شو میں آ رہی ہو"

(آسیہ سلیم، فروری ۱۹۷۷ء، "خواتین ڈائجسٹ")۔

پھڈا (گڑبڑ)

"بعد میں پھڈا تو نہیں کرو گی"

(شمیمہ نقوی، نومبر ۱۹۷۴ء، "پاکیزہ")۔

تھڑا (چبوترا)

"رات کسی تھڑے پر گزار دیتا"

(اظہر جاوید، ۱۵ فروری ۱۹۸۰ء، "حریت")۔

آرام سے چلنا

"روزی آرام سے چلتی رہی"

(سائرہ ہاشمی، ۱۹۹۴ء، سویرے والی گاڑی، "علامت")۔

فٹ (پھٹ سے)

"وہ فٹ" گاڑی روک کر اسے بٹھا لیتا"

کھڈا (گڑھا)

"عین اس کی چارپائی کے نیچے ایک بڑا سا کھڈا موجود تھا"

(سید قاسم محمود، دسمبر ۱۹۷۴ء، "سیارہ ڈائجسٹ")۔

رڑکنا (مس ہونا)

"نیچے لوہے کی قینچی رڑک رہی تھی"

(پروین عاطف، جنوری ۱۹۷۹ء، "کتاب")۔

چپ کرنا (چپ ہونا)

"چپ کرو بیگم"

(انجم انصار، ۲۶ مئی ۱۹۸۰ء، "جنگ")

جُڑا جتھا (پس انداز کیا ہوا)

"باپ کا جُڑا جتھا کھا رہا تھا"

(نگہت سلیم، ستمبر ۱۹۷۷ء، "خواتین ڈائجسٹ")۔

ڈز پڑنا (نقصان ہونا)

"نوے روپے کی ڈز پڑ گئی تھی"

(احمد ندیم قاسمی، فروری ۱۹۷۶ء، "سب رنگ")۔

چک پھیریاں کھانا (چکر کھانا)

"اس کے ذہن میں بڑے گرداب چک پھیریاں لگا رہے تھے"۔

(ریحانہ زیدی، نومبر ۱۹۷۷ء، "پاکیزہ")۔

آس پڑوس (اڑوس پڑوس)

(بحوالہ : جون ایلیا، فروری ۱۹۷۵ء، "عالمی ڈائجسٹ" اور نزہت افتخار، ۱۸ اگست ۱۹۷۶ء، "امن" کراچی)۔

بادشاہو (حضرت)

"بس بادشاہو مولا کی دنیا کے رنگ دیکھ رہا ہوں"

(مسعود مفتی، نومبر دسمبر ۱۹۷۶ء، "الف لیلیٰ ڈائجسٹ")۔

چوٹل (چوٹ کھایا ہوا)

(بحوالہ: احسان دانش، "جہان دانش")۔

چونکیل (چوکنا)

"چونکیل جانور کی طرف متوجہ ہوئے"

(بانو قدسیہ، "شہر بے مثال")۔

ٹاواں ٹاواں (اکا دکا)

"وہاں ٹاواں ٹاواں نمازی بیٹھا نظر آتا تھا"

(منصور قیصر، ۱۹۶۸ء، "نئی قدریں" شمارہ: ۲)۔

چہرہ شہرا (چہرہ مہرہ)

"تمہارے چہرے شہرے کو دیکھ کر اندازہ لگاتے ہیں"

(تمثال عسکری، ۲۳ مئی ۱۹۷۸ء "امن" کراچی)۔

پھڑتول (تہلکہ)

"سارے اسٹیشن پر پھڑتول مچ گئی"

(اشفاق احمد، مارچ ۱۹۷۷ء، سیارہ ڈائجسٹ)

زخمانا (زخمی کرنا)

جو نگاہوں کو نہ زخمائے وہ عشوہ کیا ہے
جو کسی دل میں نہ ٹوٹے اسے پیکاں نہ کہو

(جمیل ملک)

ریڑھ مارنا (تباہ کرنا)

"اردو بولنے کی کوشش کرتی ہے تو اسے فارسی اور انگریزی کو بھی ریڑھ مارنی پڑتی ہے"

(ابن صفی، مارچ ۱۹۷۹ء، "نئے افق")۔

شوشا (دکھاوا)

(انور مقصود کا مشہور ٹیلی فیچر / پروگرام بھی ہے)۔
"آج کل دنیا شوشا کی ہے"۔

(وحیدہ نسیم، مارچ ۱۹۷۸ء، "زیب النسا")۔

بڑا گوشت (گائے کا گوشت)

یہ مجبوریاں دعوتوں کی نہ پوچھو
ہمیں بھی بڑا گوشت کھانا پڑے گا

(نزہت آرا)

بھونکار (بھونک)

"وہ رکتا ہے اور کتے کی بھونکار کی جانب دیکھتا ہے"

(انور سجاد، ۱۹۸۰ء، "نئی قدریں"، شمارہ: ۲)۔

پھیتے پھیتے ہوجانا (تار تار ہوجانا)

"کھوپڑی ہنڈیا کی طرح پھیتے پھیتے ہوجاتی"

(احمد ندیم قاسمی، فروری ۱۹۷۶ء، "سب رنگ")۔

بندہ بننا (انسان بننا)

"اب وہ وحشی نہیں بلکہ کافی بندے بن چکے ہیں"

(حنیف کرن، ۶ جون ۱۹۸۰ء "جنگ" کراچی)

بیمار شمار (بیمار و مار)

"پچھلے دنوں ذرا بیمار شمار رہا ہوں"۔

(عطاالحق قاسمی، ۲۹ دسمبر ۱۹۷۹ء، "نوائے وقت" لاہور)۔

تڑی دینا (دھمکی دینا)

مری اس پر نظر جب سے پڑی ہے
دکھا کر آنکھ وہ دیتا تڑی ہے

(آغا خرم جمیل)

اوترا (نکما، ناکارہ)

"اب بھی کچھ کسر رہ گئی ہے بہن۔ اور مارو اس اوترے کو"

(حفیظ احسن، دسمبر ۱۹۷۰ء، "فنون")۔

مونہہ ماری کرنا

مونہہ میں روزہ ہو تو مونہہ ماری نہ کر

(رئیس امروہوی)

پوتڑوں کے بگڑے ہوئے (پیدائشی بگاڑ کے ساتھ)

"بھلا کہیں پوتڑوں کے بگڑے ہوئے بھی سنورے ہیں"

(شکیلہ شمشاد، دسمبر ۱۹۷۵ء، "پاکیزہ")۔

جہاں تک "دخل" کے باعث نئے مصادر، روزمروں اور محاوروں کی تشکیل کا تعلق ہے، پاکستانی اردو میں اس کی رفتار بہت تیز ہے۔ فلمانا، پس نوشت، اکی دکی (اکا دکا کی بجائے)، زہرناک ہونا، (زہریلا کی بجائے)، سر درد ہونا (درد سر ہونا کی بجائے)، شام پڑنا، شام چھانا، شام ڈوبنا، شام اترنا وغیرہ، گولی دینا (چکمہ دینا کی بجائے)، گولی مارنا (لعنت بھیجنا)، گیند کرانا (گیند کھلانا)، لڑائی ہونا (لڑاکا ہونا کی بجائے)، لفٹ کرانا (التفات کرنا)، مرچیلی ہونا (مرچوں والی ہونا)، مسکہ لگانا (مکھن لگانا) وغیرہ۔

بعض نئی تلمیحات اور کنایے بھی وضع ہوئے۔ فلم "پھنے خاں" نے اس لفظ کو طرم خان کی جگہ رکھ دیا، جیسے:

"جی ہاں بڑے پھنے خاں معلوم ہوتے ہیں"

(خالد نصیر ۱۹۶۱ء، "جام نو" یوم پاکستان ایڈیشن)۔

اسی طرح ۱۹۶۵ء کی جنگ نے بہت سی تلمیحات کو جنم دیا، جن میں سے "ہلواڑا نکل جانا" بہت منفرد ہے۔ ۱۹۶۵ء میں بھارت کے ہوائی اڈے "ہلواڑے" کی تباہی اب بھی لوگوں کو یاد ہے چنانچہ "تباہ ہوجانا" کے معنی میں استعمال ہورہا ہے جیسے:

"اس کے پیٹ کا ہلواڑہ نکل گیا"

(شاہدہ ارم، مئی ۱۹۷۹ء، "خواتین ڈائجسٹ")۔

اسی جدت اور صرفِ جدید نے بہت سے نئے روزمرے اور محاورے جنم دیے ہیں۔ شام کے محاوروں کے ساتھ ساتھ، پس قدمی اور پس رو، اعتماد میں لینا وغیرہ کا ذکر ہم کر چکے ہیں۔ چائے کی پیالی میں طوفان اٹھانا، ٹیکسی پکڑنا، سواری اٹھانا، دھڑ دھڑا کے بخار چڑھنا، جیسی جدتوں سے عام افراد بھی واقف ہیں۔ آواز دینا کی جگہ آواز مارنا بھی اب عام ہے۔ پہلی چڑھنا، پہلی تاریخ آنے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ اب چند مزید محاوروں اور استعمال کی مثالیں پیش کی جائیں تو بات زیادہ واضح ہوسکے گی جیسے:

آنکھ کی جھپکی میں (پلک جھپکتے)

اک برق پا براق پہ جب ہو گیا سوار
طے کر گیا تو آنکھ کی جھپکی میں شش جہات

(نشتر جالندھری)

آنکھیں اگلنا (آنکھیں نکالنا)

بھابی نے آنکھیں اگل کر میری طرف دیکھا

(حفیظ احسن، دسمبر ۱۹۶۱ء، "نئی قدریں")۔

آواز نہ ہونا (اہمیت نہ ہونا)

طائر ہوں مگر قوت پرواز نہیں ہے
اس شہر میں میری کوئی آواز نہیں ہے

(حیرت انبالوی)

پھیکی پھکاند (پھیکی سیٹی)

"پھیکی پھکاند مرغی اور وہ بھی آدھی کچی، آدھی پکی"

(مسرت پراچہ، مارچ ۱۹۷۷ء، "سیارہ")

دل کے محاوروں میں سے دل بھرنا (دل جوئی کرنا)، دل پڑا رہنا (دل لگا رہنا) اور دل کھلا کرنا (دل میں وسعت پیدا کرنا) کے معنی میں استعمال ہو رہے ہیں۔

ہے تنگ صحن گلستاں تو دل کھلا کر لیں
اگر بہار نہیں زخم ہی ہرا کر لیں

(یسین قدرت)

چند بالکل نئے، عجیب اور جدید محاوروں کی مثالیں ملاحظہ ہوں:

سناٹا جھولنا (سناٹا چھانا)

"اس کے دل میں بھی سناٹے جھول رہے تھے"

(مسرت افزا روحی، نومبر ۱۹۷۵ء، "خواتین ڈائجسٹ")۔

شعور سنبھالنا (ہوش سنبھالنا)

"میں نے شعور سنبھالتے ہی دل و دماغ پیار اور خلوص اپنے شوہر کے لیے رکھ چھوڑے تھے"۔

(قمر سلطانہ، دسمبر ۱۹۷۵ء، "اردو ڈائجسٹ")۔

غوطہ دینا (غوطہ کھانا)

"ٹاؤن ہال کے اوپر سے ایک طیارہ غوطہ دے کر ابھرا"

(سید قاسم محمود ۱۹۶۸ء، "نئی قدریں" شمارہ نمبر ۲)۔

اڑان بھرنا (چوکڑی بھرنا)

ہرنوں کی ڈاریں اڑانیں بھرتی ہیں

(محمد خالد اختر، دسمبر ۱۹۷۰ء، "فنون")۔

آنکھ بجھنا (بینائی جاتے رہنا)

بجھ گئی آنکھ تو کیا پیراہن تر لائے
چاہ سے اب مرے یوسف کی خبر لائے

(پروین شاکر)

پیغام بجھنا (نسبت ختم ہونا)

"اپنی بے سروسامانی کا ذکر کیا تو پیغام بجھ گئے"

(محمد رفیق، جنوری ۱۹۷۲ء، "اردو ڈائجسٹ")۔

تماشا کرنا (تماشا بنانا)

مجھ کو محفل میں تماشا نہ کرو
کم سے کم خود کو تو رسوا نہ کرو

(رفعت عطا)

چنگاریاں چبھونا (ایذا پہنچانا)

لہو رگوں میں مظفر چھڑائے مہتابی
ملے ہے کیا اسے چنگاریاں چبھونے میں

(مظفر وارثی)

جدید الفاظ و محاورات کا یہ ذخیرہ اتنا زیادہ ہے کہ اس سے کئی لغات مرتب ہو سکتے ہیں۔ ایسی ایک مختصر سی کوشش کرم لکھنوی نے ۱۹۸۲ء میں کی تھی۔ اگرچہ تبدیلی خاص طور پر قواعدی تبدیلی پر کئی ثقہ قسم کے اہل علم نے قلم اٹھایا ہے اور تصحیح و صحت زبان کا شوق بھی عام رہا ہے مگر پاکستانی اردو کی اس تبدیلی کے چلن پر ڈاکٹر فرمان فتحپوری اور حکیم محمد اشرف جیسے اہل علم کی تحریریں اور کتابچے بھی ملتے ہیں۔ بعض لوگ اس قسم کے تجربات اور تبدیلیوں کو زبان کی شکست و ریخت قرار دیتے ہیں۔ بعض علاقائی اثر و نفوذ کو "سلینگ" سے زیادہ درجہ نہیں دیتے جبکہ یہ صرف زبان کی وسعت اور کینڈے کی تبدیلی ہے۔ بقول فہیم اعظمی "حقیقت یہ ہے کہ زبان کی سٹرکچرنگ عمل ایک معاشرتی عمل ہے جو زبان کو وسعت دیتا ہے۔ اس میں الفاظ اپنی افادیت کھو سکتے ہیں، نئے الفاظ ان کی جگہ لے سکتے ہیں، الفاظ کا اضافہ ہو سکتا ہے، تلفظ اور لہجے پر اثر پڑ سکتا ہے لیکن اسے شکست و ریخت کہنا درست نہیں"۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ پاکستانی اردو کے ان خدوخال کو قواعد، صرف و نحو، اسلوبیات اور انشا پردازی کے

حوالے سے زیادہ واضح کیا جائے اور ان پر مبنی ویبسٹر کی پیروی میں پاکستانی اردو کا ایک جامع لغت مرتب کیا۔ جو املا، ہجے، معنی اور استعمال کے حوالے سے وضاحتیں پیش کر سکے۔ اس سے قدیم لغت نگاری میں محاوروں، روزمروں اور ضرب الامثال کو جو بے جا اہمیت دی گئی تھی، اس میں بھی کمی آئے گی اور پاکستانی لغت نگاری "الفاظ" تک محدود کرنے اور ان مذکورہ اور دیگر ممکنہ پہلوؤں کو الفاظ کے تحت محض ذیلی حیثیت دینے میں بھی مدد ملے گی۔ اس ضمنی فائدے کے ساتھ جدید اردو ادب میں لغت و قواعد کے حوالے سے آنے والی ان تبدیلیوں کو بھی نہ صرف ریکارڈ پر لایا جاسکے گا بلکہ ادب سے معنویاتی طور پر مستفید ہونے میں عام قاری کو بھی مدد فراہم ہوسکے گی، جس سے اردو کا مستقبل واضح اور روشن نظر آئے گا۔

بات دراصل یہ ہے کہ دور جدید میں زبان کی ادبی ثقافت اور اس کا کینڈا (genre) صدمے سے دوچار ہو چکے ہیں۔ ادب محض تحریر ہے اور لیونارڈ بلوم فیلڈ جیسے بلند پایہ محقق اس بات کا تحقیق کے ساتھ انکار کر چکے ہیں کہ زبان محض تحریر کا نام ہے۔ اصل زبان تو بول چال میں ہوتی ہے۔ سائیسر جیسا ماہر لسانیات کہتا ہے کہ بالآخر ہر ادبی زبان جو ثقافت کی پیداوار ہوتی ہے، بولے ہوئے لفظ یا بول چال کی زبان سے الگ ہو جاتی ہے۔ جبکہ روزمرہ یا بول چال کی زبان بھی زیادہ تر کاروبار حیات کو چلاتی ہے۔ پچھلی کئی دہائیوں میں ماہرین لسانیات نے تحریر کو مطالعۂ زبان کے سلسلے میں یکسر نظر انداز کرنا شروع کر دیا تھا۔ ۱۹۶۰ء کے بعد سے جب نوم چومسکی کی تحقیقات سامنے آئیں تو زبان کو بول چال اور تحریر دونوں صورتوں میں قبول کیا جانے لگا۔ یہ بھی عبوری دور تھا۔ اب نفسی لسانیات کا دور ہے۔ مائیکل ہالیڈے کا نام اس سلسلے میں قابل ذکر ہے۔ ایس ایم شاہد نے اس بنیاد پر "خواندگی اور زبان" پر تحقیق انجام دی ہے، جو قابل توجہ ہے۔ اس حوالے سے آج لسانیات کی دنیا میں قواعد کی بجائے جو محض تحریری زبان کا تجزیہ ہوتے ہیں، گفتگو اور اس کی قبولیت معیار ٹھہرنے لگی ہے، جو

بول چال کے تقاضے ہیں۔ آج یہ سمجھا جاتا ہے کہ زبان کی کئی ہیئتیں (forms) ہیں جو زبانی روایات اور ادبی روایات کے علاوہ بھی کئی پیچیدہ صورتوں میں موجود ہیں۔ پاکستانی اردو میں ایسی کئی ہیئتوں کا احساس ہوتا ہے۔ جن کا تحقیقی جائزہ لیا جانا ضروری ہے۔

پاکستانی دور سے پہلے اردو کی ان مختلف ہیئتوں کے درمیان ایک بہت بڑی خلیج حائل تھی۔ اب تک اردو کے سلسلے میں ہم صرف ادبی ہیئت کو جانتے تھے لیکن وقت نے ہمیں بتا دیا کہ گفتگو، بول چال، ادب، علم، صحافت، معلومات عامہ، اشتہارات، فارموں، درخواستوں اور فہرستوں کے متعدد سانچوں، کینڈوں، محضروں اور متون کی متنوع ہیئتیں موجود اور برسر عمل ہیں۔ زبان دراصل ہمارے تجربات (Experiences) کے اظہار اور تفہیم کے لیے توسل کاری (Mediation) کرتی ہے اور جب زبان کی کوئی ہیئت (form) اس توسل کو صحیح طور پر انجام نہیں دے سکتی تو اس کے سانچے (Registers) اور کینڈے (Genres) تبدیل ہونے لگتے ہیں۔ محض یہ خیال کہ زبان ابلاغ کرتی ہے اور ابلاغ خیالات کو الفاظ میں اور پھر الفاظ کو واپس خیالات میں منتقل کرنے کا نام ہے، ایک محدود نظریہ ہے۔ دراصل زبان ہمارے ذہن کا نفسیاتی اور سماجی حوالوں سے توسل کرتی ہے، خواہ اس کے لیے اسے الفاظ ملیں یا اشارے، علامتیں ملیں یا لہجے۔ آج یہ سب "زبان" میں شامل ہوتے جا رہے ہیں۔ آج کی پاکستانی اردو میں ان توسلات کا وجود ہے اور ان پر عبور رکھنے کے باعث اُردو ایک واقعی زبان کی حیثیت سے منفرد ہو چکی ہے اور یہ کہ اس کے خدوخال واضح ہوتے جا رہے ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ان خدوخال پر سائنسی تحقیقات انجام دی جائیں تاکہ آئندہ شعروادب، صحافت، دفاتر، قانون، علم، تعلیم، خواندگی، گفتگو اور رسمی و غیر رسمی بول چال کے تقاضوں کے حوالے سے بہتر سانچے، محضر اور متون وجود میں آئیں۔

پاکستانی اردو سے کیا مراد ہے؟

ڈاکٹر سلیم اختر

یہ سوال اس لیے ضروری ہے کہ اس انداز پر دیگر ممالک سے بھی اردو (یا اُن کی اپنی زبان بھی) منسوب کی جا سکتی ہے یعنی بھارتی اردو، عربی اردو (یا عربی)، ایرانی اردو (یا فارسی) وغیرہ، تاہم ایسا نہیں ہے حتیٰ کہ بھارت میں بھی نہیں۔ جہاں اب اردو کا لفظ بھی عملاً ختم کر دیا گیا ہے۔ وہاں اردو اب "ہندی" کہلاتی ہے۔ جب ہندی فیچر فلم، ہندی سماچار، ہندی پروگرام کہا جاتا ہے تو در حقیقت اردو مراد ہوتی ہے۔

ہمارے وہ اہل زبان جو آج بھی دہلی اور لکھنؤ کے روزمرہ اور محاورات سے سند حاصل کرتے ہیں اور ابھی تک ایسی بحثوں میں الجھے ہیں کہ "مجھے کھانا کھانا ہے"، صحیح ہے اور "میں نے کھانا کھانا ہے" غلط ہے، ذرا دہلی اور لکھنؤ کے لوگوں سے گفتگو کریں، انھیں وہاں کی اردو کی فصاحت و بلاغت اور لہجہ کی نفاست کا اندازہ ہو جائے گا۔ بھارت کی "ہندی" فلموں کے کردار جو زبان بولتے اور جس لہجہ میں بولتے ہیں، وہاں کے عوام بھی وہی بولتے ہیں، اکثریت "غ"، "ض" اور بعض دیگر اصوات کی ادائیگی سے قاصر ہے اس لیے وہاں غالب، "گالب" اور حضور "حجور" بن جاتے ہیں۔ آج دہلی جیسے ادبی مراکز میں چند دن گزار لینے کے بعد جہلم، ملتان اور ڈیرہ غازی خاں میں بولی جانے والی اردو زیادہ شائستہ محسوس ہونے لگتی ہے۔ قطع نظر اس امر کے کہ ہم خود کیا بولتے ہیں؟ خود ہماری اردو بھی، الفاظ کے حسنِ انتخاب، تلفظ کی شائستگی اور لہجہ کی گھلاوٹ کے لحاظ سے کسی اعلیٰ معیار پر پوری نہیں اترتی!

ایک ضروری سوال؟

کیا الفاظ، تلفظ اور لہجہ کو کسی قطعی معیار کا پابند بنا کر دو ٹوک قسم کی کسوٹی پر پرکھا جا سکتا ہے؟ یہ سوال اس بنا پر اساسی اہمیت کا حامل ہے کہ اس سے یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ یہ معیار اور کسوٹی کون بناتا ہے؟ جس کا سیدھا اور فوری جواب ہوگا (دہلی اور لکھنؤ کے) اہل زبان!

جہاں تک تہذیب و ثقافت کے عمومی پیمانوں اور اردو ادب کے جمالیاتی معیاروں کا تعلق ہے تو ماضی میں ان سب کا دربار سے گہرا تعلق رہا ہے۔ شاہِ وقت کے ذوقِ حسن اور حسنِ ذوق کے مطابق ادب اور فنون لطیفہ کے جمالیاتی معیار بہتر یا بدتر صورت میں تبدیل ہوتے رہتے تھے۔ جن شاہوں نے شمشیر و سناں کو اول جانا، ان کی ثقافت اور جمالیات ان شاہوں سے جداگانہ نظر آتی ہے جنھوں نے طاؤس و رباب کا آخر نہ جانا۔ جبھی تو نواب صاحب کی خوشنودی کے لیے انشاء لطائف کی تلاش میں لکھنؤ میں مارے مارے پھرتے ہیں۔

سیاسی صورت حال اور عمرانی تقاضے بھی ثقافت، فنون لطیفہ، تخلیقات اور زبان پر گہرے اثرات ڈالتے ہیں۔ انگریز اور انگریزی آئی تو اپنے ساتھ نئی ثقافت، نئے تخلیقی تصورات (اور ان کے نتیجہ میں نئی اصناف ادب) لائی۔ اخبارات اور جرائد ایک خاص سیاسی صورت حال کے باعث ممکن ہوسکے۔ مغل سلطنت میں ایسا نہ ہوسکتا تھا، اس لیے نہیں کہ انگریز مغلوں سے زیادہ افضل تھے یا عوام نواز تھے بلکہ اس لیے کہ مغل ہندوستان ان کے لیے تیار نہ تھا کیوں کہ وہاں "پریس"، "عوام"، "عوامی رائے" وغیرہ کا تصور نہ تھا۔ ہم انگریز کے تسلط کو کتنا بھی بُرا کیوں نہ کہیں مگر اردو زبان و ادب اور ان کے حوالے سے تخلیقات پر انگریزی زبان و اُدب کے دور رس اثرات سے انکار ممکن نہیں۔ فورٹ ولیم کالج کلکتہ ہی میں قائم ہوسکتا تھا، آگرہ میں نہیں۔ انجمن پنجاب کے

نظمیہ مشاعرے لاہور ہی میں منعقد ہوسکتے تھے، لکھنؤ میں نہیں، سرسید احمد خاں کو اپنی درس گاہ کے قیام کے لیے بھی علی گڑھ کا انتخاب کرنا پڑا تو اس کی بھی یہی وجہ تھی کہ قدیم تہذیبی مراکز قدیم روایات اور مسلمات متحرک نہ کرسکتے تھے۔ "آئین نو" کے لیے نئے اذہان اور نئی نسل کی ضرورت تھی۔

لفظ کا آغاز کیسے ہوا اور زبان کیسے معروض وجود میں آتی ہے یہ دلچسپ مگر نزاعی بحث ہے جس کی تمام تفصیلات میں جانے کا موقع نہیں تاہم یہ امر لائق توجہ ہے کہ زبان افراد میں رابطے کا ذریعہ بنتی ہے اس لیے اس کی عمرانی اساس سے صرف نظر ممکن نہیں۔ نہ افراد خلا میں رہتے ہیں اور نہ ہی مسروقہ خزانہ کی مانند الفاظ کسی طلسمی غار میں بند ہوتے ہیں۔ ایسا غار جس کے دہانہ سے سنگ گراں سرکانے کے لیے کھل جا سم سم کی ضرورت ہو۔ لفظ فرد کے وجود کی توسیع اور اظہار ذات کا وسیلہ ہے، لفظ شخصیت کی شناخت کا قرینہ، من و تو میں امتیاز و ابلاغ کی بنیاد اور سب سے بڑھ کر شخصیت اور تخلیقی شخصیت کو ہم آہنگ کرنے والے نفسی عمل کے نتیجے میں جنم لینے والی تخلیق کی تجسیم کا فن کارانہ انداز ہے۔ جب بوجوہ یہ بنیاد متزلزل یا معدوم ہو جائے تو فرد جس نفسی کرب سے دوچار ہوتا ہے، اس کا اندازہ لگانا دشوار ہے۔ "کم زبانی" اور "بے زبانی" کے احساس پر مبنی بے چارگی تنہائی کی جس نیوراتی حساسیت کو جنم لیتی ہے، صرف آج کے پُر تضاد سماج اور یورپ کے صنعتی معاشرہ ہی سے مخصوص نہیں، قدما بھی اس سے آگاہ تھے:

کوئی محرم نہیں ملتا جہاں میں
مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زباں میں

انفرادی رویے کی مثال میں "آب حیات" میں بیان کردہ واقعہ کافی ہے جب

میر تقی میر نے لکھنؤ کے سفر کے دوران میں ساتھی مسافر سے اس بنا پر گفتگو نہ کی کہ ان کی زبان خراب ہو جائے گی اور وہ بھی اس دعویٰ کے باوجود ع:-

پر مجھے گفتگو عوام سے ہے۔

میر شاعری میں عوام سے خوبصورت اسلوب میں گفتگو کر سکتے تھے مگر انفرادی سطح پر وہ مکالمے کے اہل نہ تھے!

ایک رویہ یہ ہے اور اس کے متوازی، مستحکم اور دیرپا دوسرا رویہ وہ ہے جس کے نتیجے میں زبان کا سومناتھ بنا کر خود کو اس کا محافظ اور پجاری قرار دیا جاتا ہے۔ یوں زبان کی سیتا کو لچھمن ریکھا کا پابند بنا کر اس کی عفت کے تحفظ اور طہارت کی برقراری کی سعی کی جاتی ہے، جس کے باعث زبان (اہل زبان کے لیے) دیوبانی کی صورت اختیار کر لیتی ہے چنانچہ الفاظ اور ان سے وابستہ معانی و مفاہیم، ان کے استعمال اور تلفظ پر گویا کڑے پہرے بٹھا دیئے جاتے ہیں۔ یوں زبان کے تخلیقی نمو میں تعطل پیدا ہو جاتا ہے اور لفظِ تازہ کا نیا خون نہ ملنے کی وجہ سے زبان مریض معنویت کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ سنسکرت نے عوامی بولیوں سے رشتہ منقطع کیا تو محض "دیوبانی" بن کر رہ گئی۔ عوام سے رشتہ منقطع ہوا تو پھر دل سے بھی اتر گئی۔

قوم، عصر، ثقافت اور تخلیق -- یہ چار عناصر ہیں جو زبان کے مزاج اور کسی مخصوص خطہ میں بسنے والوں کے لسانی شعور کا تعین کرتے ہیں ان کے جداگانہ تذکرہ کا یہ مطلب نہیں کہ یہ سب ایک دوسرے سے لاتعلق، ہوا بند ڈبوں میں انفرادی کارکردگی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ ایسا نہیں، یہ چاروں باہمی اثراندازی اور عمل و ردعمل کی صورت میں ایک دوسرے کو تبدیل کرتے رہتے ہیں۔ متنوع عصری محرکات کے زیر اثر ثقافت تغیر آشنا ہو کر قوم کے اندازِ زیست کو متغیر کرتی ہے اور زبان کو عصری رنگ

میں رنگتی اور اسلوب کی جمالیات میں اظہار پاتی ہے، تب تخلیقات قوم اور ثقافت پر اثرانداز ہوتیں، پھر ثقافت زبان پر اور زبان تخلیقات پر اور یوں ہی لہر در لہر اثرات کے دائرے بنتے، پھیلتے، مدغم ہوتے اور ٹوٹتے جاتے ہیں۔ تاہم مختلف حالات میں ان عناصر کی کارکردگی اور اثرپذیری میں مدوجزر رہتا ہے۔

تخلیق کار اس عمل میں تیزی کا جبکہ قدامت پسند اس میں سستی/تعطل/انقطاع کا باعث بنتے ہیں۔ طہارت پسند کا زبان کو مسلمات کے سانچے میں فٹ کرنا زبان کی آزادانہ نمو کے لحاظ سے منفی عمل ہے کہ زبان کے تخلیقی امکانات سے صرف نظر کرتے ہوئے اسے صرف قواعد وضوابط کا پابند بنائے رکھنے ہی میں زبان کی ترقی دیکھتے ہیں۔ عملی لحاظ سے یہ ترقی نہیں بلکہ تعطل ہوتا ہے۔ اس ضمن میں متروکات کی مثال پیش کی جاسکتی ہے۔ لکھنؤ کی ثقافت پسند ثقافت میں ناسخ نے متروکات کے جس عمل کو بڑی شدومد سے جاری رکھا، اس کے نتیجے میں لاتعداد الفاظ کو ٹکسال باہر کیا مگر شاعر ہونے کے باوجود وہ یہ اساسی حقیقت فراموش کر گئے کہ لفظ کی جہات عوامی استعمال سے مشروط ہوتی ہیں، انھوں نے میر، سودا اور درد کے عہد میں مستعمل متعدد الفاظ (جیسے کبھو، کسو) متروک قرار دیئے مگر میر، سودا اور درد کے اشعار کی صورت میں وہ الفاظ آج بھی زندہ ہیں۔ ناسخ نے زبان کے ذخیرۂ الفاظ میں بھی متروکات سے جو کمی کی نئے الفاظ کی اختراع سے وہ اس میں اضافہ نہ کر پائے۔ زبان کی آزادانہ نمو اور تخلیقی امکانات بروئے کار لانے کے لحاظ سے یہ ساری مساعی منفی ثابت ہوئی ہے۔ شاید اس لیے مولوی عبدالحق نے کہا کہ وہ ایک اچھی طرز کے ناسخ تھے۔

علامہ اقبال پر اہل زبان کے اعتراضات بھی زبان کا مندر بنا کر نور پجاری بن جانے والے رویے کے مظہر ہیں۔ معترضین کے جواب میں علامہ نے لکھا:

"زبان کو میں ایک بُت تصور نہیں کرتا جس کی پرستش کی جائے بلکہ

اظہار مطالب کا ایک انسانی ذریعہ خیال کرتا ہوں۔ زندہ زبان انسانی خیالات کے انقلاب کے ساتھ بدلتی رہتی ہے اور جب اس میں انقلاب کی صلاحیت نہیں رہتی تو مردہ ہو جاتی ہے"۔

("اقبال نامہ" مرتبہ شیخ عطاء اللہ، ص:۸۵)

زبان، اس کے تخلیقی استعمال اور اسلوب کی جمالیات کے ضمن میں علامہ اقبال نے متعدد اشعار میں جن تصورات کا اظہار کیا ان کا مطالعہ اس بنا پر خصوصی دلچسپی کا باعث بن جاتا ہے کہ اردو میں علامہ سے بڑھ کر اسلوب گر شاعر پیدا نہیں ہوا، ان کے اسلوب میں جلال و جمال کا جو تخلیقی امتزاج ملتا ہے وہ خود کار یا خود رو نہ تھا بلکہ اس کا محرک ان کا لسانی شعور تھا، وہ لسانی شعور جس کی بنا پر وہ "اردو زبان اور پنجاب" میں یوں رقم طراز ہوتے ہیں:

"---- اس بات پر مصر ہیں کہ پنجاب میں غلط اردو کے مروج ہونے سے یہی بہتر ہے کہ اس صوبے میں اس زبان کا رواج بھی نہ ہو لیکن یہ نہیں بتاتے کہ غلط اور صحیح کا معیار کیا ہے؟ جو زبان باہمہ وجوہ کامل ہو اور ہر قسم کے ادائے مطالب پر قادر ہو، اس کے محاورات و الفاظ کی نسبت تو اس قسم کا معیار خود بخود قائم ہو جاتا ہے، جو زبان ابھی بن رہی ہو اور جس کے محاورات و الفاظ جدید ضروریات کو پورا کرنے کے لیے وقتاً فوقتاً اختراع کیے جا رہے ہوں، اس کے محاورات وغیرہ کی صحت و عدم صحت کا معیار قائم کرنا میری رائے میں محالات سے ہے۔ ابھی کل کی بات ہے اردو جامع مسجد دہلی کی سیڑھیوں تک محدود تھی مگر چونکہ بعض خصوصیات کی وجہ سے اس میں بڑھنے کا مادہ تھا، اس واسطے اس خوبی نے ہندوستان کے دیگر حصوں کو بھی تسخیر کرنا شروع کیا اور کیا تعجب کہ کبھی تمام ملک ہندوستان اس کے

زیر نگیں ہو جائے، ایسی صورت میں یہ ممکن نہیں اور جہاں جہاں اس کا رواج ہو، وہاں کے لوگوں کا طریق معاشرت، ان کے تمدنی حالات اور ان کا طرز بیان اس پر اثر کیے بغیر رہے۔ علم السنہ کا یہ ایک مسلم اصول ہے جس کی صداقت اور صحت تمام زبانوں کی تاریخ سے واضح ہوتی ہے اور یہ بات کسی لکھنوی یا دہلوی کے امکان میں نہیں ہے کہ اس اصول کے عمل کو روک سکے"۔

("مقالات اقبال" مرتبہ سید عبدالواحد حسینی، ص: ۲۰)

اس اقتباس کی آخری سطریں اس امر کی شاہد ہیں کہ علامہ صوبائی یا لسانی عصبیت کے برعکس لسانیات کے نقطۂ نظر سے زبان کی نشوونما کے اصول کی بات کر رہے تھے وہ اصول جس کی اساس جسم میں سرخ خلیات کی مانند ہے، زبان میں نئے الفاظ و محاورات کی شمولیت پر استوار ہے۔ جبھی تو وہ مولہ بالا مضمون میں رقم طراز ہیں:

"تعجب ہے کہ میز، کمرہ، کچہری، نیلام وغیرہ اور فارسی اور انگریزی کے محاورات کے لفظی ترجمے تو بلاتکلف استعمال کرو لیکن اگر کوئی شخص اپنی اردو تحریر میں کسی پنجابی محاورے کا لفظی ترجمہ یا کوئی پر معنی پنجابی لفظ استعمال کر دے تو اس کو کفر و شرک کا مرتکب سمجھو اور باقی باتوں میں اختلاف ہو تو ہو مگر یہ مذہب منصور ہے کہ اردو کی چھوٹی بہن پنجابی کا کوئی لفظ اردو میں گھسنے نہ پائے۔ یہ قید ایک ایسی قید ہے جو علم زبان کے اصولوں کے صریح خلاف ہے اور جس کا قائم و محفوظ رکھنا کسی فرد بشر کے امکان میں نہیں ہے"۔

اور دیکھیے علامہ اقبال سے کوئی صدی بیشتر انشاء اللہ خاں انشاء ناسخ کا معاصر

ہونے کے باوجود لکھنؤ میں بیٹھے "دریائے لطافت" میں کیا پتے کی بات کرتے ہیں:

"جو لفظ اردو میں مشہور اور مستعمل ہو گیا خواہ عربی ہو یا فارسی، ترکی ہو یا سریانی، پنجابی ہو یا پوربی، اپنے اصل کی رو سے غلط ہو یا صحیح، وہ لفظ بہرحال اردو ہے۔ اگر اصل کے موافق مستعمل ہو تو صحیح اور اگر اصل کے خلاف ہو تو بھی صحیح۔ اس کا غلط و صحیح ہونا اردو کے استعمال پر منحصر ہے۔ اس لیے کہ جو لفظ اردو کے مزاج کے موافق نہیں ہے خواہ اصل کے لحاظ سے درست کیوں نہ ہو اور جو چیز اردو کے مزاج کے موافق ہے وہ صحیح ہے، خواہ اصل کے لحاظ سے غلط کیوں نہ ہو"۔

یہ ہے وہ لسانی تناظر جس میں آج کی "اردو" بلکہ زیادہ بہتر تو یہ کہ اردو کی صورت حال کا جائزہ لینا چاہیے، ایسی صورت حال جو عصری میلانات اور ثقافتی رجحانات کے تال میل سے گیسوئے اردو کے لیے شانہ مہیا کر رہی ہے۔

اس امر پر بطور خاص زور دینے کی ضرورت نہ ہونی چاہیے کہ اردو میں دوسری زبانوں کے الفاظ کو ان کے مخصوص تلفظ اور املا کے ساتھ بعینہٖ قبول کر لینے کی صلاحیت حاصل ہے گویا "ریختہ" کی اصطلاح متروک ہو جانے کے باوجود بھی اردو اس لحاظ سے تو ہمیشہ "ریختہ" ہی رہی ہے اور "ریختہ" ہی رہے گی۔ کبھی اس "ریختہ" میں عربی فارسی بھاشا فعال عناصر کی حیثیت رکھتے تھے آج انگریزی اس کے لیے میک اپ کا کام کر رہی ہے بلکہ بعض حضرات کے نزدیک تو اردو کے لیے انگریزی ایک طرح کا "لسانی کمبل" بن چکی ہے، ہم تو اسے چھوڑنا چاہتے ہیں مگر یہی نہیں چھوڑتا؟ اور یہ بھی انگریزی راج کی برکتوں میں سے ہے۔ حکمرانوں کی زبان ہونے کی وجہ سے انگریزی میں تحریر و تقریر کی مہارت حتیٰ کہ اس میں غصہ کا اظہار بھی تعلیم یافتہ، مہذب، اشرافیہ اور حاکم ہونے کے مترادف تھا۔ قیام پاکستان سے قبل غلام کی تعینات کی رو سے اس کا جواز ہو سکتا تھا مگر

مذہب، زبان اور اسلامی تہذیب و ثقافت کے نام پر حاصل کیے گئے پاکستان میں انگریزی کا عمل اور اس کی سربلندی ضرورت سے زیادہ ہے۔ قوم کے تشخص میں لباس اور زبان بنیادی کردار ادا کرتے ہیں اور ہم بحیثیت مجموعی ان دونوں سے بھی محروم ہیں۔ جس ملک میں دکانوں کے سائن بورڈ، گھر پر نیم پلیٹ، وزیٹنگ کارڈ، کار کے نمبر حتیٰ کہ دستخط تک انگریزی میں ہوتے ہوں تو وہ ایک قوم کیسے بن سکتی ہے اور وہاں انگریزی کی بالادستی کا شکوہ کیوں؟ رواجاً حکمران، سیاستدان اور بیوروکریسی کو الزام دینے کے ساتھ ساتھ بحیثیت مجموعی ہمارا رویہ بھی انگریزی نوازی ہی کا ہے۔ اس حد تک کہ اگر معیاری تعلیم ہے تو بس انگلش میڈیم سکولوں کی خواہ یہ سکول کتنا مہنگا اور گھٹیا ہی کیوں نہ ہو مگر بچے کو اسی میں داخل کرائیں گے۔ صاحبِ حیثیت لوگوں کا کلچر، رہائش، آرائش و تزئین، زبان سب کچھ مقامی اثرات سے "پاک" ہے تو پھر انگریزی ہی کا راج ہونا تھا۔ ہمارا مذہبی رنگ سبز ہے، ہمارا پرچم سبز ہے۔ ہم گنبد خضرا کے شیدائی، مزاروں پر سبز چادر چڑھاتے ہیں، ہمارا پاسپورٹ سبز ہے اور ہمارا خواب بھی "گرین کارڈ" ہے۔ مجھے تو اس پر تعجب ہے کہ ہنوز اردو زندہ کیسے ہے؟ اس کا "دی اینڈ" کیوں نہ ہو گیا!!

میں گزشتہ سطور میں لکھ آیا ہوں کہ قوم، عصر، ثقافت اور تخلیق یہ چار عناصر زبان کا مزاج بناتے ہیں، پاکستان میں ابتدائی تین عناصر مغرب کے رنگ میں رنگے ہیں۔ اگر زبان عصری شعور کا استعارہ ہے تو پھر آج کی لسانی صورت حال مرغ بادنما قرار پاتی ہے۔

لفظ کی جہات، مقبولیت عوامی استعمال سے مشروط ہوتی ہے جبھی تو خوش آہنگ اور خوب صورت الفاظ کے ساتھ ساتھ بدسیرت اور ناشائستہ الفاظ (بصورت دشنام) زبان میں مروج رہتے ہیں کہ یہ زیریں ثقافت (Sub-Culture) کے آئینہ

دار ہوتے ہیں۔ نصف صدی کے پاکستان کی ثقافتی صورت حال اور پاکستانیوں کی اکثریت کے رویوں کی بنا پر میں تو اس اداس کر دینے والے نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اب صرف یہ کہ انگریزی کا دفاتر، تعلیم، کلچر وغیرہ پر تفوق برقرار رہے گا بلکہ اس میں اضافہ بھی ہوگا۔ اس پر مستزاد مختلف علاقوں میں لسانی تعصب جس کا مشترک ہدف اردو بنتی ہے ادھر لندن اور کراچی کے پُرتشدد واقعات اور قتل و غارت نے اردو سے مختلف النوع منفی تلازمے وابستہ کر دیے۔

اردو اور انگریزی کی اثر پذیری کے ضمن میں ہم لوگ عجب مخمصے (Dellima) کا شکار ہیں، ہم ایک طرف اس بات پر بطور خاص زور دیتے ہیں کہ اردو ہر زبان کے الفاظ کھپا سکتی ہے مگر اس پر نالاں ہیں کہ دن بدن انگریزی الفاظ روزمرہ گفتگو کا حصہ کیوں بن رہے ہیں اور ٹیلی وژن پر اعلانات انگریزی میں کیوں ہوتے ہیں۔ عصری صورت حال، ثقافت اور انگلش میڈیم سکولوں کی بڑھتی ہوئی تعداد کی بنا پر اب یہ (پژمردہ کر دینے والی) پیش گوئی کی جا سکتی ہے کہ لحۂ موجود کے مقابلہ میں لحۂ قریب زبان میں انگریزی الفاظ کا اضافہ ہوگا۔ بڑی سیدھی سے وجہ یہ ہے کہ ایجادات، اشیاء، خوراک، لباس، تفریح وغیرہ سے وابستہ لاتعداد الفاظ عوام کی زبان کا حصہ بنتے رہتے ہیں بلکہ ان کی تعداد میں روز افزوں اضافہ بھی ہوتا رہتا ہے۔ ایسی قومی ثقافتی یلغار جس کے آگے بند باندھنے ناممکن ہیں، روس اور چین جیسے نظریاتی ممالک بھی اس کے سدباب میں ناکام رہے ہیں۔ دوسری صورت ایران کی ہے جس نے فارسی میں انگریزی الفاظ بولنے کو جرم قرار دے دیا ہے۔ ایسا رویہ بالآخر علمی تہی دستی پر منتج ہو سکتا ہے کیونکہ ہر نئے غیر ملکی لفظ کو اپنی زبان میں ڈھالنا/ ترجمہ کرنا/ اصطلاح وضع کرنا بھی طویل اور وقت طلب عمل ہوتا ہے۔ کسی ایجاد، شے، تصور، اصطلاح کو اصل زبان کے مطابق تحریر و تقریر میں لے آنا دراصل ایک طرح کا شارٹ کٹ ہوتا ہے۔ یوں غیر ملکی لفظ کو اپنا

رنگ دینے میں وقت اور توانائی کی بچت ہو جاتی ہے، لیکن جس رفتار سے ہم لسانی شارٹ کٹس سے کام لے رہے ہیں، اس کے نتیجے میں ڈر ہے کہ شاید ایک وقت ایسا بھی آ جائے جب اردو کے ذخیرۂ الفاظ میں عربی فارسی الفاظ کے مقابلے میں انگریزی الفاظ کا تناسب بڑھ جائے۔ ہمارے ہاں الفاظ اور اصطلاحات وغیرہ کا شماریاتی تجزیاتی مطالعہ نہیں ہوتا اگر اردو میں مروج الفاظ و اصطلاحات کا کمپیوٹری مطالعہ کیا جائے تو عربی، فارسی اور انگریزی الفاظ کے تناسب کے ضمن میں شاید حیران کن نتائج سامنے آئیں اور تب یہ اندازہ ہوگا کہ عام زندگی کے ساتھ ساتھ زبان کے معاملہ میں بھی ہماری مغرب زدگی کا کیا عالم ہے۔ "گلابی اردو" والے ملا رموزی آج کی اردو سنیں تو انھیں اندازہ ہو کہ اب اردو کتنی "آتشی گلابی" ہو چکی ہے۔

زر، زمین، معیشت کے نتیجے میں اگرچہ ہمارے معاشرہ طبقات میں تقسیم ہے مگر ان طبقات میں ہم رنگی اور ہم آہنگی کا فقدان ہوتا ہے، اس لیے ہر طبقے میں کئی "ثقافتی گرہیں" (Cultural Pockets) بھی ملتی ہیں۔ اسے اس مثال سے سمجھیے کہ صرف ایک لفظ بیورو کریسی سے ایک طبقہ مراد لیا جاتا ہے جبکہ صورت حال یہ ہے کہ پی سی ایس اور سی ایس ایس کی صورت میں نہ صرف یہ الگ الگ ہیں بلکہ ہر گریڈ کے ساتھ طبقاتی شعور تبدیل ہوتا جاتا ہے۔ ہم ہندوؤں کے ذات پات کے نظام کا مذاق اڑاتے اور اسلامی مساوات پر زور دیتے ہیں جبکہ صرف بیورو کریسی ہی بائیس گریڈوں پر مبنی ذات پات کے کٹر نظام کی اسیر ہے۔ سترہ اور بائیس گریڈ کے افسر کے منصب و مراعات کی مناسبت سے اس کا ثقافتی اور لسانی رویہ مرتب ہوتا ہے، یوں ایک بڑا طبقہ کئی ثقافتی گروہوں میں تقسیم ہو جاتا ہے۔ جبھی تو دیہاتی، مولوی، کالجیٹ، سیاستدان، بیورو کریٹ کی زبان اردو ہوتے ہوئے بھی ایک دوسرے سے الگ سنائی دیتی ہے۔ اس لیے بعض اوقات ایسی زبان ابلاغ کے برعکس اخفاء کا کام کرتے ہوئے ایک نوع

کی "مدافعت" میں تبدیل ہو جاتی ہے، یہی وہ "طبقاتی" رویہ ہے، جس کے باعث مخصوص الفاظ، مخصوص حوالے، مخصوص کنائیے اور مخصوص اصطلاحات سے ابلاغ بھی بعض اوقات عدم ابلاغ میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ کبھی زبان پردہ کا کام کرتی ہے تو کبھی ثقافتی حد بندی کا۔ ڈراموں میں مزاح اہزل ابھکڑپن اجگت بالعموم پنجابی زبان میں ہوتی ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ڈرامہ کے اردو بولنے والے سنجیدہ کرداروں کے مقابلہ میں مسخرہ نوکر اعلیٰ طبقہ کے سنجیدہ کرداروں کی ارفع زبان کے مقابلہ میں کمی کمین کی زبان بول کر بحیثیت مجموعی ادنیٰ اور پست کی نمایندگی کرتا ہے۔ عام گفتگو، بحث مباحثہ وغیرہ میں جب اپنی بات پر بطور خاص زور دینا ہو، کسی نکتے کی اہمیت اجاگر کرنا ہو یا کسی دلیل کی پرزور تردید مقصود ہو تو اس مقصد کے لیے بھی انگریزی کا سہارا لیا جاتا ہے۔ اس رویے کی عام مثالیں اتنی زیادہ ہیں اور ہم ان کے اتنے عادی ہو چکے ہیں کہ کبھی بطور خاص ان کی طرف توجہ نہیں دیتے۔ درزی ٹیلر ماسٹر کہلوانا پسند کرتا ہے تو حجام ہیئر ڈریسر، بڑھئی کارپنٹر ہے، موچی شومیکر تو شعبدہ باز میجک پروفیسر، دکانوں کے سائن بورڈوں پر ایک نگاہ ڈالنے سے یہ اندازہ ہو جائے گا کہ اب انگریزی کی جڑیں ہمارے معاشرے میں کتنی گہری ہیں۔ یہ رویہ اسی احساس کمتری کا پیدا کردہ ہے جس کی جڑیں عہد غلامی تک جاتی ہیں اور آزادی کی نصف صدی بعد بھی اس سے چھٹکارا حاصل نہ ہو گا حالانکہ قومی نقطۂ نظر سے لسانی رویہ اس کے برعکس ہونا چاہیے جس کی مثال اس سکھ سے ملتی ہے جو انگریز سے انگریزی میں لڑتا رہا اور پھر غصہ میں آ کر بولا "More Over" اور پنجابی میں گالیاں دینی شروع کر دیں۔ یہ لطیفہ بھی اجتماعی لسانی رویہ کی بہت اچھی مثال پیش کرتا ہے۔

ایسے کمالات پاکستان ہی میں ممکن ہیں اور ماضی اور حال کے بعض قومی راہنما اور عوامی نمائندے صرف انگریزی ہی میں فصاحت کا دریا بہا سکتے ہیں۔ عوام اتنی سی بات

بھی نہیں سمجھتے کہ جو شخص میری زبان نہیں بول سکتا وہ میرے دکھ درد میں کیسے شریک ہو سکتا ہے۔

آج سے ایک صدی قبل اکبر الہ آبادی نے کہا تھا:

محفل میں بُو آئے کیا ماں باپ کے اطوار کی
دودھ تو ڈبے کا ہے تعلیم ہے سرکار کی

اکبر الہ آبادی ۱۹۹۷ء کے پاکستان میں ہوتے تو نہ جانے اور کیا کچھ لکھتے۔

ہم میں پاکستانی سوچ پر مبنی طرز احساس اس لیے نہ پیدا ہو سکا کہ ہم اپنے وطن میں اپنی زبان کے بارے میں محرومی کا شکار ہیں۔ ہمارے معاشرے میں انگریزی اس قدر سرایت کر چکی ہے کہ اب روزمرہ کی زندگی اور بول چال میں اس کا خارج کرنا محال نظر آتا ہے۔ یہ قومی المیہ سہی مگر ہے۔ یہ حقیقت خواہ تلخ ہی کیوں نہ محسوس ہو ------- اور یہی خدوخال ہیں پاکستانی اردو کے ----- جو انگریزی الفاظ سے "پاک" نہیں ہو سکتی۔ پاک ہونا کیا ان کی تعداد میں مسلسل اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ ٹیلی وژن، وی سی آر، ڈش، کمپیوٹر وغیرہ کی وجہ سے گذشتہ دو دہائیوں میں لاتعداد انگریزی الفاظ اور اصطلاحات کا اضافہ ہوا ہے۔ انگریزی الفاظ کی درآمد پر پابندی نہیں لگائی جا سکتی اگرچہ فرانس اور ایران نے یہ حکم بھی جاری کر دیکھا۔

اگر اردو میں انگریزی الفاظ کے تناسب کو اعتدال میں رکھنا مقصود ہو تو پھر پاکستان کی دیگر زبانوں سے الفاظ اور تراکیب لینے کی ضرورت ہے یوں انگریزی کے مقابلے کے ساتھ ساتھ اردو کا دامن بھی وسیع تر ہو سکے گا۔ پنجابی، سندھی، سرائیکی، پشتو، بلوچی، ہندکو، پوٹھوہاری، براہوی وغیرہ میں ایسے الفاظ کی کمی نہیں جن سے گفتگو یا تحریر اور تخلیق میں امداد لی جا سکتی ہے۔ ایسی سعی احکامات اور آرڈیننس سے ممکن نہیں

ہوتی یہ تو افراد کی شعوری کوشش سے مشروط ہوتی ہے۔ اگر تخلیقی فن کار اپنے اپنے علاقے کی زبان کے خوبصورت اور خوش آہنگ الفاظ اپنی تحریروں میں استعمال کریں تو اس سے کسی حد تک انگریزی کی یلغار کا مقابلہ بھی ہو سکے گا۔ یوں اردو میں راوی کا بہاؤ، روہی کی مٹھاس، صحرا کی وسعت اور پہاڑوں کی رفعت بھی پیدا ہو جائے گی۔ بہت نکھریں گے پاکستانی اردو کے خدوخال۔

پاکستان میں اردو زبان کے بدلتے ہوئے خدوخال

پروفیسر جیلانی کامران

شمالی برصغیر کے جن علاقوں کے ساتھ پاکستان کے جغرافیائی وجود کا تعلق ہے، اردو اُن علاقوں کے لیے قطعی اجنبی نہ تھی۔ پنجاب، کشمیر، سرحد اور بہاول پور میں اردو ذریعۂ تعلیم تھی۔ سندھ میں بھی اردو کا کافی عمل دخل تھا۔ ریاست خیرپور کا دیوان اردو میں کام کرتا تھا۔ سندھ کے متمول گھرانے اپنے بچوں کو علی گڑھ ضرور بھیجتے تھے۔ اسی طرح بلوچستان میں بھی اردو کسی طرح غیر مانوس نہ تھی۔ شمالی برصغیر میں جب پنجاب نے اردو کو ۱۸۴۹ء میں سرکاری زبان کے طور پر تسلیم کیا تو اردو کا اثر و رسوخ ان علاقوں میں ہوا جن کی جانب اشارہ کیا گیا ہے۔ پنجاب کے لسانی چناؤ نے جہاں لاہور کو اردو کے مرکز ہونے کا مقام دیا، وہیں اس کی مدد سے شمالی اور شمال مغربی برصغیر کا تعلق لکھنؤ اور دلی سے قائم ہوا اور ان کی وساطت سے بھوپال، کلکتہ، حیدر آباد اور بنگلور بھی اُن دور افتادہ علاقوں کی دسترس میں آتے گئے۔ تاہم زبان کی سند دلی اور لکھنؤ کی رہی اور اساتذہ کے کلام کو سند کا درجہ برابر دیا جاتا رہا۔ لہجے میں بھی دلی اور لکھنؤ کا لہجہ سند رہا۔ حیدر آباد، بھوپال بنگلور میں بھی مستند لہجہ مرکز کا رہا۔ اس لیے جب ۱۹۳۷ء میں آل انڈیا ریڈیو دہلی کا قیام عمل میں آیا تو اردو زبان کی سند کو مرکزیت حاصل ہوئی اور لہجے کا مستند ہونا لازمی ٹھہرایا گیا۔ زبان کے ماہر کی آسامی بھی ریڈیو کے عملے کا ضروری حصہ گردانی گئی۔ اس ضمن میں یہ بھی قابل غور ہے کہ رسائل اور اخبارات کی جو تعداد ۱۹۴۷ء سے قبل ان علاقوں میں دیکھنے میں آتی تھی اُن کی غالب ترین تعداد دلی اور لکھنؤ، بجنور، کانپور، میرٹھ الہ آباد، کلکتہ، بمبئی، مدراس، بھوپال اور بنگلور سے شائع

ہوتی تھی۔ اُن علاقوں سے بھی اردو بولنے والے افراد شمالی برصغیر میں آتے جاتے تھے۔ لوگ اُن سے اردو میں باتیں بھی کرتے تھے۔ برصغیر میں اردو رابطے کی زبان بھی تھی، مسلمانوں کی مذہبی زبان بھی تھی، دیوبند، فرنگی محل اور شیعہ ذاکرین کی زبان بھی تھی، جامعہ ملیہ دلی کی زبان تھی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی زبان تھی۔ شمالی برصغیر میں تدریس کی زبان بھی تھی۔ گو یونیورسٹی کی زبان نہ تھی اور نہ ایف اے کے بعد کورس میں شامل تھی۔ آپشنل اردو کے طور پر پنجاب میں اردو کو ایف اے کے نصاب میں ۱۹۳۷ء میں شامل کیا گیا ہرچند کہ گورنمنٹ کالج میں اردو ڈرامہ اور راوی کا حصہ اردو ۱۹۲۰ء کے بعد برابر دکھائی دیتا ہے۔ اردو کو گورمکھی اور ہندی کے ساتھ متبادل زبان کا درجہ دیا گیا تھا۔ اردو کا جو آل انڈیا مقام ۱۹۴۷ء سے پہلے نظر آتا ہے وہ جرنلزم، مسلم نیشنلزم، لاہور کے ادبی شہری شعور، اردو رسائل کی اشاعت اور لاہور کے برصغیر کے دیگر مراکز کے ساتھ رابطے، دوسری عالمگیر جنگ اور آل انڈیا ریڈیو کی باعث تھا، اس میں کسی نوع کی منصوبہ بندی کا کوئی دخل نہ تھا۔ اردو ادبی کلچر کی علامت کے طور پر مانی جاتی تھی اور ادبی شعور کا سمبل تھی۔ جگن ناتھ آزاد کے والد تلوک چند محروم اس ادبی سمبل کا قابل ذکر اظہار تھے۔

-----(۲)-----

.........تاہم جو کچھ کہا گیا ہے یہ صرف یاددہانی کے لیے بیان کیا گیا ہے!

۱۹۴۷ء میں اردو کا پاکستان میں ورود اس تحریک کے نتیجے میں ممکن ہوا تھا جس کا تعلق مسلمانوں کی آزادی کے ساتھ تھا اور جو اُس لسانی تصادم کی ایک سنجیدہ جہت بھی تھا جو ۱۸۶۰ء کے بعد اُردو ہندی مخاصمت کی شکل میں آشکار ہوا تھا اور آزادی کی تحریک کے دوران میں قومی زبان کی صورت میں سامنے آیا تھا، جسے بنگال اور سندھ کے مسلمانوں نے تسلیم کیا تھا۔ ودیامندز سکیم کو رد کرنے کی ایک وجہ اردو کو نظر انداز کا

رویہ بھی تھا، اس لیے پاکستان کے قیام کے وقت ایسا کوئی خیال نہ تھا کہ کسی نوع کی پاکستانی اردو کا کوئی وجود بھی ممکن ہے۔ اردو کا صرف ایک تشخص تھا کہ یہ مسلمانوں کی قومی زبان ہے، اس لیے ہماری قومی زبان ہے۔ اب وہ مراکز مٹ چکے ہیں جہاں کی سند قابل اعتبار تھی۔ وہ تہذیب اُن علاقوں میں باقی نہیں رہی جس کی نشاندہی برصغیر میں اردو زبان اور ادب کرتے تھے۔ وہ ادارے اپنی صورت زائل کر رہے ہیں جن کی نشوونما اردو زبان کرتی تھی۔ اردو پڑھنے والوں کی تعداد، بھارت میں روز بروز کم ہوتی جا رہی ہے اور اب وہاں اردو پاکستان کی جانب دیکھتی ہے۔ ایسا اس لیے کہنا ہے کہ پاکستان اردو کا اِس زمانے میں وارث ہے۔ اردو زبان کے دیرینہ مراکز پاکستان میں منتقل ہو چکے ہیں اور اردو کے علمی، تاریخی، مذہبی اور تہذیبی ماضی کا شعور پاکستان کے رگ و ریشہ میں جی رہا ہے۔ اردو پاکستان کا تشخص ہے۔

-----(۳)-----

اس موقع پر ضروری ہے کہ جو کچھ کہا گیا ہے اُس کی مزید وضاحت کی جائے!

عہد حاضر میں دنیا بھر میں اردو استعمال کرنے والوں کی تعداد تیسرے درجہ پر ہے۔ اردو زبان ایک نو عمر بین الاقوامی زبان ہے اور اُس کا شمار تیسری بین الاقوامی زبان کے مقام کے حوالے سے ہوتا ہے۔ بہت کم زبانوں کو ایسا امتیاز حاصل ہوتا رہا ہے۔ بین الاقوامی حلقوں میں اردو پاکستان کا تہذیبی، ادبی اور تمدنی تشخص ہے۔ آکسفورڈ ڈکشنری اردو کو پاکستان کی سرکاری زبان قرار دیتی ہے۔ اگر یہ مان لیا جائے کہ پاکستانی اردو کے نام کی کوئی شے موجود بھی ہے تو یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ اصل اردو کا علاقہ کہاں ہے؟ اور اب اس کی سند کس سرزمین پر واقع ہے؟ تاہم جو کچھ اوپر کہا گیا ہے اُس کی توضیح بشریٰ اعجاز کے سفرنامے کے ایک مختصر سے اقتباس سے بھی ممکن ہے۔

ماہنامہ تخلیق لاہور کے شمارہ دسمبر ۱۹۹۶ء میں قسط نمبر ۸ کے تحت وہ لکھتی ہیں:

"پرنسپل ریش کمار سے چنڈی گڑھ میں قیام کے دوران میں پوچھا کہ فارسی رسم الخط کیوں ختم ہوا ہے اور باتوں باتوں میں کہا۔۔۔۔

"آخر آپ کے ہاں اردو کیوں ختم ہوتی جارہی ہے۔ حالانکہ یہ ملک (ہندوستان) اردو کی جنم بھومی ہے۔۔۔۔ بس! بشریٰ جی (وہ کہنے لگے) ہمیں بھی اس بات سے ہول اٹھتا ہے کہ اردو کے گھر میں اردو کا مستقبل کیا ہوگا"۔ "تو کیا آپ اردو کی ضرورت محسوس نہیں کرتے"؟ "کرتے ہیں، بالکل کرتے ہیں اور ولی دکنی کے عہد کی اُس خوبصورت زبان کو جاننا بھی چاہتے ہیں لیکن یہاں کا تعلیمی نظام ہی ایسا ہے کہ یوں ممکن نہیں ہوسکتا"۔

کیفی اعظمی کے حوالے سے ذکر کرتے ہوئے بشریٰ اعجاز لکھتی ہیں۔

"اردو کے حوالے سے میں نے کیفی صاحب سے پوچھا تو مایوسی سے سرہلا کر کہنے لگے۔ بس بی بی! یہاں اردو لکھنے اور پڑھنے والے گنتی کے لوگ رہ گئے ہیں۔ میں اردو کو اپنی آنکھوں کے سامنے مرتا دیکھ رہا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ ہماری نسل کے بعد یہاں اردو رسم الخط جاننے والا شاذ ہی کوئی ہو۔ یہ زوال کب آیا؟ کیفی صاحب! "بی بی! زوال کبھی بھی اچانک نہیں آتا۔ بتدریج آتا ہے اور اس کی کئی وجوہات ہوتی ہیں۔ یہاں کچھ ایسا ہی ہوا۔ اردو کو مارنے کی باقاعدہ پلاننگ کی گئی ہے اور باقاعدہ منصوبہ بندی کے تحت ختم کیا گیا ہے۔ ۱۹۶۵ء میں ہونے والے کتابوں کے ایک سروے کے بارے میں جسے ۱۹۹۵ء میں پونا میں ادیبوں کی کانفرنس میں بتایا گیا کہ اُس برس (۱۹۶۵ء) بھارت میں دو کتابیں سب سے زیادہ بکی تھیں۔ ایک بھگوت گیتا اور دوسری

دیوان غالب۔ لیکن یہ اعداد و شمار ۱۹۶۵ء کے تھے!"

ان اقتباسات میں جو امر قابل ذکر ہے، یہ ہے کہ زبانوں کا مستقبل رسم الخط سے رونما ہوتا ہے۔ رسم الخط کے خاتمے سے ایک تو اُس زبان کا تعلق ماضی کے زمانے سے ٹوٹ جاتا ہے اور دوسری طرف زبان کو محض بول چال کا وسیلہ بنا کر اُسے لوک سطح پر اُتار دیا جاتا ہے۔ ایک خاص عرصے میں اُس کی قدر و منزلت بھی ناپید ہو جاتی ہے۔ مذہبی زبان کی حیثیت بھی اُسے برقرار نہیں رکھ سکتی۔ چنانچہ رسم الخط سے محروم زبان کو کسی متبادل زبان کو قبول کرنا پڑتا ہے۔۔۔۔ یہ سب کچھ اس لیے کیا گیا ہے کہ اس امر کو واضح کیا جا سکے کہ عہد حاضر میں اصل اردو ختم ہو چکی ہے۔ اُس کا کوئی بھی وطن نہیں ہے۔ اُس کی محض ایک تاریخ ہے اور تاریخ رسم الخط کے بغیر پڑھی نہیں جا سکتی! ان حالات میں اردو کا واحد وطن پاکستان ہے۔

قومیں بنیادی تاریخی حقائق میں نظر ثانی نہیں کرتیں اور تاریخی عمل میں کامیاب اور باوقار ثابت ہوتی ہیں۔ اگر یہ صداقت مان لی جائے تو کوئی بھی مسئلہ تاریخ کے حوالے کے بغیر زیر بحث نہیں لایا جا سکتا۔ پاکستان آل انڈیا مسلم سیاست سے پیدا ہوا ہے اور شمالی اور شمال مغربی برصغیر کے جغرافیائی علاقوں کی یکطرفہ کوشش سے معرض وجود میں نہیں آیا تھا۔ اس لیے پاکستان کے ساتھ جو اردو زبان اس ملک کی زبان قرار پائی اور برابر موجود ہے وہ اردو اور صرف اردو ہے اور اسے کوئی دوسرا اسم نہیں دیا جا سکتا۔ اب اس کا وطن پاکستان ہے!

-----(۴)-----

اگر بھارت میں اردو کا مستقبل مخدوش ہے تو ضروری ہے کہ وہاں اردو میں لکھنے والے اپنی اردو کو انڈین اردو کے نام سے قائم رکھیں۔ یوں اُن کا تشخص بھی قائم رہے

گا۔ ورنہ آل انڈیا ریڈیو کی اردو سروس کے سوا بھارت میں تو اردو کا نام و نشان رسم الخط کی شکل میں کہیں دکھائی نہیں دیتا۔ پاکستان میں اس بارے میں سوچنا غیر مناسب ہے۔

قیام پاکستان میں فوری طور پر زبان کے بارے میں جو تغیر دکھائی دیا تھا وہ سائن بورڈ کی تبدیلیاں تھیں۔ باربروں نے "آرایشِ گیسو" کے نام سے نئے سائن بورڈ لکھوائے۔ جوتوں کی دکانوں پر "پازیب مرکز" کا نام دکھائی دیا۔ نیوڈریسز کی بجائے "نئے ملبوسات" دکان کا نام تجویز ہوا۔ یہ سب کچھ آزادی کے پہلے دس برسوں کے دوران ہوا اور زبان سکہ بند، معیاری، خوبصورت اور جمالیاتی انداز میں بھی خوشنما دکھائی دی۔ اسی دوران میں ریڈیو لاہور اور ریڈیو پاکستان کے دیگر اسٹیشنوں پر تلفظ کے ماہرین کا خاص طور پر انتخاب کیا گیا۔ اخبارات کے ادارتی عملے کی زبان کے حوالے سے تعیناتی ہوئی اور ایک مستند اردو کو وہ مقام دیا گیا جسے پاکستان نے آزادی کے وقت اپنے ہمراہ لاکر اُس دھارے میں شامل کیا جو یہاں بہت پہلے سے شان و شوکت کے ساتھ بہہ رہا تھا۔

۱۹۴۷ء میں اردو کی صورت حال کا ذکر کرتے ہوئے یونس جاوید، حلقۂ ارباب ذوق کی تاریخی روداد بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ۲۱ ستمبر ۱۹۴۷ء کو یوسف ظفر نے "پاکستان میں اردو اور حلقہ ارباب ذوق" کے عنوان کے تحت مضمون پڑھتے ہوئے کہا "اس مقصد کے لیے کہ حلقۂ ارباب ذوق اردو کے لیے کیا کرے؟ اور کس طریق سے کرے؟ جو چند تجاویز قابل ذکر تھیں یہ ہیں:

۱۔ حلقہ کی شاخیں ہر ضلع میں قائم کی جائیں اور بالغوں کی تعلیم کے مدارس کھولے جائیں، جن کی حکومت مدد کرے۔

۲۔ حلقہ تعلیمی بورڈ قائم کیے جائیں اور درسی کتابیں تیار کروائی جائیں۔ حلقہ کے

اراکین کو یونیورسٹی کے اردو بورڈ میں بھی شمولیت دی جائے۔

۳۔ زبان کی صحت کے لیے نشرواشاعت کے اداروں میں بورڈ قائم کیا جائے۔

۴۔ زبان کی تحریری اور صوتی تربیت کے لیے حلقہ کے پروگرام کے بعد پندرہ منٹ کا ایک اور پروگرام بھی ہو جو سند اور صحتِ تلفظ کے لیے خدمت انجام دے سکے!"

قیامِ پاکستان کے بعد اردو زبان کے ضمن میں جو رویے دکھائی دیئے تھے اُن میں زبان کا معیار، تحریر و تقریر، جمالیات، بلاغت اور نظامِ عروض و اصوات، جملے کی ساخت، لہجے کا بہتر ہونا اور الفاظ کی نشست و برخاست کا اہتمام، گرامر اور اضافتوں کا التزام اور املا کا قدیم تدریسی انتظام غرضیکہ سارا نظام آموزشِ زبانِ اردو روایت کے مطابق تھا۔ ---- زبان ابھی بول چال اور تحریر و ادب کے الگ الگ منطقوں میں منقسم نہیں ہوئی تھی۔

-----(۵)-----

اردو شعری زبان کے مسئلے پر غالباً پہلی بار استا نزے (۱۹۵۷ء) (استا نزے (نظمیں) جیلانی کامران، ۱۹۵۷ء، لاہور) کے پیش لفظ میں ذکر کیا گیا تھا، جس میں نئے الفاظ کی ضرورت، اضافتوں کا عدم استعمال، اور عروض کے حوالے سے تلفظ کے سوال کا جائزہ لیا گیا تھا اور کہا گیا تھا کہ الفاظ کے مستعمل اور غیر مستعمل کی تفریق کا جواز بھی باقی نہیں رہا، کیوں کہ تلفظ کے مراکز بدل گئے ہیں اور نئے مراکز معرضِ وجود میں آ رہے ہیں۔ اضافتوں کے عدم استعمال کی ضرورت اس لیے پیش آئی تھی کہ اضافتوں کے ذریعے تجربے کے منفی ہو جانے کا اندیشہ پیدا ہوتا تھا۔ تجربے کی وضاحت کے لیے اضافتوں کو پیش منظر سے الگ کرنا مناسب سمجھا گیا تھا۔ اسی طرح پرانی شعری ترکیبوں

کو توڑنا بھی (ڈی سٹرکچر لائز کرنا) ہے، لازمی گردانا گیا تھا۔ استانزے کے تجربے سے اردو شعری زبان ایک نئے انداز سے روشناس ہوئی۔ پُرخلوص واردات۔ نظم کی معنویت کے لیے ضروری قرار پائی اور اُس کا تشخص بن کر ظاہر ہوئی۔ اسی ضمن میں کہا گیا تھا کہ نئی شاعری کے لیے نئی زبان کا ظاہر ہونا لازمی ہے۔ اس سلسلے میں یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ نئی شاعری کے لیے نئے موضوعات کا ہونا اور اُن کی دریافت ضروری گردانی گئی تھی۔ علاقائی زبانوں کے الفاظ سے نئے پن کے حصول کو رد کیا گیا تھا۔ علاقائی زبانوں کے الفاظ کا استعمال نئے شعری مزاج کی تشکیل میں اعلیٰ شاعری کا معاون ثابت نہیں ہو سکتا۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ ظفر اقبال نے گلافتاب میں پنجابی اور اردو الفاظ کے مرکبات سے جو کچھ حاصل کیا وہ شاعری کے لیے سودمند ثابت نہ ہو سکا۔ اس امر سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اردو زبان کے نشوونما کا محور بطنِ زبان ہے، زبان کا بدن نہیں ہے۔ الفاظ کی غیر قدرتی ساخت و ترویج سے زبان نشوونما اور تشخص حاصل نہیں کر سکتی۔ تشخص باطنی مسئلہ ہے جو زبان کی تاریخی روداد سے رونما ہوتا ہے۔ جو تادیر حالت میں پاکستان کے قلب و ذہن ہی سے اپنے ہویدا ہونے کی گواہی حاصل کر سکتا ہے! اور وہ کب ممکن ہو گا۔ اس کا انتظار لازمی ہے! اور مسلسل محنت درکار ہے!

اس موقع پر اگر اردو کو محض زبان کی بجائے اردو شاعری کے حوالے سے زیر بحث لایا جائے تو ایک آدھ مسئلہ ضرور حل ہو سکے گا۔ اُس زمانے میں اس سوال پر غور کیا گیا کہ پاکستان اپنے منفرد طرزِ احساس کے لیے جس نئی شاعری کی تلاش میں ہے، اس کے اجزائے ترکیبی کہاں سے دریافت کیے جا سکتے ہیں۔ یہ مسئلہ ایک جانب موضوعات سے تعلق رکھتا تھا اور دوسری طرف نئے الفاظ کی تلاش کا مسئلہ بھی تھا۔ الفاظ کا ایک ذخیرہ کلاسیکی اردو شاعری کے پاس بھی تھا مگر اُن پر مانوس ہونے کی چھاپ بڑی دبیز اور گہری تھی۔ اس کے لیے علاقائی شاعری کو نئی شاعری کا مرجع گردانا گیا اور اس طریق

عمل نے نظری تصرف کو موضوع بنانے کی راہ ہموار کی۔ پہلی بار ضمیر مخاطب "تو" اور کائنات کا رشتہ، نئی شاعری میں ظاہر ہوا۔ زبان آسان سے آسان تر ہوتی گئی۔ استعارے نے تکلم کی صورت اختیار کی اور شاعری عروض کی آہن گری سے آزاد ہوتے ہوئے نرم لہجے کی گفتگو بنتی گئی۔ یوں خارج میں ایک نئی زبان سامنے آئی اور باطن میں ایک نیا طرزِ احساس سنائی دینے لگا۔ یہ نئی زبان پاکستان کے نئے اردو شعری احساس کی پہچان بن گئی۔ یہ ہر اعتبار سے اردو تھی۔ ۱۹۴۷ء کے بعد اسلامیان ہند کے وارثین کی اردو زبان نے جو لاہور، کراچی، اسلام آباد، راولپنڈی، پشاور، ملتان اور کوئٹہ کے شہروں میں ظاہر ہوئی تھی، زبان کے ایک نئے مزاج کے آشکار ہونے کی خبر دی تھی!

-----(۶)-----

پاکستانی اردو کے ساتھ "اصل وطن" کا تصور ایک عجیب مخدوش صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ اگر اصل اردو کا وطن پاکستان نہیں ہے تو یہ ضرور تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ اردو کا اصل وطن مر چکا ہے اور پاکستان کا نہ تو اُردوئے معلیٰ کے ساتھ کوئی رشتہ ہے اور نہ برصغیر کی مسلم قومی زبان کے ساتھ اس کا کوئی تعلق ہے۔ انگریزی کا اصل وطن برطانیہ ہے، وہاں اسے برٹش انگلش کی بجائے کنگز انگلش کہا جاتا ہے جو اردوئے معلیٰ کا جائز مصداق ہے۔ اس رعایت سے امریکن انگلش "نوزی لنڈرز انگلش، کینیڈین انگلش اور آسٹریلین انگلش کی تراکیب وضع کی جا سکتی ہیں لیکن اگر کنگز انگلش کا خاتمہ ہو جائے تو ساری تراکیب متروک ہو سکتی ہیں۔ برصغیر میں اردو ہندوستان (بھارت) میں ختم کر دی گئی ہے اس لیے اُسے ایک نیا وطن دستیاب ہوا ہے جہاں وہ قومی زبان ہے، اس لیے زیر نظر مطالعے کے لیے مناسب موضوع یہی ہو سکتا ہے: "پاکستان میں اردو زبان کے بدلتے ہوئے خدوخال"۔

-----(۷)-----

پاکستان میں اردو زبان کے خدوخال کی تلاش میں اس امر کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے کہ ایسا ارتباط جہاں مطلوبہ خدوخال رونما ہوئے ہیں، ادب کے حوالے سے قائم نہیں ہوا بلکہ اُن آبادیوں کے باہمی میل جول سے برآمد ہوا ہے، جہاں اردو بولنے والے تارکین وطن اور مقامی آبادی کے افراد ایک دوسرے کے قریب آئے ہیں۔ بازاروں میں سوداسلف خریدتے ہوئے، بسوں میں، ریل گاڑی میں اور بے شمار دوسرے ذرائع کے ایسے رابطے یقیناً ہیں جنھوں نے اُردو زبان کے روزمرہ خدوخال کو تشکیل دیا ہے۔ اردو زبان بولنے والوں کی ایک نہایت پائیدار اکثریت کراچی، حیدر آباد، سکھر، روہڑی اور نواب شاہ کے اضلاع میں مقیم ہے۔ اُن کی تعداد پاکستان کے دوسرے منطقوں میں بھی آباد ہے۔ ہر مقام پر اُن کا حدود اربعہ علاقائی زبان مرتب کرتی ہے اور رابطے کی دعوت دیتی ہے لیکن عام بول چال کی سطح پر ایسا کوئی مشاہدہ سامنے نہیں آیا کہ معروضی انداز میں اس رابطے کے نتیجے میں کون کون سے خدوخال رونما ہوئے ہیں۔ ایک مثال شاید اس ضمن میں کچھ نشاندہی کر سکے۔ سرکاری رہایش گاہوں میں اکثر اوقات علاقائی زبان (پنجابی) بولنے والے اور اردو بولنے والے گھرانے آمنے سامنے سکونت پذیر ہو کر باہمی تعلق قائم کر لیتے ہیں۔ پنجابی گھرانے کی خواتین پنجابی میں گفتگو کرتی ہیں اور اردو بولنے والی خواتین اردو میں باتیں کرتی ہیں۔ ایسے رابطے سے دونوں زبانیں افہام و تفہیم کو پیدا کرنے میں کامیاب ہو جاتی ہیں۔ اردو بولنے والی خاتون پنجابی کے الفاظ کے معانی سمجھ لیتی ہے اور پنجابی بولنے والی خاتون اردو الفاظ کے قریب تر آ کر اور سمجھنے کی حد تک اردو زبان کا سامع بننے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ پنجابی کے الفاظ، اردو زبان کے قالب میں بہت کم راہ پانے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ پنجاب کے شہروں میں تو ایسی صورت یقیناً پائی جاتی ہے لیکن سندھی، ہندکو، پشتو، سرائیکی،

پوٹھوہاری، اور کشمیری کے الفاظ کہاں تک ارتباط گفتگو کے ذریعے اردو زبان کے خدوخال میں داخل ہوئے ہیں، اس کا ادراک کرنا دشوار ہے۔ البتہ رابطے کی زبان کے طور پر اردو میں جو عمل پذیری دکھائی دے رہی ہے کہ گزشتہ پچاس برسوں کے دوران میں اردو زبان نے علاقائی زبانوں کے محل وقوع میں اپنے آپ کو کامیابی کے ساتھ آباد کیا ہے۔

اردو بولنے والی آبادیوں کی اولاد دو زبانیں سمجھتی ہے۔ اردو خود بولتی ہے، علاقائی زبان ماحول سے سیکھتی ہے۔ اُن کی اردو زبان میں علاقائی رویوں اور لفظوں کے حجم کی شناخت کی جا سکتی ہے لیکن اس طرح جو خدوخال تشکیل پا سکے ہیں، ان کو دو الگ الگ زبانوں کے متوازی طرز عمل کا نتیجہ قرار دیا جا سکتا ہے اور وہ اردو زبان کی سطح ہی پر دکھائی دے سکتے ہیں۔ جس انجذاب کی زبانوں کو حاجت پڑتی ہے اور جس کے نتیجے میں کوئی زبان امریکن انگلش کا مقام حاصل کرتی ہے، اُس کے لیے ایک طویل مدت اور اولادوں کے لمبے سلسلے کی ضرورت ہوتی ہے اور قومی زبان کے درجے کا حتمی طور پر مستحکم ہونا بھی ضروری ہوتا ہے۔

اردو زبان اور علاقائی زبانوں کی گرامر میں بھی معمولی سا فرق دکھائی دیتا ہے۔ تذکیر و تانیث بھی اس سلسلے میں نئے نئے رویے پیدا کرتی ہے۔ پنجاب میں "بلبل" مؤنث ہے۔ اردو زبان کا ایک لہجہ مذکر ہے، اور ایک دوسرا مستعمل مؤنث بھی ہے۔ اردو شاعری میں "بلبل" مؤنث ہے۔ اسی طرح "احیاء" جو مذکر ہے۔ عصری شاعری میں مؤنث کے صیغے میں استعمال ہوا ہے۔ "لڑاکا" جو مرد اور عورت کے لیے برابر مستعمل ہے۔ پنجابی ڈراموں میں یا حقیقت پسند اردو ڈرامے میں "لڑاکی" عورت بن گیا ہے۔ اور لڑاکا کی تانیث "لڑاکی" قرار پائی ہے۔ "لفنگا" کا مؤنث "لفنگی" بھی مستعمل ہے، تاہم علاقائی زبانوں کی گرامر کا اردو زبان کے خدوخال کی تشکیل پر کوئی خاص اثر

نہیں پڑا۔ البتہ اردو کے معیاری قواعد کا اثر علاقائی زبانوں کی نشوونما پر بخوبی ہوا ہے۔

-----(۸)-----

جس علاقائی زبان کے محل وقوع میں اردو کا قیام پاکستان کے ساتھ وردو ہوا ہے۔ اُس نے اردو کو رابطے کی زبان بنایا ہے اور رابطے کی زبان کے حوالے سے اردو علاقائی زبان و ادب کے لیے رہنمائی کا مقام بھی حاصل کر چکی ہے۔ بین الاقوامی علمی، ادبی اور تہذیبی رویے اردو کی وساطت سے علاقائی لسانی و ادبی عظمتوں تک رسائی پاتے ہیں۔ اس ضمن میں اردو نشر و اشاعت کی زبان کے طور پر اخبارات، ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے ذریعے قارئین، سامعین اور ناظرین تک دسترس پاتی ہے۔ اس طرح اردو کا قومی زبان ہونے کا منصب مستحکم ہوا ہے اور اس کی علمی، فکری، تعلیمی اور تہذیبی توانائیوں میں باوقار انداز میں اضافہ ہوا ہے۔ گزشتہ پچاس برسوں کے دوران میں اردو قومی اور علمی زبان بن کر پاکستان میں اپنا منصب پا چکی ہے اور حکومتی کاروبار میں اس کا وجود اور اس کی کارگزاری تسلیم کی گئی ہے۔ جو مقام اردو کو پاکستان میں حاصل ہوا ہے، وہ نہ تو بھارت میں اسے حاصل ہے اور نہ بنگلہ دیش میں اسے ملا ہے۔ دنیا کے کسی بھی اردو جاننے والے ماحول میں اردو کو وہ مرتبہ حاصل نہیں ہے جو اسے پاکستان میں دستیاب ہوا ہے۔ پچاس برسوں کے دوران میں اردو ایک باصلاحیت اور باوقار زبان بن کر پاکستان میں ظاہر ہوئی ہے۔

قیام پاکستان سے قبل اردو زبان بیشتر ادب و شاعری کی زبان تھی، صحافت کی زبان تھی اور حیدر آباد دکن کی اعانت و خلوص و کوششوں سے علمی زبان کا مقام حاصل کر رہی تھی۔ یونیورسٹی کے اعلیٰ ترین مدارج میں اردو نہ صرف ذریعۂ تدریس و تعلیم تھی، بلکہ عثمانیہ یونیورسٹی نے اس زبان میں ہم عصر مغربی علوم کو بھی منتقل کرنے کی روایت کو قائم کیا تھا۔ ذریعۂ تدریس و تعلیم اور دارالترجمہ کے نثر نویسی کے اسالیب و

اصول قدیم ادبیات سے ماخوذ تھے اور پرانے مدرسوں کی عبارت آرائی اور طرزِ خطابت کی پیروی کرتے تھے۔ یہی کیفیت اردو صحافت کی تھی جہاں جملہ سازی کا انداز فارسی انشاء پردازی سے متاثر تھا۔ گزشتہ پچاس برسوں کے دوران میں اردو کے مزاج میں متعدد تبدیلیاں وقوع پذیر ہوئی ہیں اور اردو زبان، علمی وسیلے کے طور پر فارسی انشاء پردازی کے خدوخال سے بتدریج جدا ہوتے ہوئے ہم عصر انگریزی اندازِ تحریر کے زیادہ قریب آگئی ہے۔ اس عمل آوری نے اردو زبان کو آسان اور سلیس جملے کا تصور بہم پہنچایا ہے اور جملے کی ساخت میں قابلِ فہم لفظوں کی نشست و برداخت کو بنیادی اہمیت دی ہے۔ آسان لفظ، آسان ترکیب، جملہ اور خیال کی آسان ترین صورت سے جو جملہ رونما ہوا ہے وہ قیام پاکستان سے قبل کی طرزِ تحریر سے بہت مختلف ہے۔

اردو زبان کا اندازِ بیان پچاس برس پہلے واضح طور پر جذباتی تھا۔ جذبات کو بیان کرنے کی خواہش اردو جملہ سازی میں تکرار کے رویوں اور خدوخال کو نمایاں کرتی تھی۔ زیادہ سنجیدہ موضوعات کے لیے ایسی جملہ سازی، واعظانہ رنگ بھی اختیار کرتی تھی لیکن پچاس برسوں کے دوران میں جو زبان ظاہر ہوئی ہے اور جس کی حالات اور عزائم کی باہمی رشتہ بندیوں سے تشکیل ہوئی ہے، اُس نے اردو جملے کو معروضی وسیلہ کی صورت دی ہے۔ جملہ غور و فکر کی اکائی بن کر آشکار ہوا ہے۔ اس طرح علمی اعتبار سے جملے نے منطقی اور اندرونی طور پر متحرک پیرا گراف کی تشکیل کی ہے، جو علمی ضرورتوں اور مقاصد کے لیے ایک کار آمد ذریعۂ ابلاغ بن کر مقبولِ عام ہوا ہے۔ اس عمل آوری نے اردو کو عصر حاضر کی باوقار علمی زبان بنا دیا ہے اور اسے اس اعتماد سے آشنا کیا ہے جو زبانوں کے علمی منصب کے لیے انتہائی ضروری ہوتا ہے۔ اردو کے علمی زبان بن کر ظاہر ہونے سے اردو زبان کا مستقبل ظاہر ہوا ہے اور قومی زبان ایک باوقار اعتماد کے ساتھ دنیائے علم کا وسیلہ بن کر نئی ذمہ داریوں سے روشناس ہوئی ہے۔ علوم اب اردو زبان کے نئے

جملے کے ذریعے گردش افکار کا موضوع بن کر فہم و ادراک میں گزر کرنے کے قابل ہوئے ہیں۔ سائنس کے افکار بھی اس علمی زبان میں گزر کرتے ہوئے کسی نوع کی دشواری محسوس نہیں کرتے۔

گزشتہ پچاس برسوں کے دوران میں علمی زبان کی تشکیل نے اصطلاحوں، تراکیب، نثر نویسی، اور جملہ سازی کو نئے نئے الفاظ، اور نئی اصطلاحوں سے بھی مالا مال کیا ہے اور اردو کی صلاحیت اظہار میں وسعت اور افکار پر گرفت اور قدرت پانے کی خوبیوں کو آشکار کیا ہے۔ اگر اس سارے منظر کو بغور دیکھا جائے تو احساس ہوگا کہ ایک علمی زبان کے طور پر اردو عہد حاضر کی کسی غیر ملکی زبان سے برابری میں کم نہیں ہے۔ علمی زبان ہونے کا منصب برابر ترقی پذیر ہے اور پھیل رہا ہے اور علوم کا کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے جو اردو کے علمی طرز بیان کے لیے کسی قسم کی دشواری پیدا کرتا ہو۔ اردو کو علمی زبان میں بدلنے کا سارا صلہ ان کوششوں کو جاتا ہے جو گزشتہ پچاس برسوں کے دوران پاکستان میں ہوئیں اور جن کی ترویج و ترقی کے لیے افراد اور اداروں نے باہمی طور پر پرخلوص محنت کرکے اس مقام کو حاصل کیا جس نے شعر و ادب کی زبان کو علوم کی زبان بنا دیا، اُسے علمی زبان کی صلاحیت فراہم کی، اور ہر نوع کے علم کو اُس کی لسانی گرفت کے لیے آسان کر دیا۔

------(۹)-----

قیام پاکستان کے بعد اردو کے علاقائی زبانوں کے ماحول میں وارد ہونے سے کچھ اندیشے ضرور پیدا ہوئے تھے اور یہ اندیشے ایک اعتبار سے قدیم مراکز زبان کے ختم ہو جانے کا نتیجہ بھی تھے۔ ایک اندیشہ یہ بھی تھا کہ اردو زبان اپنے معیار کو علاقائی زبانوں کے محل وقوع میں کیسے برقرار اور محفوظ رکھ سکے گی۔ کہیں اُس کے اصواتی اور مکتوبی معیارات ہی تو متاثر نہیں ہوں گے اور زبان اپنے تاریخی منصب سے گر تو نہیں ہو

جائے گی۔ بعض اہل نظر کا خیال تھا کہ ایک نئی اردو رونما ہو گی جو علاقائی زبانوں سے اپنا شعور اخذ کرے گی لیکن یہ سب اندیشے اور قیاسات غلط ثابت ہوئے اور گزشتہ پچاس برسوں کے دوران میں اردو زبان نے اپنے معیارات کے لیے کسی مصالحت اور مصلحت کو قبول نہیں کیا۔ اُس کا بنیادی اصول معیارات برقرار رہا تاہم صلاحیت اظہار کے لیے تجربوں کو برابر ملحوظ رکھا گیا۔ اردو بدستور انہی معیارات کی تائید کرتی ہے جو اس کی تاریخ کا جزو ہیں۔ اردو زبان کا عصری ڈھانچہ تاریخی معیارات، اصولِ تائید و تقلید، اور پیروئ اظہار بیان کی صداقتوں پر قائم ہے۔ اس بڑے دائرہ کار میں اردو زبان کی بامقصد نشوونما اپنا ظہور پانے میں برابر کامیاب ہے تاہم اس منظرنامہ کا وہ پہلو بھی قابل ذکر ہے جہاں اردو زبان کو علاقائی زبانوں کے باہمی اثرات کے حوالے سے نہ صرف پہچاننے کی کوشش کی گئی ہے بلکہ ان اثرات سے رونما ہوتے ہوئے مزاج زبان کو ادبی طرز تحریر میں قبول بھی کیا گیا ہے۔ زبان کا ایسا پہلو ڈرامے میں دکھائی دیا ہے۔

قیام پاکستان کے ساتھ اردو بولنے والوں کے متعدد، لہجے، اردو زبان کا طرز اظہار بن کر ظاہر ہوئے، مشرقی پنجاب کے وہ اضلاع (جو دہلی کے قریب ہوتے ہوئے پنجابی اور اردو کا لسانی امتزاج پیدا کرتے تھے) ایسے کرداروں کی نشاندہی کرنے لگے جن کو حقیقت نگاری کے تتبع میں ڈرامے کی تمثیل میں شامل کیا گیا۔ بعض فلموں میں بھی ایسے ڈائیلاگ سنائے گئے جن میں اردو اور علاقائی زبان کا امتزاج نمایاں تھا۔ ریڈیو پر اس نوع کی زبان اشفاق احمد کے فیچر تلقین شاہ میں استعمال کی گئی اور عہد حال میں شاہد محمود ندیم کے فکاہیہ ڈرامے "جنجال پورہ" میں سنائی دی ہے۔ سکولوں اور کالجوں کے اسٹیج پر اور کمرشل تھیٹر میں بھی ایسی زبان کا عمل دخل بخوبی دیکھا جا سکتا ہے۔ لیکن یہ زبان اردو کا مرکزی وسیلہ اظہار بننے سے قاصر دکھائی دیتی ہے اور اس کا دائرہ صرف کامیڈی کی سطح تک ہی محدود گردانا جا سکتا ہے۔ یہ زبان فکاہی رویے کی افزائش کرتی ہے

اور ناخواندہ آبادی کے درجہ ذہانت پر پھبتی بن کر اثرانداز ہوتی ہے۔ اس لیے ایسے منفی رجحانات سے زبان کے معیاری مزاج کی نشاندہی ممکن نہیں ہو سکتی۔ ایسی زبان کا محدود دائرہ اثر ہوتا ہے اور اِسے زبان کی نشوونما میں کوئی خاص مقام بھی حاصل نہیں ہوتا۔

ان حقائق کی روشنی میں یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ گزشتہ پچاس برسوں کے دوران میں اردو زبان کا معیاری مزاج زائل نہیں ہوا۔

-----(۱۰)-----

اردو نے جہاں ایک قابل قدر علمی زبان کا منصب پایا ہے اور پاکستان میں قومی زبان کی حیثیت میں اس کی ہر دلعزیزی اور وقار میں اضافہ ہوا ہے، قومی زبان کی حیثیت سے مستحکم ہوئی ہے اور دفاتر، میڈیا اور کاروبار کی زبان بن چکی ہے وہیں اردو ایک نوعمر بین الاقوامی زبان کی طور پر بھی آشکار ہوئی ہے۔ اگر پاکستان کا قیام معرض وجود میں نہ آتا تو اردو زبان کو ایسے مراتب اور مناصب شاید کبھی حاصل نہ ہوتے۔ نوعمر بین الاقوامی زبان کے طور پر اردو دنیا کی غالباً ہر بڑی یونیورسٹی میں پڑھائی جاتی ہے۔ اس کے ادب کا چرچا ہوا ہے اور اس کے بارے میں سیمینار اور کانفرنسیں بھی منعقد ہوئی ہیں۔ ساؤتھ ایشین سٹڈیز میں اردو کا مقام مرکزی ہے اور اسے برصغیر کے اسلامی شعور کے مطالعے کے ضمن میں کسی طرح نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ اس سلسلے میں یہ امر بھی خاص کر قابل ذکر ہے کہ نوعمر بین الاقوامی زبان کے حوالے سے اردو اور مغربی زبانوں کے مابین باہمی رشتے مزید استوار اور گہرے ہوئے ہیں۔ اردو تک دسترس اور رسائی پانے کے راستے نہ صرف انگریزی زبان کی وساطت میں گزرتے ہیں بلکہ جرمن، اٹالین، جاپانی اور چینی زبانوں کی وادیوں سے بھی اردو زبان کا مافی الضمیر گزر کرتے دکھائی دیتا ہے۔ اقبال اور غالب کی آواز بین الاقوامی تہذیبی شعور کو بین الاقوامی قارئین

کی زبان میں سنائی دیتی ہے۔ اور یوں ہر نئے رویے کے ساتھ جہاں اردو بین الاقوامی حلقوں میں اپنا مافی الضمیر واشگاف کرتی ہے، وہیں ایسی عمل آوری میں اس کا نوعمر بین الاقوامی زبان کا منصب بھی وسعت اختیار کرتا ہے۔ گزشتہ پچاس برسوں کے دوران میں اردو بین الاقوامی زبانوں کی صف میں ایک باوقار انداز میں شامل ہوئی ہے جسے ایک بیش قیمت کامیابی سے منسوب کیا جا سکتا ہے۔

------(۱۱)-----

تاہم اگر پچاس برس کے عرصے پر پھیلے ہوئے اردو منظر نامے کا مشاہدہ کیا جائے تو اس حقیقت سے انکار دشوار ہوگا کہ ان پچاس برسوں میں اردو زبان کی نشوونما میں تاریخ ساز اضافہ ہوا ہے اور دفتری اردو کے لیے بھی اصطلاحوں کا ایک قابل اعتبار ذخیرہ حاصل ہوا ہے۔ سائنس کی اصطلاحیں، جدید علوم کی اصطلاحیں اور ٹکنالوجی کی اصطلاحیں بھی اردو زبان کا جزو بنی ہیں۔ اسی طرح مغربی زبانوں کے متعدد الفاظ بھی اردو زبان میں شامل ہوئے ہیں۔ نشوونما کی ایسی صورت لفظیات کے حجم کے وسیع تر ہونے سے تعلق رکھتی ہے۔ اردو نے نشوونما کے میزان میں جو مقام حاصل کیا ہے، اس نے ہمارے کلچر میں دو زبانوں کے روابط کو رونما کیا ہے جسے اردو اور انگریزی (بہ طور بین الاقوامی زبان) کے باہمی رابطے میں شناخت کیا جا سکتا ہے۔ یہ کیفیت کئی اعتبار سے قابل توجہ ہے کہ ان برسوں کے دوران میں اردو انگریزی زبان کے برابر آ کر اس کے مقابل آ چکی ہے جہاں یہ زبان، انگریزی زبان کے ساتھ ہمکلام ہو سکتی ہے یعنی ہمارے علمی کلچر کے انسان نے اردو زبان کی ترقی پذیری میں اس حد تک کامیابی اختیار کر لی ہے کہ اب وہ دونوں زبانوں کے درمیان بڑی روانی سے گزر کر سکتا ہے اور یہ مقام ایسا ہے جہاں کچھ عرصے کے بعد اردو وہ ساری ذمہ داریاں بھی پوری کر سکتی ہے جو سر دست انگریزی ادا کرتی ہے۔ اردو زبان کا ایسا دائرہ اثر جس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، انگریزی کے مقابلے میں

آبادی کے تناسب کی روشنی میں اور اعداد کے حوالے سے اکثریت میں ہے۔ اس لیے یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ اب وہ زمانہ اپنی ابتدا کر چکا ہے جب ہماری علمی اور تہذیبی زندگی دو زبانوں میں اپنی ادائیگی فکر کو نبھائے گی اور سوچ بچار، طرز تحریر اور تکلم و ادراک میں گہرائی، وسعت اور پختگی کا اضافہ ہوگا۔ ان برسوں کے دوران میں اردو زبان نے یقیناً ایک تاریخی موڑ عبور کر لیا اور ایک مستقبل کے لیے اپنے آپ کو تیار کیا ہے۔ بیسویں صدی کے آغاز میں جس امر کا اظہار اس شعر میں کیا گیا تھا کہ

گیسوئے اردو ابھی منت پذیر شانہ ہے
شمع یہ سودائی دل سوزئی پروانہ ہے

وہ امر اس صدی کے اختتام پر ایک نئے اعتماد کا احساس و شعور بن کر ظاہر ہوا ہے اور اس منظر نامے میں گزشتہ پچاس برسوں کی شامل تاریخ ساز کاوشوں کو کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ گزشتہ پچاس برسوں کی محنت و لگن ہی نے اردو کو اس مقام پر وارد کیا ہے جہاں ایک نیا زمانہ اسے خوش آمدید کہنے کو موجود ہے۔

اردو ایک زندہ زبان

حکیم محمد سعید

اردو ایک زندہ زبان ہے جس میں ارتقا کا عمل زندگی کے بدلتے ہوئے تقاضوں کی مطابقت میں مسلسل جاری ہے۔ تقسیم ملک اور قیام پاکستان کے بعد لسانی تشکیل نو کی رفتار میں نمایاں طور پر تیزی آئی ہے جس کی وجہ، پاکستان کی علاقائی زبانوں اور یہاں کی علاقائی ذیلی ثقافتوں سے اردو زبان میں ہم آہنگی پیدا کرنے کی ضرورت رہی ہے۔ زبان ہر ثقافت کا اہم ترین عنصر ہونے کے ساتھ اپنی نوعیت میں اپنے ثقافتی مزاج کی آئینہ دار بھی ہوتی ہے۔ ایسی صورت میں یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ وہ یہاں کے تہذیبی اور ثقافتی مزاج کو نظر انداز کر کے اپنی نحوی ساخت اور تراکیب و استعارات کے استعمال میں اجتہاد سے کام نہ لے۔ پاکستان میں اردو زبان کی تشکیل نو کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم پاکستان کی ثقافت کے بارے میں اپنا ذہن صاف کر لیں۔

ہمارے ہاں سر سید احمد خاں پہلے دانشور ہیں، جنھوں نے تہذیب کے موضوع پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے اس کی اہمیت کو واضح کیا ہے اور بتایا ہے کہ جب کسی علاقے میں انسانوں کا کوئی گروہ ایک ساتھ رہتا ہے تو اس کا رہن سہن، اس کے اکل و شرب، اس کی پوشاک اور نیکی بدی سے متعلق اس کے تصورات یکساں ہوتے ہیں۔ یکسانیت کی اس صورت کو ہم اس کی تہذیب کہتے ہیں۔ اس تہذیب کی تشکیل و تعمیر میں اس علاقے کے جغرافیہ اور تاریخ کا کردار بہت اہم ہوتا ہے۔ تہذیب کی اہمیت کو محسوس کر کے اس کی وضاحت کے سلسلے میں سر سید کو بلاشبہ اولیت کی

فضیلت حاصل ہے لیکن انھوں نے تہذیب اور ثقافت کے فرق کو واضح نہیں کیا اور شاید ان کے عہد میں اس فرق کو واضح کرنا ممکن بھی نہ تھا۔ اس فرق کا احساس زمانہ حال کی دریافت ہے جس میں مختلف اقوام کے درمیان بڑھتے ہوئے میل جول اور تہذیبی اقدار کے لین دین نے ایک نئی صورت پیدا کر دی ہے، اب تہذیب سے مراد شائستگی اطوار اور اخلاقی اقدار ہیں جب کہ ثقافت کسی گروہ کے علوم و فنون اور تکنیکی پیش رفت کو قرار دیا جاتا ہے اور ان دونوں جہتوں کے امتزاج کو کلچر سے تعبیر کرتے ہیں۔

پاکستان میں تہذیب و ثقافت اور اس کے کلچر کا ایک بڑا دائرہ ہے جسے پاکستان کا قومی کلچر کہنا چاہیے لیکن اس دائرے کے اندر کئی چھوٹے چھوٹے دائرے ہیں جنھیں پاکستان کے ذیلی یا علاقائی کلچر سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہ چھوٹے چھوٹے دائرے اپنی انفرادیت برقرار رکھنے کے باوجود اپنے جوہر میں پاکستان کے قومی کلچر کے بڑے دائرے سے باہر اپنا وجود نہیں رکھتے مثلاً پنجاب اور سندھ میں پوشاکوں کی تراش مختلف ہو سکتی ہے لیکن ستر پوشی کا اصول سب جگہ یکساں ہے۔ اسی طرح یہاں کے مختلف کھانے پکانے کے انداز الگ الگ ہو سکتے ہیں لیکن غذاؤں کے حرام حلال ہونے کا تصور سب جگہ یکساں ہے۔ اس طرح فروعی اختلافات کے باوجود یہاں کی تہذیب و ثقافت کے عناصر میں کوئی فرق نہیں ہے اور بنیادی عناصر کی یہ یکسانیت ہمارے مذہبی عقائد کی یکسانیت کا نتیجہ ہے۔ اردو زبان میں بہت سی تلمیحات ہماری مذہبی روایت سے ماخوذ ہیں۔ مثلاً آتش نمرود، ضرب کلیم، عیسیٰ نفس، ابن مریم، ذبح عظیم، آداب فرزندی، شق القمر وغیرہ وغیرہ۔ ہم ان تلمیحات کو اپنے قومی کلچر کا حصہ کہیں گے جبکہ ہیر رانجھا، کچا گھڑا، سسی پنوں اور سوہنی مہینوال ایسی تلمیحات ہیں جن کا تعلق ہماری علاقائی ثقافتوں سے ہے۔ جدید اردو شاعری میں ان علاقائی تلمیحات کا استعمال پاکستان کی اردو کی شناخت ہے۔ تقسیم ملک اور قیام پاکستان سے پہلے اردو شاعری میں ان

تلمیحات کا استعمال نہ ہونے کے برابر تھا لیکن اب ان تلمیحات نے خاصے بڑے پیمانے پر مقبولیت حاصل کر لی ہے۔

تلمیحات سے قطع نظر نحوی ساخت میں کچھ تبدیلیاں اور علاقائی زبانوں کے کچھ الفاظ کا اردو زبان میں استعمال پاکستان میں اردو زبان میں ارتقاء و توسیع کے عمل کو اجاگر کرتا ہے۔ مثال کے طور پر "مجھے جانا ہے" کی جگہ "میں نے جانا ہے" کا استعمال اب روزمرہ ہی میں نہیں بلکہ بہت سی علمی و ادبی تحریروں میں خاصا عام ہوتا جا رہا ہے جو ہماری زبان کی نحوی ساخت میں تبدیلی کی ایک مثال ہے۔ اسی طرح سندھی لفظ "پگار" بمعنی تنخواہ نے اردو روزمرہ کی حیثیت اختیار کر لی ہے۔ سندھی اور سرائیکی زبان کا ایک لفظ "سائیں" ہے جو "جناب یا محترم" کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ تقسیم ملک سے پہلے اردو میں یہ لفظ گداگر یا فقیر اور بھکاری کے معنی میں استعمال ہوتا تھا لیکن اب یہ لفظ اردو میں بھی معزز یا محترم کے معنی میں استعمال ہونے لگا ہے جس کا اندازہ اس امر سے ہو سکتا ہے کہ بہت سے نئے شاعر اس لفظ کو اپنی نظموں اور غزلوں میں برابر استعمال کر رہے ہیں۔ مثال کے طور پر رسا چغتائی کا یہ مطلع دیکھیے:

پاس اپنے اک جان ہے سائیں
باقی یہ دیوان ہے سائیں

اس غزل میں "سائیں" بطور ردیف استعمال ہوا ہے چنانچہ اس غزل کے ہر شعر میں موجود ہے۔ اسی طرح اور کئی شاعر ہیں جن کے ہاں سائیں کا لفظ نہایت خوبی کے ساتھ معزز اور محترم کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

علاقائی اثرات سے قطع نظر ہمارے قومی کلچر کی مطابقت میں عربی فارسی الفاظ سے تشکیل دی ہوئی بہت سی تراکیب ہماری شاعری میں نظر آتی ہیں۔ ان تراکیب کا

استعمال تقسیم ملک سے پہلے اس افراط سے کبھی نہیں ہوا بلکہ ادبی حلقوں میں ٹھیٹھ اردو کے نام سے ایسی زبان نظر آتی تھی جس میں عربی فارسی کے الفاظ کم سے کم ہوتے تھے البتہ علامہ اقبالؒ کی شاعری اس سلسلے میں استثناء کی مثال ہے۔ اب ہم روزمرہ میں بھی عربی فارسی کے الفاظ کثرت سے استعمال کرتے ہیں جن کا اندازہ ریڈیو اور ٹی وی سے نشر ہونے والی خبروں سے باسانی کیا جاسکتا ہے۔

پاکستان میں اردو زبان کی تشکیل نو کے سبب یہاں کی زبان ہندوستان کی اردو زبان سے خاصی مختلف ہوتی جارہی ہے۔ ہندوستان میں ہندی کے کچھ الفاظ اردو میں رفتہ رفتہ شامل ہورہے ہیں جس کی وجہ سے وہاں کی زبان پاکستان کی اردو زبان سے مختلف ہوتی جارہی ہے جس کا سبب وہاں کا کلچر اور اس کے تقاضے ہیں جو پاکستان کے کلچر سے مختلف ہیں۔ ہندوستان اور پاکستان میں اردو زبان میں جو تبدیلیاں آرہی ہیں ان کے پیش نظر ہم یہ بات وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ ان دونوں ملکوں میں اردو زبان کی صورت ایک دوسرے سے نمایاں طور پر الگ ہوجائے گی جو بہت بڑی حد تک دو قومی نظریہ کی حقیقت کا واضح ثبوت ہوگا۔

اردو زبان کے معیار کا مسئلہ

شان الحق حقی

یہ وقت کا ایک اہم اور غور طلب مسئلہ ہے جسے میں نے ایک بار پہلے بھی اپنے ایک مقالے میں چھیڑا تھا جو سبط حسن مرحوم کے رسالے "اردو ادب" میں چھپا تھا اور میرے دوسرے مجموعۂ مضامین "نقد و نگارش" میں بھی شامل تھا۔ میں نے مسئلے کا انجام نہیں کیا تھا، نہ کر سکتا تھا، صرف اس کے خدوخال واضح کیے تھے۔

خلاصہ:

زبان انسان کا وسیلہ اظہار ہے جس کے بغیر متمدن زندگی کا تصور ممکن نہیں۔ ہم اسے قانون سے لے کر ادب تک ہر قسم کے نازک مطالب کے اظہار کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ اس کے قواعد، لغات و محاورات کا معیاری ہونا شرط ہے۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ زبان کوئی جامد شے نہیں۔ ہر جیتی جاگتی، پھلتی پھولتی شے کی طرح اس میں بھی افزایش و نمو کا عمل ہوتا رہتا ہے۔ ہر دور میں نئی نسل کی زبان بڑے بوڑھوں کی زبان سے تھوڑی بہت مختلف ہوتی ہے۔ پھر زندگی کا قدم جتنا تیز ہوگا، یہ تغیر اتنا ہی نمایاں ہوگا۔ اگرچہ ہمارے بزرگوں کو عیار اور ٹکسال پر بڑا اصرار رہا اور سند کے لیے اگلوں ہی کی طرف دیکھا جاتا رہا۔ پھر بھی فصاحت کا معیار دور بہ دور بدلتا رہا ہے۔ اصولاً شاعری کی زبان نثر کی نسبت سست رو اور قدیم تر ہوتی ہے۔ اس کے باوجود پیچھے پلٹ کر دیکھیے تو میر و مرزا کی زبان وہ نہیں تھی جو ذوق و غالب کی زبان تھی اور پھر حالی، شبلی، اقبال اور ان کے ہم عصروں کی زبان اور بھی مختلف ہو گئی۔ اس سے

آگے تو اتنے نئے اثرات پڑے کہ اگلے لوگ سنیں تو ہماری بات شاید بالکل نہ سمجھ سکیں۔

اب سوال یہ ہے کہ معیار کیوں کر متعین ہوتا ہے۔ شہنشاہی یا جاگیردار معاشرے میں کلام الملوک کو افصح الکلام مانا گیا تھا۔ یہ سچ بھی ہے کہ دربار ہی ثقافت کا مرکز ہوتا تھا۔ انگریزی میں بھی فصیح زبان کے لیے "کنگز انگلش" کی اصطلاح مقرر رہی۔ دلی میں واقعتہً لال قلعے والوں کی زبان عوام الناس کے لیے قابل سند تھی۔ ان کی خراب و خستہ آل اولاد میں بھی جن کو دیکھا ان کی بول چال کو کھرا پایا۔ خود ذوق کی زبان فصاحت میں بہادر شاہ کی زبان کو نہیں پہنچتی۔ ذوق کے ہاں محاورہ بندی قدم قدم پر چونکاتی بلکہ کھٹکتی ہے۔ شعر میں محاورے باندھنا اور زبان دانی کی دھاک بٹھانا ظفر کا مذاق فصاحت نہ تھا۔ میں نے ان کی ضخیم کلیات کے بہت سے خس و خاشاک میں سے (جس میں ذوق کے عطیات بھی شامل ہیں) ایک دیوان کے بقدر ایسا کلام برآمد کیا ہے، جو نہ صرف اپنے مطالب اور واردات کے لحاظ سے بلکہ لہجے اور انداز گفتار کے لحاظ سے بھی کسی اور شاعر سے نسبت نہیں رکھتا۔ دیکھیے ہنگامہ ۱۸۵۷ء کی پیش گوئی کس طرح کرتے ہیں کہ ترغیب اقدام نہیں تو ایک وجدانی پیش گوئی ضروری تھی:

کشتہ قامت جتنے ہیں اس کے آپس میں سب مل جل کر

کر دیں اگر اک حشر بپا، کیا اچھا ہو، کیا اچھا ہو!

(دیوانِ چہارم)

لطف یہ کہ قدم تغزل سے باہر نہیں۔ اس صدی سے پہلے تک اگرچہ ہمارے اساتذہ گرد و پیش کے احوال سے چنداں بے خبر نہ تھے اور متاثر ہونا بھی لازمی تھا، لیکن اس طرح کے تمام کلام پر تغزل کا پردہ پڑا ہوا ہے۔ میں نے اس مسئلے پر اپنے ایک اور

مقالے میں بحث کی ہے (غزل کا سفر سعدی سے اقبال تک) غزل کو یہ نیا موڑ اقبال نے دیا کہ سیاسی مطالب پر سے تغزل کا پردہ اٹھا دیا:

مغرب ز تو بے گانہ مشرق ہمہ افسانہ
وقت است کہ در عالم نقش دگر انگیزی
آنکس کہ بہ سر دارد سودائے جہانگیری
تسکین جنونش کن با نشتر چنگیزی

اب ہماری جدید غزل اکثر و بیش تر رومانی یا عاشقانہ مضامین سے خالی ہوتی ہے تو یہ اقبال کا پرتو ہے۔ پچھلے ادوار میں سیاست کا سب سے گہرا پرتو ظفر کے کلام میں ملتا ہے۔ کہیں کہیں تو پردہ بھی اٹھ گیا ہے یا یوں ہی سارہ گیا ہے:

اعتبار صبر و طاقت خاک میں رکھوں ظفر
فوج ہندوستان نے کب ساتھ ٹیپو کا دیا

(دیوان چہارم)

ذکر معیار فصاحت کا تھا تو ظفر کا اصل لہجہ اپنے تمام معاصرین سے مختلف اور منفرد ہے:

رونا میرا پوچھتے کیا ہو، آنکھ سے آنسو بہنے دو
مجھ کو تصور اور بندھا ہے، ایک ذرا چپ رہنے دو

خوب دیکھا، خوب ڈھونڈا کچھ نظر آیا نہیں
آج تک اپنے میں ہم نے آپ کو پایا نہیں

چشم ظاہر بیں سے تو دیکھا نہیں جاتا اسے
تم نے بھی اے دل کی آنکھو اس کو دکھلایا نہیں

بلا سے گرچہ ہوتا راز دل افشا ہے رونے میں
نہ روکو مجھ کو رونے سے، مزا آتا ہے رونے میں

اٹھارویں صدی سے انیسویں صدی تک پھیلے ہوئے جوانی سے بڑھاپے تک کے اس کلام میں صرف سوز ہی نہیں، چہچہے بھی بہت ہیں اور وہ بھی اپنی جگہ بے مثل ہیں:

ہوا ہو ابر و گل ہو پھر تو چہلیں ہوں تماشا ہو
نشے میں رشک گل ہو پھر تو چہلیں ہوں تماشا ہو

اور کہیں دونوں کی عجیب و غریب آمیزش:

کیا رنگ دکھاتی ہے ہر چشم تر او ہو ہو
خون جگر آہاہا، لخت جگر او ہوہو!

گویا ایک مجذوب کی تصویر کھینچ دی ہے۔ سب سے کھرا روزمرہ ظفر کے ہاں ملتا ہے جو محض محاورہ بندی سے گراں بار نہیں:

ہمیں ہر بات پر دیتے ہو صاحب گالیاں اوہو
تصدق اس زباں کے تم بھی یہ سیکھے زباں اوہو

مرا کہنا کہ کیا عالم ہے تجھ پر ، واہ وا صدقے

اور ان کا ناز سے ہنس ہنس کے یہ کہنا کہ ہاں ، اوہو !

یہ ایک ضمنی تذکرہ تھا دور شہنشاہی میں "شاہی زبان" کا۔ ہر جمے جمائے معاشرے میں زبان کی ایک معیاری بولی ہوتی ہے اور کئی فروعی یا تحتی بولیاں جو اس کے ارد گرد بستی ہیں۔ زبانوں کی ایک کھڑی تقسیم ہوتی ہے اور ایک پڑی تقسیم۔ ڈایلیکٹ پڑی یا افقی تقسیم میں آتے ہیں۔ کھڑی یا عمودی تقسیم طبقہ واری ہوتی ہے۔ مختلف انسانی گروہ اپنے اپنے پیشے، ماحول اور مذاق یا ثقافتی پس منظر کے مطابق مختلف لسانی رجحانات رکھتے ہیں۔ حساس کان نہ صرف مقامی لہجے اور محاورے کو پہچان لیتے ہیں بلکہ مختلف پیشوں، حرفوں، طبقوں، محلوں، گھرانوں تک کی بولی کو تاڑ لیتے ہیں۔ دلی میں لوگوں کے کان بتا دیتے تھے کہ یہ لہجہ جامع مسجد کے آس پاس کا نہیں، حویلی حسام الدین حیدر کا ہے۔ یا یہ لفظ تو مسلمانوں کے منہ کا نہیں، تیل کے کڑے میں کسی ہندو لالہ کی زبان سے سنا جا سکتا تھا۔

(مثلاً : بندگی (آداب عرض)؛ گونا (رخصتی)؛ بھاتیا (سمدھی)؛ بچلنا (بچھڑنا)؛ پریوار (کنبہ)؛ سوڑھ (زچگی)؛ گونگلو (شلغم)؛ ماتا سیتلا (چیچک)؛ پانڈ (عمر سے ڈھلی سن یاس کو پہنچی ہوئی عورت) یہ الفاظ ہندوؤں سے مخصوص تھے)۔

خیر وہ بساط الٹ چکی۔ اب ایک نئی دنیا ہے اور اس کے نئے تقاضے۔ معیار کی ضرورت تسلیم لیکن تلفظ کے ان اختلافات کو اہمیت دینا بے جا ہوگا جو فطری مخارج سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس سلسلے میں ش ق اتنا اہم نہیں جتنا املا و انشا۔ شین قاف میں نے محاورۃً کہا۔ تفصیلاً کہا جائے تو ث، ذ، ص، ض، ط، ظ، ع، ق کہنا چاہیے۔ ان میں سے کتنی اصوات کو ہم اصل عربی مخارج کے مطابق ادا کرتے ہیں یا کر سکتے ہیں؟ لیکن املا میں

ان کا برقرار رہنا ضروری ہے، ورنہ الفاظ کی شکل ہی بدل جائے گی اور شناخت دشوار ہو جائے گی۔ ہم الفاظ کو اسی طرح پہچانتے ہیں، جیسے اشخاص کو ان کے چہرے مہرے سے۔ ان کے ہجے نہیں کرتے۔ اسی لیے انگریزی میں تبدیلیِ املا کی کوئی تحریک نہ چلنے پائی، حالانکہ انگریزی املا حد سے زیادہ بے قاعدہ ہے جس میں کسی حرف خصوصاً واول کی کوئی قیمت ہی متعین نہیں۔

جب اردو کی ایک جامع لغت کی تدوین کا آغاز ہوا تو ترقی اردو بورڈ (حال اردو ڈکشنری بورڈ) کے سامنے لازماً معیار کا مسئلہ بھی آیا۔ نیز یہ کہ اردو زبان کے حدودِ اربعہ کیا ہیں۔ کیا اردو ہے اور کیا اردو نہیں۔ اس مسئلے پر میں نے ایک اور مضمون میں بحث کی تھی (اردو زبان کے حدود اربعہ مطبوعہ طلوع افکار کراچی جنوری ۹۱ء)۔ اردو کے لکھنے اور برتنے والوں میں ہر طبقے اور خطے کے لوگ شامل ہیں۔

ایک طرف مسلمان علما نے ہر فارسی عربی لفظ کو اپنا مال سمجھ کر برتا ہے، تو دوسری طرف ہندومت، ہندوانی علوم اور متعلقہ موضوعات پر معتد بہ لٹریچر ایسا ہے جو زیادہ تر اردو خواں ہندوؤں کے مطالعے کے لیے لکھا گیا، اور اس میں شدھ سنسکرت اصطلاحیں لازماً فراوانی سے برتی گئی ہیں۔ ان کو سن کر عام پڑھے لکھے اردو داں کہہ اٹھتے ہیں کہ یہ لفظ تو اردو نہیں لگتا۔ مراد یہ ہے کہ اردو ایک وسیع زبان ہے جس کے حدود اربعہ کا تعین آسان نہیں۔ انگریزی الفاظ برتنے کی روش بھی اب بڑھتی ہی جارہی ہے۔ ان میں کیا اردو ہے اور کیا نہیں؟

اب تک مذکورہ لغت کی ۱۶ جلدیں چھپ چکی ہیں۔ ہر جلد بڑی تقطیع کے ہزار صفحات پر مشتمل ہے۔ کیا یہ لغت اردو کا معیار متعین کرتی ہے؟ کیا یہی وہ ٹکسال ہو گی جس کی معیار کے سلسلے میں تلاش ہے؟ یہ ان معنی میں کوئی دستور الفصاحت مہیا نہیں کرتی کہ معنی، تلفظ یا محاورے پر حتمیت کی مہر لگائے۔ مرتبین لغات واضعین لغات

نہیں ہوتے۔ یہ تاریخی اصول پر مدون کی گئی ہے اور اسے اردو زبان کے ارتقا اور عہد بہ عہد لسانی تبدیلیوں کا ایک ریکارڈ یا دستاویز کہہ سکتے ہیں۔ اس میں تمام دکھنی لغات بھی سما گئے ہیں اور جدید تر تبدیلیوں اور اضافوں کو بھی سمیٹنے کی کوشش کی گئی ہے۔ بورڈ کے سامنے سوال یہ تھا کہ معیار کیا ٹھہرایا جائے۔ سند کے لیے کون سے ماخذ سے رجوع کریں۔ ان ماخذ کا دائرہ کتنا وسیع یا کتنا محدود ہو۔ خالص پسندوں کا ایک گروہ وہ بھی تھا جو یہ سمجھتا تھا کہ سند صرف مستند اساتذہ یا اہل زبان کی تحریروں سے لینی چاہیے۔ لیکن ظاہر ہے کہ اس طرح لغت بہت محدود ہو کر رہ جاتی۔ طے ہوا کہ مانے ہوئے اہل قلم کو شامل کیا جائے خواہ کہیں کے ہوں۔ دوسری طرف ایسے بھی اصحاب تھے جو کہتے تھے کہ تم نے ہمیں سے سند لی تو کیا لی، ہم تو خود جاننا چاہتے ہیں کہ کیا صحیح ہے اور کیا غلط۔ بالآخر دائرہ استناد کو وسیع سے وسیع تر کر دیا گیا بلکہ حال حال میں تو ضرورت سے زیادہ ہی ڈھیل دے دی گئی ہے۔ اس طرح ادارۂ لغت نے تو مسئلے کو اپنے لیے آسان کر لیا۔ یعنی یہ لفظ فلاں مصنف کے ہاں ملتا ہے جو فلاں مقام سے تعلق رکھتا ہے، اب آپ اس پر جتنا بھی اعتبار کریں لیکن معیار کا مسئلہ اپنی جگہ موجود ہے۔

عموماً طبقہ اعلیٰ کی زبان کو مستند سمجھا جاتا ہے۔ لیکن یہ بھی ایک دل چسپ حقیقت ہے کہ معیار اوپر سے مسلط نہیں ہوتا، نیچے سے ابھر کر آتا ہے۔

البتہ طبقہ اعلیٰ معیار کا پاسبان بن جاتا ہے۔ روما کی عوامی زبان جسے LOW LATIN کہتے تھے، بالآخر ٹکسالی زبان بن گئی۔ لوجرمن نے اولڈ ہائی جرمن کو بے دخل کر دیا۔ جرمینک اور رومانس گروپ کی سب زبانیں بازاری بولیاں تھیں جو اب علمی ادبی زبانیں ہیں۔ جنوبی ایشیا میں بھی پراکرتوں نے سنسکرت کو گوشہ گیر کر دیا تھا۔ یہ ضرور ہے کہ جدید زبانوں نے اپنی نشوونما اور ذہنی ارتقا کے سلسلے میں کلاسیکی زبانوں سے بھرپور استفادہ کیا اور آج تک کر رہی ہیں۔ اردو نے بھی کئی طرح سے استفادہ کیا

ہے۔ کئی متمول گھرانوں کی میراث پائی ہے۔

سمائی نہ اس پریم بانی کی پوچھو

بھرے ہیں یہاں چار سمتوں سے دریا

اس کی ساخت ہی میں اکتساب کی بھرپور صلاحیت موجود تھی۔ اس کا دائرہ اصوات عربی، فارسی، ہندی، انگریزی سب سے زیادہ وسیع ہے۔ تفریس، تعریب وغیرہ کی طرح تارید کی ضرورت نہیں۔ عربی میں پ، چ، گ وغیرہ کا پتہ نہیں۔ فارسی میں ٹ، ڈ، وغیرہ کا، انگریزی میں ت اور د تک نہیں جس کے بغیر ہم ایک جملہ بھی شاید نہیں بول سکتے۔ اپنے عام الفاظ اور نام تک نہیں لکھ سکتے، اور پھر بھی یہ ہم پر راج کر رہی ہیں۔ "خان" کو "کھان" بلکہ "کان" اور "سید" کو "شیڈ" ہی لکھ سکتے ہیں۔ ہائیہ صوتیے جن سے اردو نے بڑے کام لیے، ان دوسری زبانوں میں نہیں۔ میں نے دو چشمی ھ پر ایک الگ مضمون میں بحث کی ہے ("دو چشمی ھ کی کرشمہ کاریاں")۔ اردو کی دوسری اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ترکیب و تالیف دونوں موجود ہیں۔ جملے کی بنیادی ساخت اس طرح کی ہے کہ بیرونی الفاظ بہ آسانی کھپتے چلے جاتے ہیں۔ آپ عربی یا انگریزی میں اس طرح اردو رکھ کر نہیں بول سکتے، جس طرح اردو میں انگریزی رکھ کر بے تکلف بول دیتے ہیں۔ اس سہولت کی بنا پر یہ رجحان بڑھتا ہی چلا جا رہا ہے۔ اس میں فائدہ بھی ہے اور نقصان بھی کہ اپنے چلتے چلاتے اچھے خاصے الفاظ بے موت مر رہے ہیں۔ لہٰذا اعتدال شرط ہے۔ یہ بھی وہی معیار کا مسئلہ ہے کہ حد کون اور کیوں کر مقرر کرے۔

جیسا کہ عرض کیا زبان نیچے سے بن کر ابھرتی ہے۔ عربی، فارسی، سنسکرت الفاظ میں جو تصرفات ہوئے ان کے بانی علما یا پنڈت نہیں ہو سکتے تھے۔ یہ عوام ہی تھے۔

جنھوں نے سُوال کو سَوال اور اکال کو کال بنایا۔ ایسے تصرفات کی تعداد سینکڑوں (صحیح سیکڑوں) سے گزر کر ہزاروں تک ہے۔ لیکن آخر انھیں خواص نے بھی قبول کر لیا۔ عربی کا مقولہ ہے "غلط العام فصیح" چنانچہ زبان کی تشکیل میں خواص سے زیادہ عوام کا دخل ہوتا ہے۔ پھر بھی کسی ایک وقت میں معیار وہی ٹھہرتا ہے جو خواص کا چلن ہو۔ خواص میں صرف دولت مند شمار نہیں ہوتے ورنہ بنیوں اور سیٹھوں کی بولی معیاری ٹھہرتی۔ اہل اقتدار جو دربار سے منسلک ہوتے وہی کلچر سے زیادہ لگاؤ رکھتے تھے، ادیبوں، عالموں کی صحبت اٹھاتے، اور ادیبوں عالموں سے زیادہ ذی اثر ہوتے تھے۔ میرے خیال میں جہاں کہیں دو حصہ اقتدار، ایک حصہ دولت اور ایک حصہ علمیت جمع ہو جاتے ہیں ٹکسال کے لیے فضا ساز گار ہو جاتی ہے۔

ہم ایک جمہوری نظام میں رہتے ہیں یا کم از کم جمہوری اصول کو تسلیم کرتے ہیں۔ مگر یہ طبقاتی تقسیم سے خالی نہیں۔ ہمارا ذی اثر طبقۂ اعلیٰ کئی طرح کی زبانیں بولتا ہے، اور اردو کی نسبت انگریزی سے زیادہ مانوس ہے۔ بری اردو کی نسبت بری انگریزی زیادہ شرم کی بات سمجھی جاتی ہے۔ یہ صورت ایک عرصۂ دراز سے قائم ہے اور عجیب یہ ہے کہ آزادی کے بعد سے یہ رجحان اور بھی روز افزوں ہے۔ ہمارے سیاسی اکابرین نے اس وقت بھی ٹوٹی پھوٹی اردو میں تقریر کرنے کا ایک ایسا انداز قائم کر دیا تھا کہ اس کے بعد سے ایسی اٹکتی کھٹکتی تقریر زیادہ نہیں چونکاتی جیسی کہ پنڈت جواہر لال نہرو یا قائد اعظم جناحؒ کرتے تھے۔ یہی لوگ جب انگریزی میں تقریر کرتے تو خطابت کی شان کچھ اور ہوتی تھی۔ یہ ان کا اپنا جوہر تھا جو انگریزی میں رنگ پر آتا تھا۔ عین اسی طرح جیسے ہمارے بے شمار ریسرچ اسکالروں کے علمی کارنامے انگریزی کے پلے میں جاتے رہے ہیں۔ ان مجبوریوں کے باوجود جتنا بھی علمی سرمایہ اردو نے پیدا کیا خاصا جرأت انگیز ہے۔

اوپر اردو کی تین بنیادی خصوصیات کا ذکر آیا جو اس کی ترقی کی ضامن رہی ہیں اور ہیں۔ وسیع صوتیات اور ترکیب نحوی جو ایک آغوش کشادہ کی حیثیت رکھتی ہے اور بیرونی الفاظ کو آسانی سے سما لیتی ہے، بلکہ مرکبات، محاورات، صفات و فجائیہ کلمات بلکہ فقروں کو بھی۔ اس میں نئے مصادر ڈھالنے کی صلاحیت بھی موجود ہے۔ امدادی افعال کرنا، ہونا وغیرہ کے ساتھ لاتعداد مرکب مصادر بھی بن سکتے ہیں۔ یہ عمل عربی، فارسی، انگریزی میں اتنا آسان نہیں جن کے مادے اور مصادر لگے بندھے ہیں، عہد بہ عہد ان ہی کے معنی میں کشادگی پیدا کی جاتی رہی، اور ایک لفظ کے بہت سے معنی ہو گئے۔

ہم چاہیں تو نامہ، آنا، وانا، پانا، لاحقوں سے بہتیرے نئے مصدر بنا سکتے ہیں۔ جیسے برقانا، قلمانا، وصولنا، قبولنا، بخشنا، نوازنا، انگیزنا وغیرہ جو سب وصفی صورتیں ہیں۔ اس سے پہلے اردو نے اور بھی ڈھیروں مصادر وضع کیے تھے۔ بدلنا، بخشنا، شرمانا، گرمانا، خریدنا، تراشنا، ورغلانا، گزرنا، گزارنا، گردانا ----- مگر پھر یہ سلسلہ سست پڑ گیا۔ عربی، فارسی، ترکی، ہندی کو ملا کر بہت سے گنگا جمنی مرکبات و محاورات بھی بنائے گئے۔ کھٹکے دار، منہ در منہ، دھینگا مشتی، کٹ حجتی، غل غپاڑا، دھڑے بندی، گرانڈیل، البتہ، فوق البھڑک، بے فکرا، دیدارو، چال باز، میل خورا، نیک چلنی، دماغ چوٹنٹا پن، مختلف طرح کی چند مثالیں ہیں۔ اسی طرح انگریزی کو اردوانا بھی شروع کر دیا گیا تھا سیکڑوں یورپی الفاظ ہیں کہ بالکل اردو ہو گئے ہیں۔ بکس، دراز، الماری، بم، کارتوس، بالٹی، چابی، فراش، بین، گھاس، لیٹ، کف، کالر، چھینٹ، رفل، فیس، لنکاٹ، کنستر، گیٹس، بکلس، بٹن، مسمریزم، افسر، اردلی حتیٰ کہ بوریت اور جھاپلزم جیسی اختراعات بھی۔

پھر اس میں سابقوں، لاحقوں کی تعداد غالباً ہر زبان سے زیادہ ہے۔ انگریزی میں گنے چنے سابقے، لاحقے ہیں جو اس نے یونانی یا لاطینی سے مستعار لیے ہیں۔ اردو میں ان

کی گنتی آسان نہیں۔ اس نے عربی، فارسی، ترکی، ہندی وغیرہ کے ڈھیروں سابقے لاحقے اپنا لیے ہیں۔ ترکی "چی" سے کتنے ہی لفظ بنا لیے گئے، "ڈفالچی" ترکستان سے نہیں آیا تھا۔ چی کی تانیث "چن" بھی بنالی گئی۔ نفی کے لیے کتنے ہی لاحقے اور سابقے موجود ہیں۔ جب تک زبان کی اختراعی صلاحیتیں کام کرتی رہیں، یہ اپنی ضروریات کے مطابق الفاظ کے ڈھیر لگاتی رہی۔ پھر اس کے پر باندھ دیے گئے۔ دراصل اختراع اور اصطلاح سازی میں عوام کا مجموعی جینیس جو کمال دکھاتا ہے، کوئی اصطلاح ساز کمیٹی اس کو نہیں پہنچ سکتی۔ Inoculation کے لیے کمیٹی بہت سے بہت عربی لفظ "جدرین" کو اپنا لے گی یا اس سے جدرین کاری بنا لے گی۔ عوام نے ٹیکا بنایا اور چلا دیا۔

یوں تو اردو ضرورت کے تقاضے سے چل رہی ہے اور آپ اپنے بل پر زندہ ہے۔ انگریزی کی طرح ملکوں ملکوں بولی جا رہی ہے لیکن معیاری انگریزی کا بھرم قائم ہے۔ تھوڑا بہت مقامی فرق جو امریکی، کینیڈین، آسٹریلیائی انگریزی کے درمیان ہے زیادہ نمایاں نہیں۔ کچھ عرصے سے برصغیر کی انگریزی کا ذکر بھی سننے میں آتا ہے مگر اسے مبتذل ہی خیال کیا جاتا ہے، نہ کہ معیاری۔ سوال یہ ہے کہ آئندہ معیاری اردو کا پیمانہ کیا ہوگا، اور اس معیار کا پشت پناہ کون ہوگا۔ یہاں ایک بڑا سا استفہامیہ مقدر ہے جو اہل الرائے کو دعوت دیتا ہے۔

پاکستانی اردو کا حقیقی تناظر

ڈاکٹر رحیم بخش شاہین

زبان قدرت کا ایک بہت بڑا مظہر ہے۔ انسانی زندگی اور زبان لازم و ملزوم ہیں۔ ہر زبان اپنے اندر توسیع و ترقی کے بے شمار امکانات رکھتی ہے۔ زمانی و مکانی احوال کے تغیر و تبدل سے یہ امکانات منصۂ شہود پر آتے رہتے ہیں۔ زبانوں کے اندر جو تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں وہ غیر محسوس طریقے سے اور مختلف مراحل میں مکمل ہوتی ہیں اور یہ اتنی متنوع ہوتی ہیں کہ ان سب کو گرفت میں لانا تقریباً ناممکن ہوتا ہے۔

مولوی سید احمد دہلوی نے تقریباً ایک سو سال قبل فرہنگ آصفیہ مرتب کی اور اس کے دیباچے میں انھوں نے زبان میں واقع ہونے والی تبدیلیوں اور ان کی وجوہ کو بڑے دلچسپ انداز میں پیش کیا۔ اب اگرچہ لسانیات کا شعبۂ علمی بہت ترقی کر گیا ہے لیکن مولف فرہنگ آصفیہ کے بلیغ اشارے اپنی اہمیت رکھتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ کوئی ملک ہو اس میں دو طرح کی زبان اور دو طرح کے الفاظ تو ہوں گے۔ بعض میں صرف لہجے کا فرق ہوگا اور بعض میں اصلیت کا۔ ایک گنواروں کی بولی ہوگی اور دوسری شہری لوگوں کی۔ بارہ بارہ کوس کے فاصلے پر زبان بدل جاتی ہے مگر خاص شہروں میں بھی دو طرح کی زبان ہوتی ہے ایک عام لوگوں کی اور دوسری خاص لوگوں کی جسے شعراء یا فصحا کی زبان کہتے ہیں۔ شعراء کی زبان میں بھی اختلاف ہے کوئی عام محاورے پسند کرتا ہے اور کوئی خاص۔ جیسے ذوق اور غالب۔ پھر شہروں میں بھی فرق ہے۔ وہ شہر جسے دارالحکومت ہونے کا شرف حاصل ہے، دوسرے شہروں کی نسبت وہاں کے لوگوں

کی زبان زیادہ شائستہ اور عمدہ خیال کی جائے گی۔

مؤلف فرہنگ آصفیہ کی بحث کا حاصل یہ ہے کہ زبان کوئی جامد قسم کی چیز نہیں بلکہ انسانی زندگی کے ساتھ ساتھ ہر دم اور ہر لحظہ منقلب و تغیر رہنے والی چیز ہے، اس کا کسی ایک حال پر رہنا اس کی خوبی نہیں بلکہ اس کے اندر موجود تنوع اور متغیر ہی اس کی ترقی و توسیع کی صلاحیت کا باعث ہے۔

اردو زبان کی کیفیت بھی ایسی ہی ہے۔ اردو کے آغاز سے لے کر آج تک نظم و نثر میں جو کچھ لکھا گیا ہے، وہ اصول تغیر و تبدل کی صداقت کی گواہی دیتا ہے۔ اردو کے ارتقا کے جملہ ادوار میں اس زبان کے جو نمونے سامنے آتے ہیں، ان کے سرسری جائزے سے بھی یہ ثابت ہوتا ہے کہ اردو زبان کبھی یکساں نہیں رہی بلکہ ہر مرحلے اور ہر دور میں اس کے مزاج اور شکل و صورت میں تبدیلی ہوتی رہی ہے۔ یہ تبدیلی زمان و مکان کے فرق کے علاوہ تہذیبی و ثقافتی ماحول کی تبدیلی کے نتیجے میں وقوع پذیر ہوتی رہی ہے۔

اردو کو سینکڑوں سال سے ایک ایسی معاشرت کے زیر اثر پروان چڑھنے کا موقع ملا جو مسلمان اور ہندو اقوام کے باہمی اشتراک و تعاون سے وجود میں آئی تھی تاہم اس معاشرت میں دونوں قوموں کے امتیازی رنگ بھی ہمیشہ موجود رہے۔ یہی وجہ ہے کہ دونوں قومیں اگرچہ اردو بولتی تھیں لیکن اس اشتراک میں بھی فرق و اختلاف موجود رہا۔ صورت یہ تھی کہ اردو زبان کا ایک سانچہ وہ تھا جو دانشور طبقے میں مستعمل تھا اور دوسرا وہ جو عوام میں رائج تھا۔ پھر ایک اردو زبان وہ تھی جو مسلمانوں میں مروج تھی اور دوسری وہ جو ہندوؤں میں بولی اور سمجھی جاتی تھی۔ گویا اس زمانے میں مخصوص مذہبی، معاشرتی اور تہذیبی حوالوں سے اردو زبان کی مختلف شکلیں رائج تھیں۔ پھر شہری اور دیہاتی اور آبادی کے دیگر طبقوں اور گروہوں میں بھی اردو زبان کے مختلف روپ نظر آتے تھے۔

لیکن یہ فرق و اختلاف اردو زبان کے لیے مضر نہیں تھا بلکہ مفید تھا کیونکہ اس سے زبان کی ہمہ گیری اور اس کی وسعت پذیری کا اثبات ہوتا ہے۔ جو زبان کسی مخصوص خطے، طبقے یا گروہ کے لیے کار آمد ہو اور دیگر علاقوں اور گروہوں کے کام نہ آسکے بہت جلد موت کے گھاٹ اتر جاتی ہے یا کم از کم اپنی ترقی کی استعداد سے محروم ہو جاتی ہے۔

اس اصولی بحث کے بعد مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ قیام پاکستان اس صدی کا ایک عظیم الشان اور تاریخ ساز واقعہ ہے۔ اس کے پس منظر میں جو عوامل کارفرما تھے ان میں ایک زبان کا مسئلہ بھی تھا۔ غلط یا صحیح طور پر ہندوؤں کے ایک مؤثر طبقے کے نزدیک اردو مسلمانوں کی زبان تھی، اس لیے یہ طبقہ اس زبان کو برداشت کرنے پر آمادہ نہ تھا۔ اس نے مختلف اوقات میں مختلف اقدامات سے اپنے اس تعصب کا بھرپور مظاہرہ کیا جس نے مسلمانوں کو مستقبل کی سیاسی و اجتماعی صورت حال کو سمجھنے کے قابل بنایا اور اس طرح تحریک پاکستان کو کامیابی سے ہمکنار کرنے میں اردو زبان کا حصہ کچھ کم نہیں سمجھا گیا۔ بہر حال قیام پاکستان کے بعد اردو زبان کو جو ماحول میسر آیا، اس میں اگرچہ بعض وجوہ کی بنا پر اس کے لیے مشکلات موجود تھیں تاہم یہ ماحول مجموعی طور پر بھارت کی نسبت زیادہ موافق تھا اور ہے۔ یہاں مسلم تہذیب و ثقافت کا غلبہ اس کے لیے یقیناً مفید ہے اور پاکستانی زبانوں کے رنگ اور ان کی خوشبو سے اثر پذیری کے مواقع بھی بہت زیادہ ہیں۔

اردو زبان کے آغاز و ارتقا کے سلسلے میں جو نظریے قائم ہوتے ہیں، ان کے حوالے سے پاکستان کے مختلف علاقوں کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ یہاں سے اردو زبان کا خمیر اٹھا اور اس کو نشوونما کے بہترین مواقع حاصل ہوئے۔ اس لیے قدرتی طور پر اس خطے کی زبانیں اردو کی معاون ثابت ہوئیں اور دوطرفہ لین دین سے نہ صرف ان زبانوں کو ترقی کرنے کا موقع ملا بلکہ ان کے اثرات سے اردو زبان کو بھی پھلنے پھولنے کا موقع ملا۔

میرا خیال ہے کہ اگر پاکستان وجود میں نہ آتا تو صرف اردو کو یہ نقصان پہنچتا کہ وہ دہلی اور لکھنؤ کے دائرے سے شاید باہر نہ نکل پاتی اور دوسری زبانوں کے سامنے اس کا تکشف (Exposure) اس بھرپور طریقے سے نہ ہو پاتا جس طریقے سے قیام پاکستان کے بعد ممکن ہوا۔

یہاں اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ آج اردو کو صرف مقامی زبانیں ہی متاثر نہیں کر رہیں بلکہ برصغیر سے باہر کی زبانیں خصوصاً انگریزی بڑی تیزی سے اردو پر اثر انداز ہو رہی ہے۔ قیام پاکستان سے قبل اگرچہ اردو میں انگریزی الفاظ کی آمیزش ہو رہی تھی لیکن وہ اتنی نمایاں نہیں تھی جتنی کہ اب ہے۔ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ ابھی تک انگریزی زبان بولنے والے ممالک کے حلقۂ اثر میں ہیں۔ پہلے ہم براہ راست برطانیہ کے ماتحت تھے لیکن اب ہم امریکا کے اثرات کی زد میں ہیں۔ ہمارا ملک امریکا اور یورپ کی تجارتی منڈی ہے اور اس پر طرہّ یہ کہ علم و تعلیم کے میدان میں بھی ان ممالک کے اثرات روزافزوں ہیں۔ ان حالات میں بعض اوقات محسوس ہوتا ہے کہ اردو کی پسپائی یقینی ہے لیکن اردو کی بے پناہ صلاحیتوں کے پیش نظر اردو کے مستقبل کے بارے میں مایوسی کی کوئی وجہ نہیں بلکہ یہ امر باعث اطمینان ہے کہ اردو بحیثیت زبان ترقی کر رہی ہے اور اس کے اثرات بتدریج پھیل رہے ہیں۔

مقامی زبانوں، بولیوں اور انگریزی وغیرہ کے میل جول سے اردو کی جو صورت بنی ہے وہ اپنی اصل کے اعتبار سے تو وہی ہے جو پہلے تھی لیکن اب اس کے خدوخال میں فرق آ رہا ہے۔ اس بنا پر اس کو پاکستانی اردو کا نام دیا جا سکتا ہے۔ جس طرح کسی زمانے میں ہندوستانی فارسی، ایرانی فارسی سے مختلف خدوخال کی حامل تھی اور اہل ایران کے اعتراض کے باوجود ہندوستانی فارسی اپنے انداز سے ترقی کرتی رہی اور جس طرح امریکی انگریزی، برطانوی انگریزی سے الگ اپنی حیثیت رکھتی ہے اسی طرح پاکستان

میں نشوونما پانے والی اردو بھارتی اردو سے جدا نظر آتی ہے۔ وہ اردو جو دکن میں پھلی پھولی، پھر دہلی اور لکھنؤ میں پروان چڑھی اور ۱۸۵۷ء کے بعد مختلف ریاستوں اور خطوں کے اثرات سمیٹتی ہوئی ایک معیاری زبان کی حیثیت سے برصغیر میں رائج ہوئی، ۱۹۴۷ء کے بعد ایک ایسے مرحلے میں قدم رکھ چکی ہے جو اس کے لیے توسیع و ترقی کے ان گنت امکانات لیے ہوئے ہے۔

اردو کا دوسری زبانوں سے تعامل قدیم زمانے سے جاری ہے اور یہی چیز اردو زبان کی ترقی کا ذریعہ ہے۔ عصر حاضر کی مخصوص سفری اور اطلاعاتی سہولتوں کی بدولت اردو زبان جس کثرت، شدت اور سرعت سے دوسری زبانوں کا اثر لے رہی ہے اور ان کو متاثر کر رہی ہے، اس کی مثال ماضی میں نہیں ملتی اور اس صورت حال کو دیکھتے ہوئے یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مستقبل میں اردو میں زبردست تغیر آنے والا ہے۔ یہ تغیر ابھی محدود اور بڑی حد تک سطحی ہے، زبان کے بالائی پرت پر نظر آتا ہے لیکن امتداد وقت کے ساتھ ساتھ اس امر کا امکان ہے کہ زبان کی اندرونی ساخت بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہے گی۔

ان وجوہ کی بنا پر مجھے ممتاز ماہر لسانیات ڈاکٹر عطش درانی کی اس رائے سے اتفاق ہے کہ پاکستانی اردو کلاسیکی اردو سے بوجوہ ممتاز، جدا اور منفرد ہو چکی ہے اور بنابریں ہمیں صورت حال کو اس کے اصل تناظر میں دیکھنے اور سمجھنے کی کوشش کرنا چاہیے تاکہ پاکستانی اردو کو ہر پہلو سے مؤثر اور معیاری بنایا جا سکے اور اس کے خدوخال کو لائق رشک بنایا جا سکے نیز اس کی ترقی کی راہ ہموار کی جا سکے۔

زبانوں میں جو تبدیلیاں آتی ہیں، وہ دو سطح پر ہوتی ہیں ایک عوامی سطح پر اور دوسری شعری و ادبی سطح پر۔ عوام کا اصل مسئلہ زبان کا حُسن نہیں اپنی بات کا ابلاغ ہوتا ہے جبکہ شعراء ادبا زبان کو فنکارانہ انداز سے برتنا چاہتے ہیں وہ الفاظ کے لغوی یا

عوامی معنی پر انحصار نہیں کرتے بلکہ ان کی معنویت میں اضافہ کرتے ہیں اور اس طرح اپنے جذبات و خیالات کے اظہار کا مؤثر ذریعہ بنانے کی سعی کرتے ہیں لیکن وہ جب کسی لفظ کو اپنے انداز سے استعمال کرتے ہیں تو اس کی اصلیت کو نظرانداز نہیں کرتے۔ عوامی سطح پر زبان پر تبدیلی کی کوئی شعوری اور ارادی کوشش نہیں ہوتی جبکہ شعراء و ادباء اس کے لیے شعوری اور ارادی کوشش کرتے ہیں لیکن اگر یہ کوشش منظم اور منضبط نہ ہو تو اس امر کا اندیشہ رہتا ہے کہ زبان اپنی ابلاغی قوت و صلاحیت برقرار نہیں رکھ سکے گی۔

ڈاکٹر عطش درانی نے اردو کے پاکستانی روپ کی جو مثالیں دی ہیں ان کا بغور مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اردو زبان میں تبدیلی واقع ہو رہی ہے اور قیام پاکستان سے قبل اور بعد کی اردو زبان میں فرق نمایاں ہے۔ یہ درست ہے کہ اب عربی کی بجائے فارسی لاحقوں کا استعمال بڑھ رہا ہے لیکن اس سے کہیں زیادہ مقدار میں دیگر زبانوں خصوصاً انگریزی کے الفاظ و اصطلاحات اردو میں داخل ہو رہے ہیں کسی زمانے میں مولوی وحیدالدین سلیم اور بعض دیگر بزرگوں نے جس انگریزی آمیز اردو کا مذاق اڑایا تھا وہ آج ہمارا روزمرہ بنتی جارہی ہے۔ اس زبان کی تشکیل میں عوام کا حصہ بھی ہے اور خواص کا بھی۔ عوام انگریزی الفاظ کو کسی اصول اور قاعدے کے بغیر محض سہولت کے لیے استعمال کر رہے ہیں۔ لسانی تغیر میں عوامی کوششوں کا مطالعہ بہت دلچسپ ہے۔ "تھڑا" دیسی لفظ ہے اور "ٹیکس" انگریزی دونوں کو ملا کر تھڑا ٹیکس بنا لیا گیا ہے یعنی وہ ٹیکس جو دکان کے آگے چبوترے پر بیٹھ کر کاروبار کرنے والے پر عائد کیا جاتا ہے۔ جگا ٹیکس، غنڈہ ٹیکس اور بھینس ٹیکس وغیرہ بھی اس قبیل کی تراکیب ہیں۔ اسی طرح ایک لفظ "سٹینڈ" ہے اس کے ساتھ ٹانگہ وغیرہ ملا کر ٹانگہ سٹینڈ وغیرہ تراکیب وضع ہو چکی ہیں۔ قبضہ گروپ، عید کارڈ، مچھلی فارم اور لاری اڈہ وغیرہ بھی اسی نوع کی تراکیب

ہیں۔ مغرب سے آنے والے الفاظ میں "مافیا" کا لفظ بھی شامل ہے اب یہ لفظ اردو یا مقامی زبانوں کے الفاظ کے ساتھ مل کر نئی نئی تراکیب وجود میں لا رہا ہے مثلاً ہمارے ہاں "بوٹی" کا لفظ نقل کے معنوں میں بھی مستعمل ہے۔ امتحان میں نقل کرنے یا کرانے والے منظم گروہ کو بوٹی مافیا کا نام دیا گیا ہے۔

پاکستانی اردو کے خدوخال جاننے کے لیے شاعری کا مطالعہ بھی بہت نتیجہ خیز ہے۔ ہماری شاعری نہ صرف موضوعات کے اعتبار سے بھارتی شاعری سے ممتاز ہے بلکہ زبان و بیان کے اعتبار سے بھی انفرادیت کی حامل ہے۔

اس پہلو سے جن لوگوں نے اردو کا تشخص ابھارنے کی سعی کی ہے ان میں شیر افضل جعفری کا نام خصوصیت سے قابل ذکر ہے۔ انہوں نے جھنگ کے طبعی و انسانی ماحول کو اپنی شاعری کی پہچان بنایا ہے۔ اگر اسی انداز سے ہماری اردو شاعری میں ملی تاریخ، تہذیبی میراث، اس خطۂ ارضی کے جغرافیائی خصائص منتقل ہونا شروع ہو جائیں تو پاکستانی اردو کی امتیازی خصوصیات زیادہ سرعت سے ابھر کر سامنے آئیں گی۔ ہو سکتا ہے کہ یہ کہا جائے کہ اس طرح اردو زبان ایک خطے میں محدود ہو کر رہ جائے گی لیکن میرا خیال ہے کہ اردو کا پاکستانی روپ اپنی ہمہ گیری کی بنا پر اردو زبان کی بے پناہ استعداد اور اس کی توسیع و ترقی کے لامحدود امکانات کو بروئے کار لانے کا باعث بنے گا۔

ہمارے نئے اہل قلم انگریزی الفاظ کو جس بے تکلفی سے استعمال کر رہے ہیں اس سے اردو زبان پر انگریزی اثرات کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ بعض اوقات تو کہانی میں انگریزی الفاظ استعمال کرنے کی ضرورت ہوتی ہے مثلاً کسی مغرب زدہ کردار یا کسی وکیل اور پروفیسر وغیرہ کی بات چیت میں انگریزی الفاظ، محاورے یا جملے کا استعمال فطری ہے لیکن اگر کہانی لکھنے والا بھی اس روش کا مظاہرہ کرے تو اس کی کوئی توجیہہ اس کے سوا نہیں کی جا سکتی کہ کہانی کار اپنی زبان خود تشکیل دے رہا ہے۔ ذیل میں

شاہدہ ناز قاضی کی کہانی "ڈکیت کی منکوحہ" کے چند جملے درج کیے جاتے ہیں جن میں دونوں طرح کی مثالیں نظر آئیں گی:

"ہمارا ارادہ کسی اور بڑے شہر میں شفٹ ہونے کا ہے اور پھر ایاز اپنا کوئی بزنس شروع کرنا چاہتے ہیں ---- اسکول میں کوئی ہاسٹل نہیں تھا------ نئی جگہ شفٹ ہونے کا خیال ----- آخر کینٹ سے ملحق ایک صاف ستھرے علاقے میں ----- اسے دو کمروں کا فلیٹ مل گیا"۔

"ہاتھوں میں پرس لیے وہ سیڑھیوں سے اتری تو اس وقت وہ اپنا اسکوٹر اسٹارٹ کر رہا تھا"۔

"بہن مائنڈ نہ کرنا----- یہ کوئی وقت نہیں کسی کو ڈسٹرب کرنے کا---"

(اردو ڈائجسٹ، جنوری ۱۹۹۶ء)

پرانے لفظوں کو نئے معنوں میں استعمال کرنے کا رجحان بھی زبان کی ترقی اور اس کی پاکستانی شناخت کا باعث بن رہا ہے۔ کسی زمانے میں نشے کے لیے بھنگ استعمال ہوتی تھی اور اس کو استعمال کرنے والے بھنگ کی جگہ بوٹی کا لفظ استعمال کرتے تھے لیکن آج کل یہ لفظ نقل کے معنوں میں بھی مستعمل ہے جیسا کہ قبل ازیں ذکر کیا گیا۔ اسی طرح اب بھنگ یا افیم کا استعمال بہت کم ہو گیا ہے اور اس کی جگہ چرس اور ہیروئن نے لے لی ہے۔ چرس یا ہیروئن کے عادی لوگوں کے لیے مستعمل پرانے الفاظ کو نئے معنی بھی دیے جا رہے ہیں۔ جیسے جہاز، راکٹ، پوڈری وغیرہ۔ زبان کے اندر یہ تبدیلیاں ہیں جو عوامی سطح پر خود بخود ہو رہی ہیں ان میں کوئی شعوری اور منظم کوشش کارفرما نہیں۔ ان تبدیلیوں کا احاطہ ممکن نہیں البتہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اگر اس کثرت اور تیزی سے یہ تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں تو وہ دن دور نہیں کہ جب موجود

اردو زبان ہر پہلو سے پرانی اردو سے واضح طور پر ممتاز ہو جائے گی۔

اردو کے اسلوبیاتی مزاج میں ایک بڑا تغیر دوسری پاکستانی زبانوں کے اہل قلم کا مرہون منت ہے۔ یہ لوگ جب اردو میں لکھتے ہیں تو اپنے علاقے کی لسانی بُو باس اردو میں منتقل کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور جب ان زبانوں میں لکھنے والوں کی تحریروں کو اردو میں پیش کیا جاتا ہے تو متعلقہ زبانوں کے الفاظ و محاورات وغیرہ بھی اردو میں داخل ہو جاتے ہیں۔ بعض اوقات کسی کہانی کا کوئی کردار جب اردو میں گفتگو کرتا دکھایا جاتا ہے تو اس کی زبان کو حقیقت کا رنگ دینے کے لیے متعلقہ علاقے کے الفاظ و محاورات سے آمیز کر کے پیش کیا جاتا ہے، یہ وہ حقائق ہیں جو ہمارے نثری ادب خصوصاً افسانہ و ناول میں عام طور پر مشاہدہ میں آتے ہیں۔ اس لیے ان کی مثال دینے کی ضرورت نہیں۔

پاکستانی اردو کے خدوخال

پروفیسر نیاز عرفان

زبان اور علاقے کا آپس میں گہرا تعلق ہوتا ہے۔ جغرافیائی ماحول آب و ہوا اور خوراک سے نہ صرف انسان کی جسمانی ساخت، قدوقامت اور رنگ و روپ میں تبدیلی رونما ہوتی ہے بلکہ ان کا اثر انسان کے اعضائے نطق کی ساخت اور اس کے نتیجے میں لب و لہجے پر بھی پڑتا ہے۔[1] اور یوں زبانیں اور بولیاں وجود میں آتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مثال کے طور پر لاہور میں "ز" کو "ڑ" اور "ڑ" کو "ر"، بنگال میں "ج" کو "ز" پڑھا جاتا ہے۔

پاکستان ایسے علاقوں پر مشتمل ہے جن کا جغرافیائی ماحول، آب و ہوا اور خوراک بھارت کے ماورائے جمنا علاقوں سے قطعی مختلف ہے۔ اس لیے یہ ایک فطری عمل ہے کہ ان علاقوں کے باشندوں کی جسمانی ساخت، قد و قامت اور رنگ و روپ اور پھر ان کا لب و لہجہ بھی دوسرے علاقوں سے قدرے مختلف ہوگا۔ جغرافیائی ماحول اور آب و ہوا میں یہ فرق دلی اور لکھنؤ کی اردو میں بھی موجود تھا۔

پاکستان کی قومی زبان اردو ہے لیکن اس کے کسی علاقے کی مادری زبان اردو نہیں ہے۔ اردو پاکستان کی اس آبادی کی مادری زبان ہے جو بھارت کے اُن علاقوں سے ہجرت کر کے آئے ہیں جہاں مادری زبان اردو تھی اور اب وہاں بھی حکومتی کوششوں سے آہستہ آہستہ ہندی مادری زبان کی حیثیت اختیار کرتی جا رہی ہے۔

تحقیق سے یہ بات ثابت ہو گئی ہے کہ اگر کسی پھل دار درخت کو اس کے اصل

وطن کی بجائے کسی دوسرے علاقے میں بویا جائے جہاں کی آب و ہوا مختلف ہو تو اس سے پیدا ہونے والے پھلوں کے رنگ، ذائقے او تاثیر میں فرق واقع ہو جاتا ہے۔ بالکل یہی بات زبان کے بارے میں بھی سچ ہے کہ اگر یہ کسی دوسرے ملک میں منتقل ہو تو اس میں کئی تبدیلیاں واقع ہو جاتی ہیں۔ مثلاً انگریزی زبان کو لیجیے۔ امریکا، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ اور کینیڈا کی انگریزی انگلستانی انگریزی سے اور آپس میں ایک دوسرے سے بھی مختلف ہے۔ یہ جغرافیائی ماحول کے فرق کا نتیجہ ہے۔ یہی حال اردو کا ہے۔

جغرافیائی حالات کے زیر اثر پاکستانی اردو دو طرح سے تغیر و تبدل کے عمل سے گزر رہی ہے: اولاً پاکستان میں صوبائی اور علاقائی زبانوں کے الفاظ اردو زبان کے ذخیرۂ الفاظ کا حصہ بننے لگے ہیں۔ ثانیاً وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان لوگوں کے لب و لہجے میں بھی تبدیلیاں واقع ہونا شروع ہو گئی ہیں جو اردو بولتے ہوئے آتے تھے۔ خصوصاً ان کی نئی نسلوں کے اردو ذخیرۂ الفاظ، لب و لہجے، محاوروں، استعاروں، تشبیہوں اور تلمیحوں کے لحاظ سے ان کی زبان اُن کے آباؤاجداد کی زبان سے قطعی مختلف ہو گئی ہے۔

قبل از قیام پاکستان تو معیاری یا ٹکسالی اُردو کا مرکز کوئی اور تھا لیکن اب پاکستان میں معیاری اردو کسی اور مرکز سے منسلک و ملحق ہو گی۔ یہاں پاکستانی اردو تیزی کے ساتھ ارتقائی مراحل طے کر رہی ہے۔ اس لیے بعض ثقہ قسم کے اہل علم کا بعض پرانے تصورات پر اصرار مناسب نہیں۔ مثال کے طور پر انگریزی الفاظ Station, State, School وغیرہ کو بہ اضافہ ا، اسکول، اسٹیٹ، اور اسٹیشن بولنے اور لکھنے پر اصرار اور سکول، سٹیٹ اور سٹیشن لکھنے اور بولنے کو غلط قرار دینا بلاجواز ہوگا۔ کیونکہ ستون کی طرح "ستون" اور "سکون" کو تو "استون" یا "اسکون" نہیں لکھا جاتا۔ خیر یہ تو جملہ معترضہ ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ ہر زبان اپنے ذخیرے، روزمرے، محاورے، لہجے، تلفظ، معنی اور املا کے لحاظ سے ترقی کرتی رہتی ہے اور ہر آن اصول بھی ادلتے بدلتے

رہتے ہیں۔ تاہم جہاں تک معیار کا تعلق ہے، اسے خواص عوام، سلینگ یا کسی خاص طبقے کے معیار پر استوار نہیں کیا جا سکتا۔ بطور استدلال کہا جا سکتا ہے کہ اگرچہ لاہور کے باشندے "ر" کو "ڑ" اور "ڑ" کو "ر" بولتے ہیں۔ (لطیفے کے طور پر کہا جاتا ہے کہ ایک اندرون لاہور کا باشندہ "چڑیا پھر سے اڑ گئی" کو "چریا پھڑ سے اُر گئی" بولے گا) لیکن اس کے تلفظ کو معیاری تلفظ نہیں مانا جائے گا اور اس کا یہ اصرار کہ باقی لوگ بھی اسی تلفظ کو اختیار کریں نامناسب ہوگا۔ اسی طرح ہمارے طبقہ خواص کی انگریزی آمیز اردو (اینگرڈو) یا اُردِش (اردو + اِنگلش) کسی طور پر بھی معیاری اردو قرار نہیں پاتی۔ پاکستانی اردو میں اردو زبان کی گرامر کے بعض قاعدے بھی تغیر پذیر ہیں۔ مثلاً قیام پاکستان سے قبل اور بعد میں بھی یہ قاعدہ تھا کہ عربی اور فارسی زبانوں کے اردو میں مستعمل الفاظ کو اضافت یا عطف کے ذریعے کسی غیر عربی یا غیر فارسی الفاظ کے ساتھ نہیں ملانا چاہیے۔ ایسا کرنے کو غلط اور غیر معیاری قرار دیا جاتا تھا۔ مثلاً "آوازِ ڈھول"، "قربِ سٹیشن"، "سوچ و بچار" جیسے مرکب الفاظ یا اصطلاحات کو غلط سمجھا جاتا تھا۔ مگر آج کی پاکستانی اردو کی تراکیب کا بیشتر حصہ کچھ اسی قسم کا ہے۔

اس کی دلیل یہ ہے کہ اردو زبان کے الفاظ اور اجزائے اصطلاحات کا منبع و ماخذ خواہ کوئی زبان ہو جب وہ اردو زبان کے ذخیرۂ الفاظ میں شامل ہو گئے تو ان پر اُردو زبان کی گرامر کے اصول یکساں طور پر لاگو ہوں گے۔ اوپر دی گئی مثالوں میں آواز اور ڈھول دونوں اردو زبان کے الفاظ ہیں لہذا ہم انہیں اضافت کے ساتھ ملا سکتے ہیں۔ اسی طرح قرب اور سٹیشن دونوں اردو زبان کے ذخیرۂ الفاظ کا حصہ ہیں۔ اس لیے ان کو اضافت کے ساتھ جوڑنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ جب کسی ہندو یا عیسائی کے حلقہ اسلام میں داخل ہونے کے بعد امتیاز ختم ہو جاتا ہے اور اس کے دوسرے مسلمانوں سے رشتے ناطے میں کوئی ممانعت یا رکاوٹ نہیں ہوتی تو پھر ہندی یا انگریزی زبان سے اردو کے

ذخیرۂ الفاظ میں شامل ہونے والے الفاظ کے خلاف امتیازی سلوک کیوں؟

اردو کے صوبائی زبانوں سے رابطے سے اردو زبان کی آبیاری ہونا شروع ہو گئی ہے اور یہ بجا ہے کہ ۱۹۷۱ء کے بعد یہ تبدیلی بہت تیزی سے آئی ہے۔ علاقائی اور صوبائی زبانوں کے بعض الفاظ نے جو بعض صورتوں میں تلفظ کے لحاظ سے آسان تر بھی ہوتے ہیں بعض اردو الفاظ کی جگہ لے لی ہے اور اردو میں مستعمل ہو چکے ہیں۔ مثلاً "بھٹہ" کی بجائے "چھلی"، "ممانی" کی بجائے "مامی"، چھاچھ کی بجائے "لسی" عام استعمال ہو رہے ہیں۔ ایسے بہت سے الفاظ کو محض "عوامی" یا "سلینگ" سمجھ کر اردو میں واقع ہونے والی اس تبدیلی کو رد نہیں کیا جا سکتا۔

پاکستانی اردو میں بعض ضمائر کے استعمال میں تبدیلی آ رہی ہے مثلاً جہاں پہلے "مجھے اٹھنا ہے" بولا جاتا تھا، اب "میں نے اٹھنا ہے" بولا جانے لگا ہے۔ اسی طرح "مجھے سونا ہے" کی بجائے "میں نے سونا ہے" بولا جانے لگا ہے۔ یوں بھی "مجھے اٹھنا ہے"، "مجھے سونا ہے" میں ضمیر کی مفعولی حالت ظاہر ہوتی ہے۔ حالانکہ فاعلی حالت صحیح ہے۔

اردو کے بہی خواہوں کو پاکستان میں واقع ہونے والی ان تبدیلیوں کو خوش دلی سے قبول کرنا چاہیے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ زبانوں میں تبدیلیاں ہونا ناگزیر امر ہے۔ یہ ہر زبان میں ہوتی رہتی ہیں۔ دو سو سال پہلے کی انگریزی یا اردو زبان موجودہ انگریزی اور اردو سے بالکل مختلف ہیں۔ آئندہ بھی ایسا ہوتا رہے گا۔

ثبات اک تغیر کو ہے زمانے میں

تاہم ایک بات طے ہے کہ فی الوقت کسی ایک بات کے اصول کو معیار تصور کرنا یا معیار کی تلاش ذرا مشکل کام ہوگا اور اگر ایسا ہو بھی تو ہمیں بول چال، ادب اور علم

کی زبان کے لیے الگ الگ معیار تلاش کرنے ہوں گے کیونکہ ایک اصول جو بول چال کی اردو میں صحیح ہوگا، ادبی اردو میں اسے شاید ہی مانا جائے اور اسی طرح ادبی زبان علمی مسائل بیان کرنے کے لیے غیر موزوں رہے گی۔ اب وقت آ گیا ہے کہ ہم اردو کے کم از کم ان تین پہلوؤں سے ان پاکستانی قومی زبان کے اصول تلاش کریں اور اس کے لیے دقتِ نظر، توجہ اور محنت سے بلا کسی رو رعایت کے ساتھ کام کریں۔ یقیناً ہم اپنی منزل پالیں گے۔

آزادی کے ۴۹ برس اور قومی زبان اردو

خلیق الرحمن سیفی

دنیا کا کوئی ملک ایسا نہیں ہے جس کی اپنی زبان نہ ہو۔ بیشتر ممالک اپنے ہاں تمام تر دفتری کارروائی قومی زبان میں ہی انجام دے کر فخر محسوس کرتے ہیں۔ متعدد ممالک نے صرف اور صرف اپنی قومی زبان ہی کو اپنا کر ترقی حاصل کی ہے۔ انھوں نے اس امر کو غلط ثابت کر دکھایا ہے کہ انگریزی زبان ہی دنیا کی واحد زبان ہے جس کے بغیر ترقی ناممکن ہے۔ پاکستان کو آزادی حاصل کیے ۴۹ برس بیت رہے ہیں لیکن یہاں پر ابھی تک قومی زبان اردو کو وہ مقام حاصل نہیں ہو سکا جو ہونا چاہیے تھا۔ ماضی میں حکمران اس امر کا اعلان کرتے رہے ہیں کہ قومی زبان کو جلد اس کا اصل مقام دیا جائے گا خصوصاً تمام سرکاری دفاتر میں خط و کتابت قومی زبان اردو ہی میں کی جائے گی لیکن صد افسوس کہ قومی زبان سرکاری سطح پر آج بھی اجنبی زبان سمجھی جاتی ہے حالانکہ اب دنیا کے متعدد ممالک میں اردو زبان کو فروغ دینے کے لیے کام ہو رہا ہے۔ اس سلسلے میں ماہنامہ "اخبار اردو" اسلام آباد میں اردو کے روسی پروفیسر ڈاکٹر وی جی فلیمونوف کا ایک انٹرویو شائع ہوا ہے جس میں انھوں نے بعض باتیں ایسی بھی کہی ہیں جو بالکل درست ہیں اور ان پر ہمیں خود ندامت کا اظہار کرنے میں کوئی عار محسوس نہیں کرنا چاہیے۔ انھوں نے اپنے انٹرویو میں بتایا ہے کہ روس میں اردو زبان کے فروغ کے لیے تین ادارے کام کر رہے ہیں۔ ان سے یہ سوال کیا گیا کہ کیا انگریزی کے بغیر کوئی ملک ترقی کر سکتا ہے؟ انھوں نے جواباً کہا کہ ہم روسی لوگ تو انگریزی کے بغیر ہی زندہ ہیں۔ عرب لوگ بھی انگریزی کے بغیر اپنی زبانوں میں ترقی کر رہے ہیں۔ لوگ دیگر زبانوں

کے ذریعے ترقی کر رہے ہیں۔ انھوں نے ایک سوال کے جواب میں کہا کہ میں پاکستان پہلی بار آیا ہوں۔ میں پاکستان میں جہاں بھی گیا ہوں دیکھا کہ لوگ اردو بولتے اور سمجھتے ہیں۔ ٹی وی، ریڈیو پر بھی اردو کا استعمال ہے۔ صدر مملکت بھی اردو بولتے ہیں اور وزیراعظم پاکستان بھی اردو میں گفتگو کرتی ہیں۔ سب لوگ اردو بولتے ہیں مگر مجھے حیرت ہوتی ہے کہ پھر یہاں انگریزی کا استعمال کیوں زیادہ ہے بعض لوگ اس طرح کی اردو بولتے ہیں کہ آپ سمجھ نہیں سکتے کہ یہ انگریزی ہے یا اردو، یعنی وہ بہت زیادہ انگریزی الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ حیرت ہوتی ہے کہ کیا یہ اردو ہے؟ اردو کے لیے تو آپ ہی کو کام کرنا ہے۔ کوئی اور یہ کام نہیں کرے گا۔ یہ حقیقت ہے کہ ہمارے ہاں اردو گفتگو کے دوران میں لاتعداد الفاظ انگریزی ہی کے استعمال کیے جاتے ہیں اور یوں خود کو اردو میں انگریزی دان ثابت کرنے کی ہی نہیں بلکہ دوسروں پر دبدبہ قائم کرنے کی جسارت کی جاتی ہے حالانکہ جو انگریزی الفاظ اردو کی گفتگو کے دوران میں استعمال کیے جاتے ہیں وہ اردو زبان میں بھی ہوتے ہیں لیکن ۴۹ برس بیت جانے کے باوجود ہم پر انگریزی ہی کا بھوت سوار ہے۔ سرکاری دفاتر میں زیادہ تر خط کتابت فرنگی زبان انگریزی میں ہی کی جاتی ہے۔ افسران مسلوں پر نوٹ بھی انگریزی زبان میں تحریر کر کے انگریزی سے اب تک اپنی وفاداری کا دم بھرتے چلے آ رہے ہیں لیکن کہلاتے خود کو پاکستانی ہی ہیں۔ اپنی زبان رکھتے ہوئے بھی وہ غیر کی زبان بولنے اور لکھنے سے گریز نہیں کرتے۔ ہمارے ملک کی اکثریتی آبادی انگریزی سے نا آشنا ہے جس کی وجہ سے اس کثیر آبادی کو دفتری امور کے سلسلے میں مشکلات کے علاوہ ذہنی کوفت کا بھی سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ملکی سطح پر قومی زبان اردو مکمل طور پر رائج نہ ہونے سے ملکی مفادات کو نقصان پہنچ رہا ہے۔ ہم اب غلام نہیں ہیں۔ ہمیں آزادی حاصل کیے ہوئے ۴۹ برس ہو چکے ہیں۔ یہ مدت کوئی معمولی نہیں ہے لیکن اس کے باوجود ہم اپنے وطن میں قومی زبان اردو کو مکمل طور پر رائج نہیں کر سکے حالانکہ اندرون ملک اب تک تمام دفتری

کارروائی قومی زبان اردو میں ہونی چاہیے تھی۔ خصوصاً ہر طرح کے فارم، سرٹیفکیٹ، بجلی، گیس، پانی، ٹیلی فون کے بل بھی اردو زبان میں جاری ہونے چاہئیں تاکہ ہمیں احساس ہو کہ ہماری قومی زبان اردو ہے۔ بانیٔ پاکستان حضرت قائداعظمؒ کے اس فرمان کو بھی حکمرانوں نے فراموش کر رکھا ہے کہ پاکستان کی اگر کوئی سرکاری اور قومی زبان ہوگی تو وہ صرف اور صرف اردو ہوگی۔ اگلے سال وطن عزیز میں قیام پاکستان کی گولڈن جوبلی تقریبات منائی جانے والی ہیں۔ اس موقع پر موجودہ حکومت اگر قومی زبان اردو کو اس کا اصل مقام دلانے کا اعلان کر دے اور عملی طور پر سرکاری سطح پر ہر کام قومی زبان اردو ہی میں کرنے کی پابندی عائد کر دے تو بلاشبہ گولڈن جوبلی کی تقریبات پر پاکستانی قوم کی خوشیاں دوبالا ہو جائیں گی۔

اردو زبان پر مقامی اثرات

محمد اسلم کھوکھر

پاکستانی اردو کے حوالے سے سلسلہ نگارشات کا آغاز ہزاروں پاکستانیوں کے دل کی آواز ہے، جسے اب تک اکا دکا تحریروں میں اجاگر تو کیا جاتا رہا لیکن ایک مقالے کی صورت میں اب پہلی بار اس کے بعض پہلوؤں کی طرف مبسوط انداز میں توجہ دلائی گئی ہے۔ حقیقت بھی یہی ہے کہ پاکستان میں اردو واحد بین العلاقائی زبان ہے لیکن یہ صرف رابطے ہی کی زبان نہیں، قومی تشخص، یکجہتی اور قومی ثقافت کی پہچان کے حوالے سے بھی اپنا مقام رکھتی ہے اور ظاہر ہے کہ اس حوالے سے اسے پاکستانی ثقافت اور کلچر ہی کا مظہر ہونا چاہیے، یہی چیز پاکستانی اردو کے الگ انداز کو بنیاد عطا کرتی ہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی نے ایک جگہ لکھا تھا:

> "پاکستان کی اردو وہ ہو گی، جسے مقامی روزمرے، مقامی قاعدے، مقامی تذکیر تانیث اور مقامی معاشرتی زندگی کا عکاس ہونا پڑے گا۔ نئی لسانی تشکیلات کا مسئلہ تنہا زبان کا مسئلہ نہیں، اردو زبان، اردو کلچر، علاقائی کلچر، قومی زبان اور قومی کلچر، ملی تشخص اور ملی کلچر۔ زبان اور کلچر کے یہ تانے بانے ہمیں ایک بار پھر تہذیبی اقدار کی طرف لے جاتے ہیں۔"

حقیقت بھی یہی ہے اور عملاً بھی ایسی ہی صورت حال پیدا ہوئی ہے۔ علاقائیت اور عالمی اثرات نے اردو زبان کو پاکستان میں نئی سمت عطا کی ہے۔ اسماء کی حد تک دوسری زبانوں سے دخل تو سبھی زبانوں میں جاری رہتا ہے اس سے نئی زبان نہیں بنتی لیکن فعل، مصدر اور دیگر ایسے لہجے، آداب اور روزمروں، محاوروں میں تبدیلی سے

یقیناً زبان کا کینڈا بدل جاتا ہے۔ علاقائی زبانوں کے اثرات کے بارے میں ڈاکٹر فرمان فتحپوری نے ایک تفصیلی مضمون میں لکھا تھا۔ اس میں انھوں نے بجا طور پر کہا تھا:

"علاقائی زبانوں کا حلقۂ اثر بڑھ رہا ہے۔ ان کے ذخیرہ الفاظ، موضوعات، اسالیب بیاں سب پر اردو کا اثر بہت نمایاں نظر آ رہا ہے۔ اردو پر بھی علاقائی زبانوں کے اثرات پوری طرح رونما ہو رہے ہیں اس کے اسلوب اور لب و لہجہ میں خاصی تبدیلی آچکی ہے۔"

اس کے لیے انھوں نے بھی بعض مثالیں دی تھیں۔ ان کے بتائے ہوئے ان جملوں میں "دادا گیری، پھڈا، کھلا، بازو، خلاص، چلتا ہے" ایسے الفاظ اردو میں پہلے موجود نہ تھے اور یہ نہ سلینگ تھے۔ بول چال میں نئے معنی بھی سامنے آئے جیسے:

۱۔ جلد بازی کی ضرورت نہیں ہے، "تسلی سے کام کرو"۔

۲۔ "آرام آرام سے چلو" ورنہ ٹھوکر کھاؤ گے۔

۳۔ میرا دوست آج کل فلاں جگہ "کمشنر لگا ہوا ہے"۔

۴۔ سیاست میں "سب چلتا ہے"۔

۵۔ کاغذ کے بیوپاری نے کہا "مال خلاص ہو گیا"۔

اصل بات یہ ہے کہ صوبوں میں چونکہ پنجاب سے بڑا صوبہ ہے اور اردو کے زیادہ تر لکھنے والے بھی پنجاب ہی سے تعلق رکھتے ہیں جو لاشعوری طور پر اپنا روزمرہ اپنی زبان کے حوالے سے شامل کر لیتے ہیں۔ مولوی صلاح الدین احمد نے تو اس بات کا اظہار بھی کیا تھا "اردو پنجاب کی بیٹی ہے مگر اب یہ بیوہ ہو کر واپس اپنے میکے آ گئی ہے"۔ حقیقت یہ ہے کہ اردو کسی ایک علاقے کی زبان نہیں۔ اسی طرح اب سندھی

الفاظ "سائیں، اڈا" وغیرہ اردو کا جزو بنتے چلے جا رہے ہیں۔ پشتو سے "جرگہ ہوا، ہم خوامخواہ جائے گا" جیسے جملے سننے میں آتے ہیں۔ اس لیے پاکستان میں علاقائی اثرات کا پڑنا تو لازم تھا۔ جیسا کہ ہم نے ابھی کہا ہے کہ بعض علاقوں میں یہ زبان پروان چڑھی اور بعض میں جیسے جیسے تعلیم عام ہوتی جائے گی، یہ آگے بڑھتی جائے گی اور ان علاقوں کے الفاظ اور روزمرے از خود اس میں شامل ہوتے جائیں گے۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے بجا طور پر اردو کو دریائے سندھ سے تشبیہ دی تھی اور اسے نشیبی گزرگاہ کہا تھا۔ جس میں جملہ علاقائی زبانیں طوعاً کرہاً شامل ہوتی جائیں گی۔ چنانچہ آج ہم واقعتاً اردو "بولنے والے" نہیں "استعمال کرنے والے" کی اصطلاح میں بات کرنے پر مجبور ہیں۔ مختار زمن نے کہیں لکھا تھا کہ "اردو دان طبقہ اگر ایسے لوگوں پر مشتمل ہے، جن کی مادری زبان اردو ہے یا جن کے گھروں میں اردو بولی جاتی ہے تو پھر ان کا یہ عندیہ بہت کمزور اور بودا ثابت ہوگا کیونکہ ڈاکٹر رضی الدین صدیقی، ڈاکٹر سلیم الزمان صدیقی اور ڈاکٹر عبدالقادر ایسی شخصیتوں کو بیک جنبش قلم نظر انداز نہیں کیا جا سکتا"۔ اسی طرح بقول ڈاکٹر وزیر آغا "شاعری سے اقبال، حفیظ، محروم، میراجی، فیض، راشد، مجید امجد، ناصر کاظمی کے نام اگر حذف کر دیے جائیں یا نثر کے تذکرے میں منٹو، غلام عباس، ممتاز مفتی، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، قدرت اللہ شہاب، پطرس، اشفاق احمد، بلونت سنگھ، مسعود مفتی، کنہیا لال کپور، ابن انشا جیسے لاتعداد لکھنے والوں کے نام خارج کر دیں یا سر عبدالقادر، حسرت، مہر، سالک، فلک پیما، حمید احمد خان، مولانا صلاح الدین احمد، ڈاکٹر سید عبداللہ اور ڈاکٹر وحید قریشی جیسے اکابرین کی طرف اشارہ نہ ملے تو اردو ادب بالکل مفلس اور تہی دامن نظر آئے"۔

علاوہ ازیں پاکستان اور ہندوستان میں اردو کا استعمال تقابلی مطالعے سے بھی عیاں نظر آتا ہے خصوصاً اردو کے شعر و ادب میں اس کی مثال کثرت سے ملتی ہے۔

نظیر صدیقی نے اپنے ایک مضمون میں ایسی ہی چند مثالوں کی طرف توجہ دلائی تھی انھوں نے غزل میں اِکا دکا ہندی الفاظ کے استعمال کا جائزہ لیتے ہوئے لکھا تھا:

"اس معاملے میں پاکستان اور ہندوستان کے غزل گوؤں کے درمیان ایک نمایاں فرق یہ رہا ہے کہ پاکستان کے غزل گو عموماً ہندی کے عام فہم الفاظ استعمال کرتے رہے ہیں جبکہ ہندوستان کے غزل گو اپنے ملکی حالات کی بنا پر ہندی کے لیے الفاظ بھی استعمال کرتے ہیں جو یا عام فہم نہیں ہیں یا غزل کے مزاج سے مناسبت نہیں رکھتے۔ مثلاً ہندوستان کی جدید غزلوں میں۔ شبد، سمبندھ، چتر کاری، ماوکتا، کیول، بھجنگ، گپھا، نچھتر، جھوما جھمکی، جھانجھر جیسے الفاظ بھی ملتے ہیں، جو غالباً اردو کو ہندی سے قریب تر کرنے کی کوشش کا بھی نتیجہ ہیں۔ پاکستانی غزل گو عموماً بھاری بھر کم اور نامانوس ہندی الفاظ استعمال نہیں کرتے"۔

جب ہم کراچی کے بعض ڈائجسٹوں مثلاً سب رنگ، الف لیلیٰ، ابن صفی میگزین وغیرہ کی طرف دیکھتے ہیں تو وہاں شعوری طور پر ہندی الفاظ کہانیوں کے ذریعے شامل کرنے کی ایک کوشش ضرور کی گئی لیکن صرف ستر کی دہائی کے بعد یہ کوشش اسی طرح دم توڑ گئی؟ جس طرح اردو شاعری میں ظفر اقبال، جلیل عالی اور شیر افضل جعفری کی بعض کوششیں انہی سے شروع ہو کر انہی پر ختم ہو گئیں۔ بقول نظیر صدیقی ان کی یہ کوششیں یا الفاظ تراشی کا کام "نہ غزل کے لیے ضروری تھے نہ غزل کے مزاج سے میل کھاتے تھے، مثلاً ظفر اقبال نے لفنٹے، مرنٹے جیسے بہت سے الفاظ اردو غزل کو عطا کر کے غزل اور ہزل کا فرق مٹا دیا۔۔۔۔۔ تاہم جلیل عالی نے شمارنے، شکارنے جیسے مصادر اور حروف اضافت کا کی کے سے نجات مثلاً "احساس اندھیری" "سماعتوں ہاتھ"، "لفظ تیر"، خیال پنچھی" کے درمیان سے کا کی کے نکال کر نیا رجحان دیا، یا شیر افضل جعفری

نے بعض پنجابی الفاظ دیے اور ان کے معنی حاشیوں میں لکھ دیے مگر ہم دیکھتے ہیں کہ اشفاق احمد، بانو قدسیہ اور مشتاق یوسفی جیسے ادیب جب ایسے رجحانات سامنے لاتے ہیں تو انہیں قبول عام حاصل ہوتا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ پاکستانی ادب میں تبدیلی کا رجحان ضرور موجود ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے ایسے رجحان کے بارے میں لکھا کہ یہ دراصل پاکستانی ثقافت کی دریافت کی کوشش ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"......... جب پاکستان بنا تو غزل نے پاکستان کو از سر نو دریافت کرنے کی کوشش میں اس کی اشیاء، مظاہر اور ثقافت سے اپنا تعلق قائم کیا اور یوں اس میں ماحول سے علامات اخذ کرنے کا ایک واضح رجحان ابھر آیا۔ مختصر یہ کہ نئی غزل میں ارد گرد کے ماحول کی عکاسی پوری طرح موجود ہے اور یہ قومی شعور کی ترجمان ہے"۔

ریاض مجید، انور خالد، عاصم صحرائی، عبدالرشید، کشور ناہید، منیر نیازی، اعجاز فاروقی جیسے سینکڑوں نام اس رجحان کی نشاندہی کرتے ہیں۔ ان کی نظمیں خاص طور پر ایسے رجحانات کا اظہار کرتی ہیں جن میں سے ایک ضمیر مخاطب (تُو) اور ضمیر غائب (وہ) کے استعمال سے بقول جیلانی کامران انسان اپنے ارد گرد پھیلی ہوئی دنیا سے گفتگو کرنے کے قابل ہوا ہے۔ لفظ اور تجربے کی آمیزش سے ذہن کی وہ سطح ظاہر ہوئی ہے جو تخیل کی کارفرمائی کو نمایاں کرتی ہے اور اردو نظم کی وہ قوت ظاہر ہوتی ہے جو ایک عرصے سے گم تھی۔

ہندوستان اور پاکستان کی شاعری میں ایسے الفاظ کے استعمال کی مثالوں کے تقابل سے ظاہر ہوگا کہ پاکستانی اردو منفرد حیثیت اور جداگانہ انداز رکھتی ہے۔ ہندوستانی نقاد ڈاکٹر عصمت جاوید لکھتے ہیں:

"سبزہ، ہوا وغیرہ ایسے ہی علامتی اور اشاروی الفاظ ہیں، جن سے

فرحت و خوشی اور خوف و تجس کا جذبہ مرتعش ہوتا ہے۔ اسی طرح مچھلی، مکڑی، مینڈک، گلہری، سانپ، چیتا، بھیڑیا، بندر، بکری، کتا، ہاتھی، شیر، بلی، ہرن، بگلا، کبوتر، جگنو، فاختہ، کوا، چیل، سارس، تتلی، بوم، مرغا، مرغی، عقاب وغیرہ سے بھی باطنی اور ظاہری حواس و خواص کی قوت منتج ہوتی ہے"۔

اس کے مقابلے میں ڈاکٹر وزیر آغا "اردو شاعری کا مزاج" میں لکھتے ہیں:

"جدید تر غزل میں پیڑ، جنگل، پتھر، برف، گھر، شہر، پتے، شاخیں، دھوپ، سورج، دھواں، زمین، آندھی، کھڑکی، دیوار، منڈیر، گلی، کبوتر، دھول، رات، چاندنی اور درجنوں دوسرے الفاظ اپنے تازہ علامتی رنگوں میں ابھر آئے ہیں۔ ان لفظوں کی اہمیت اس بات میں ہے کہ یہ اپنے ماحول کے عکاس ہیں اور زمین کی باس، رنگ اور ذائقے کو قاری تک پہنچاتے ہیں"۔

ان اقتباسات میں ہندوستانی رجحان میں "باطنی اور ظاہری حواس" اور پاکستانی رجحان میں "ماحول کی عکاسی اور زمین کی باس" کا تقابل قابل توجہ ہے۔ جہاں تک پاکستانی غزل گوؤں کی اس نسل کا تعلق ہے، جس نے آزادی (۱۹۴۷ء) کے قریب قریب جنم لیا، اس نسل نے ۱۹۶۵ء کے بعد سے شعر گوئی کا آغاز کیا اور ۱۹۷۰ء کے بعد عروج کو پہنچی۔ بقول یوسف حسن "اس وقت تک پاکستان کے اردو ادب میں روایت پرستی کافی کمزور ہو چکی تھی اور ترقی پسندی اور جدیدیت نے اپنے ارتقا کے اہم مرحلے طے کر لیے تھے"۔ انفرادیت پسندی اسی پاکستانی غزل کا بنیادی رجحان ہے۔ خورشید رضوی، افتخار عارف، ریاض مجید، عدیم ہاشمی، انور شعور، خاور اعجاز، پروین شاکر، خالد احمد، جلیل عالی، حسن ناصر وغیرہ اسی نسل کے نمائندہ ہیں۔

روایتی اردو غزل میں اردو تہذیب اور اس کی مرکزی شعری روایت میں طوائف اور امرا کو موضوع بنایا گیا تھا۔ یہ دونوں موضوع پاکستانی غزل سے خارج ہو چکے ہیں۔ نئی نسل کی یہ غزل معاملات محبت جیسے آفاقی موضوع کو ضرور شامل کیے ہوئے ہے لیکن اس میں یک طرفہ محبت کا روایتی عنصر غائب ہے اور اب دو طرفہ اظہار ہی قدرے آگے بڑھ رہا ہے۔ اس کا اظہار کرنے والوں میں پروین شاکر، ناہید صدیقی، محسن نقوی، نجیب احمد، منور عزیز، جمال احسانی، ایوب خاور، حسن عباس رضا، مقبول عامر وغیرہ نمایاں ہیں۔

۱۹۷۱ء کے بعد سے پاکستانی شاعری میں حقیقی خود مختاری اور زیریں اور متوسط طبقوں کی آزادی کی جدوجہد اقبال اور جدیدیت کی روایت کے حوالے سے ابھر کر سامنے آئی۔ آئیڈیالوجی اور فنی جدیدیت باہم مدغم ہونے لگیں۔ انفعالیت کی جگہ فعال جذبوں نے لی، اس حوالے سے اجمل نیازی، غلام حسین ساجد، ناصر زیدی، خاور اعجاز، جاوید منظر، قائم نقوی، بشیر سیفی، شہزاد قمر، انعام الحق جاوید وغیرہ کی مثالیں دی جا سکتی ہیں۔ جمہوریت پسندی کا نام لینے والوں میں اجتماعی جدوجہد سے پاکستانی ادب میں حرارت اور حرکت پیدا ہوئی ہے۔ آج کی اس غزل میں مستعمل شعری تلازمات بقول قرۃ العین طاہرہ "انسان کی فطرت سے قرب کی نشاندہی کرتے ہیں۔ انعام الحق جاوید، عطا الحق قاسمی، نصیر احمد ناصر، حامد اعجاز، اظہار الحق، ثروت حسین اسی فطرتی حسن کو دریافت کرنے، منافقتوں کا تجزیہ کرنے اور دوست دشمن کی پہچان کے ساتھ ساتھ بقول سلیم احمد واقعیت زدگی ہے، جس میں جدید اشیائے ضرورت، اسباب آرائش اور مقامات کا نام لیتے ہوں۔ جمیل الدین عالی نے اس واقعیت زدگی کو غزل کے داخلی آہنگ اور رمزیت و ایمائیت چھوڑ کر خارجی اور غیر رمزی انداز کو اپنانے کا نام قرار دیا ہے۔ گویا آج کا شاعر گل و بلبل کی بجائے معاشرے کے تفاوت کا جائزہ اور فطرت کا

اظہار کر رہا ہے۔

جہاں تک اردو تحریر میں انگریزی الفاظ کے استعمال کا تعلق ہے تخلیقی اور شعوری ہر دو سطح پر یہ آمیزش جاری رہتی ہے لیکن اس طرح سے کہ اسے "اردوانے" یا "اردو بنانے کے عمل" کی شعوری کوشش کی جائے۔ لیکن یہ رجحان کسی صورت قابل قبول نہیں کہ انگریزی الفاظ کا املا بھی انگریزی حروف میں دیا جائے یا دور پار کے انگریزی الفاظ اپنی مشتق حالتوں میں بھی لازماً دیے جائیں جبکہ ان کی تصریفی شکل بدلی جا سکتی ہو۔ ان کی مدد کے لیے مقتدرہ نے قومی انگریزی اردو لغت میں ایسے بہت سے تجربے کے الفاظ پیش کیے ہیں جیسے ایٹم سے "ایٹمائزر" کی بجائے "ایٹم پاشی" وغیرہ، اس اصول سے استفادہ کیا جا سکتا ہے۔ یہ بات بالکل درست ہے کہ اردو میں کم از کم بڑے ادیبوں کو دوسروں کی رہنمائی کے لیے کچھ دیر اور رک کر اپنی تحریر میں ایسے انگریزی الفاظ پر تھوڑی سی محنت کر لینی چاہیے۔ یقیناً اسی سے اردو کی وسعت اور تجربات میں اور پاکستانی اردو میں ایک نئے رجحان کا اضافہ ہوگا۔

حصہ دوم

پاکستانی اردو بنام پاکستانی انگریزی

پاکستانی اُردو بنام پاکستانی انگریزی

ڈاکٹر عطش درانی

بیسویں صدی ملاوٹ اور آمیزش کی صدی تھی، جس میں ہر بناسپتی، نقلی اور جعلی چیز اصل میں ملا کر بطور اصل ہی پیش کی جاتی تھی۔ رفتہ رفتہ اصل آمیزش کو اس طرح سے قبول کر لیا گیا ہے کہ اب ہر قسم کی ملاوٹ کھلے عام نمبر دو کے نام سے پیش کی جانے لگی۔ اہل دانش نے بھی ادھر توجہ دی اور اسے ایک خوبصورت اصلاح امتزاجیت (Eclecticism) کا نام دیا گیا ہے۔ ان ماہرین نے اکیسویں صدی کو اسی امتزاج کی صدی قرار دیا ہے۔ جس میں ہر ثقافت مختلف رنگتوں اور ثقافتوں کا ایک آمیزہ ہوگی۔ کچھ ایسی ہی صورت حال زبان کے بارے میں ہو رہی ہے۔ پہلے تو بے جوڑ اور اَنمل قسم کی زبانوں کے پیوند لگا کرتے تھے مگر اب ان کے باہم امتزاج سے ایک نئی جنس متعارف کرائی جاتی ہے۔ چنانچہ اکیسویں صدی میں نہ صرف یہ کہ کوئی زبان خالص نہیں ہوگی بلکہ اس کے کئی امتزاجی ایڈیشن وجود میں آ جائیں گے۔

وطن عزیز میں قومی زبان اُردو اور سرکاری درباری زبان انگریزی دونوں اس آمیزش بلکہ امتزاجیت کی آویزش کا شکار ہیں۔ اردو میں اتنی انگریزی مل رہی ہے کہ اسے اینگلردو (Englurdu) یا اُردش (Urdish) کا نام دیا جانے لگا ہے اور انگریزی میں اتنی اردو مل چکی ہے کہ اسے بھی اُردش/اُنگلش (Urdish/Unglish) کا نام دیا جا رہا ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ ہندی اور اردو کی طرح اب اردو اور انگریزی میں بھی صرف رسم الخط کا فرق باقی رہ جائے گا۔ رومن میں پی ٹی وی کے نشری اعلانات اس فرق

کو بھی مٹانے پر آمادہ نظر آتے ہیں۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہم اردو سے اغماض تو برت ہی رہے تھے، کیا اپنی چہیتی انگریزی سے بھی مخلص نہیں رہے؟ آج بہت سے ماہرین اور تحقیق کار واضح کر چکے ہیں کہ پاکستان میں عملاً جو انگریزی رائج ہے وہ جو کچھ بھی ہے مگر ملکہ کی یا وہ شاہی انگریزی (Queen's English) یا (King's English) نہیں ہے، جس کا ڈنکا وطن عزیز میں دن رات پیٹا جاتا ہے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ شاہی انگریزی اب دُنیا کے کسی بھی ملک میں رائج نہیں۔ برصغیر میں اس انگریزی نے کبھی بھی فروغ نہیں پایا۔ شاید بہت اعلیٰ سطح پر، چند تعلیمی اداروں میں یا پھر ادبی مطالعے کی میز پر اس انگریزی سے شُد بُد ضرور پیدا ہو گئی ہو گی لیکن پچھلی دو صدیوں میں برصغیر میں اس کی اپنی ہی انگریزی "اینگلوانڈین" (Anglo-Indian) کی گود میں پروان چڑھتی رہی۔ یل اور برنیل (Yul & Burnell) کی "ہابسن جابسن" (۱۸۸۶ء) اور وحائٹ ورتھ کی (Anglo-Indian Dictionary) (۱۸۸۵ء) اس کے بڑے جامع ثبوت ہیں۔ مؤخر الذکر نے ۱۹۰۷ء میں مقامی افراد کی انگریزی تحریروں میں "اغلاط" کی نشاندہی بھی کی تھی اور یوں اصلاح انگریزی کا ایک دور چل پڑا۔ جبکہ درحقیقت یہ برصغیری / ہندی یا جنوبی ایشیائی انگریزی وجود میں آرہی تھی۔ یہی ورثہ آزادی کے بعد پاکستان، بھارت، بنگلہ دیش، نیپال اور سری لنکا میں بھی ان کے اپنے اپنے رجحانات اور ضرورتوں کے مطابق انگریزیوں (Englishes) کے جنم لینے کی صورت میں سامنے آنے لگا۔ جو بالآخر ایک دوسرے سے جدا، متمیز اور متنوع ہو کر رہیں۔

آج پاکستان میں جو انگریزی استعمال ہو رہی ہے، اس میں اردو کا امتزاج اس حد تک ہو چکا ہے کہ ماہرین اسے الگ قسم کی انگریزی "پاکستانی انگریزی" کا نام دے رہے ہیں۔ پاکستانی اردو کا جائزہ لینے سے پہلے اس انگریزی کا جائزہ لے لینا بہت ضروری

ہے تاکہ ہر دو زبانوں پر تحقیق انجام دینے والوں کو ایک واضح سمت مل سکے۔

ریاض حسن، رابرٹ جے بُوم گارڈنر، ڈاکٹر طارق رحمان، احمد علی، انجم ریاض الحق، انور موراج، شایان افضل خان، جین این لنڈلے، انجم سلیمی، رقیہ حسن، مبینہ طلعت، آرڈلے کینیڈمی، عفت فرح، فوزیہ شمیم، بپسی سدھوا، شاہین معراج، رضی عابدی، تنویر انجم، ڈاکٹر انور شبنم دل، وقاص احمد خواجہ، رچرڈ نیروپ، کلیم عمر، ندیم فاروق پراچہ، ثمینہ قادر، ایم جمیل، طلعت رفیع، ذکیہ سرور، خالد رحمان، منیزہ شمسی، شاہد حمید اور شمس الدین جیسے کتنے ہی محققین کے نام ہمارے سامنے آ چکے ہیں جو پاکستانی انگریزی پر متعدد تحقیقاتی رپورٹیں اور نگارشات پیش کر چکے ہیں۔

۱۹۶۸ء میں سمتھ ہیسُرز نے بھارتی انگریزی اور ۱۹۷۵ء میں پاکستانی انگریزی اور یہاں کے طلبہ کی اغلاط کی طرف توجہ دلانے کے لیے کتابیں شائع کیں۔ راجا رام مہرو ترا نے ۱۹۷۵ء سے ۱۹۸۲ء تک مختلف مضامین میں اس طرف توجہ دلائی۔ آر کے پارو نہالانی اور پریا ہوسالی نے ۱۹۷۹ء میں بھارتی اور برطانوی انگریزی کے اختلافات پر ایک کتاب (The Indian and British English) شائع کی۔ ایس وی شاستری (۱۹۸۸ء)، ایس این سری دھر اور کے کے سری دھر (۱۹۸۹ء) نے اپنے مضامین میں بھارتی انگریزی کی تفصیلات بیان کیں۔ اس کے بعد سے بھارت میں بھی سینکڑوں محققین کی تحریریں سامنے آئیں اور اب دنیا میں بھارتی انگریزی کو بھی الگ تسلیم کیا جانے لگا ہے۔

یہی صورت حال پاکستان انگریزی کی ہے۔ اس کا پہلا جائزہ بھارتی محققین نے پیش کیا۔ براج بی کچرو نے ۱۹۸۳ء میں متعدد مضامین تحریر کیے۔ ۱۹۸۷ء میں بوم گارڈنر نے، ۱۹۸۸ء میں بوم گارڈنر اور کینیڈمی نے، اسی سال مبینہ طلعت نے اور ۱۹۸۹ء میں ڈاکٹر طارق رحمان نے اپنے تحقیقی مقالے پیش کیے۔ مبینہ طلعت کا مطالعہ

ذرا محدود اور طارق رحمان کا مطالعہ ذرا وسیع نظر آتا ہے۔ ۱۹۸۹ء میں عفت فرح کے مقالے اور ۱۹۹۱ء میں تنویر انجم کے ڈاکٹریٹ کے مقالے میں سماجی نفسی حوالے سے تحقیقات پیش کی گئیں۔ پاکستانی انگریزی کی اصوات کے نظام پر ۱۹۸۳ء میں شمس الدین، ۱۹۸۴ء میں ثمینہ قادر اور ۱۹۹۰ء میں طارق رحمان کی تحقیقات منظر عام پر آئیں۔ تب سے اب تک اخبارات میں اس موضوع پر متعدد مضامین شائع ہوئے ہیں۔ خالد حسن (۱۹۸۵ء، ۱۹۸۶ء) اور موراج (۱۹۸۷ء، ۱۹۸۹ء) رضی عابدی (۱۹۹۱ء)، کلیم عمر (۱۹۸۶ء)، طارق رحمان (۱۹۹۰ء۔ ۱۹۹۳ء۔ ۱۹۹۴ء)، انجم سلیمی (۱۹۹۱ء)، منیزہ شمسی (۱۹۹۱ء)، مبینہ طلعت (۱۹۹۱ء) کے مقالات قابل ذکر ہیں۔ ۱۹۸۲ء میں برطانوی محقق گمپرز (Gumperz) کے مطالعہ میں پاکستانی انگریزی کا تجزیہ بھی سامنے آتا ہے۔ رقیہ حسن نے اُردو اور برطانوی انگریزی کے ملاپ سے پیدا ہونے والی صورت حال کا تجزیہ کیا، جو ۱۹۸۴ء میں شائع ہوا۔ ۱۹۸۸ء میں مبینہ طلعت کا مقالہ اور پھر انجم سلیمی کی تحقیق قابل توجہ ہے، فوزیہ شمیم، کینیڈمی اور بوم گارڈنر پاکستانی انگریزی کی تائید کرتے ہیں۔ خاص طور پر پاکستانی انگریزی کے اردو پن پر ان کی سات سالہ تحقیق جو پہلی بار ۱۹۹۳ء میں The English Language in Pakistan مرتبہ بوم گارڈنر کے نام سے شائع ہوئی، قابل توجہ ہے۔ اُردش کا لفظ ہمیں پہلی بار ریاض حسن کے مضمون (۱۹۸۳ء) مطبوعہ جرنل آف یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کے عنوان ہی میں مل جاتا ہے۔ وہ لکھتا ہے:

"در حقیقت پاکستان میں اردو اور انگریزی واضح اور متمیز دو زبانیں ہیں۔ اردو انگریزی میں بے تکے ملاپ (Odd Mixing) کے طریقہ سے ملتی ہے اور اس طریقے کو ہم باسانی اُردش (Urdish) (اردو + انگریزی) کہہ سکتے ہیں"۔

اسی طرح ایک اصطلاح اُنگلش (Unglish) نے ۱۹۹۶ء میں "نیوز" اخبار کے

میگزین ایڈیشنوں میں فروغ پایا۔ ان سب اصطلاحوں سے بڑھ کر "پاکستانی انگریزی" کی اصطلاح علمی حلقوں کے لیے توجہ کا زیادہ سبب بن رہی ہے، جسے جنوبی ایشیائی انگریزی کی ایک شاخ قرار دیا جاتا ہے۔ اسی شاخ میں بھارتی کے علاوہ بنگلہ دیشی، نیپالی اور سرلنکائی انگریزیاں شامل ہیں۔ اگرچہ ابتداء میں یہ رجحان محض انگریزی میں ان علاقوں کے لوگوں کی عمومی اغلاط کی طرف تھا، لیکن رفتہ رفتہ یہی اغلاط مستند انگریزی ٹھہرنے لگیں۔ آکسفورڈ اور ویبسٹر تو عرصہ سے "انڈین انگلش" کو بھی برطانوی اور امریکی انگریزی کے ساتھ ساتھ ایک مستقل اور مستند ماخذ قرار دے رہے تھے۔ مگر اب کیمبرج انٹرنیشنل ڈکشنری، کولنز کوبلد ڈکشنری اور لانگ مین کنٹمپریری ڈکشنری نے بھی برطانوی، امریکی، کینیڈین، آسٹریلین اور سنگاپوری انگریزی کے ساتھ ساتھ انڈین اور پاکستانی انگریزی کو بھی "عالمی انگریزی" کے اہم ماخذ قرار دیا ہے۔ لانگ مین ڈکشنری آف کنٹمپریری انگلش ۱۹۹۵ء (خاص طور پر ۱۹۹۲ء ایڈیشن) میں امریکی اور برطانوی کو دو اہم بنیادی زبانیں قرار دیا گیا ہے۔ امریکی انگریزی کی مزید قسمیں کینیڈین اور کیریبیئن اور برطانوی انگریزی کی مزید قسمیں انڈین، پاکستانی، آئرش، نیوزلینڈی، جنوبی افریقی اور سکاٹش انگریزی قرار دی ہیں اور لغت میں جابجا ان کے حوالے دیے ہیں۔ آکسفورڈ یونیورسٹی پریس نے اپنی "کمپینیئن سیریز" میں ۱۹۹۲ء میں (A Companion to English Language) تیار کرائی تو اس میں پاکستانی انگریزی کو علیحدہ طور سے تسلیم کیا گیا۔ یہ بھی بوم گارڈنر کی تحریر تھی۔ پاکستانی انگریزی کی اصطلاح اس نے ۱۹۸۷ء میں وضع کی تھی۔ پاکستانی انگریزی کے فروغ کے لیے ۱۹۸۵ء سے SPELT (سوسائٹی برائے اساتذہ پاکستانی انگریزی زبان) نے بھی کام کرنا شروع کر دیا ہے۔ وہ اپنا نیوز لیٹر بھی جاری کرتی ہے۔ ۱۹۸۴ء میں تن گیک نے سنگاپوری انگلش، مائرنا تبور نے فلپینو انگلش ڈکشنری اور ۱۹۸۱ء میں میکوری لائبریری سڈنی اور ۱۹۸۶ء میں آکسفورڈ یونیورسٹی پریس نے آسٹریلین ڈکشنریاں شائع کیں۔

۱۹۹۷ء کے آغاز میں سڈنی (آسٹریلیا) سے میکوری لائبریری سڈنی نے ایشین انگلش کی ایک بہت بڑی ڈکشنری شائع کرکے ثابت کیا ہے کہ یہ انگریزی ان علاقوں میں برطانوی راج سے بھی پہلے وجود میں آئی تھی۔ اس ضخیم ڈکشنری سے آکسفورڈ اور ویبسٹر میں ایک تیسری بڑی لغت کا اضافہ ہوجائے گا۔ اس کے ایڈیٹر کے بقول دنیا میں تین بڑی انگریزیوں یعنی برطانوی، امریکی اور ایشیائی کی تقسیم واضح ہے۔ چھ انگریزیاں ایسے لوگوں کی زبانیں ہیں جن کی یہ ثانوی زبان نہیں۔

جہاں تک پاکستان میں انگریزی کی تدریس کا تعلق ہے، زیادہ تر کورس شاہی (برطانوی) انگریزی کو محیط ہیں، جبکہ ایجوکیشن، یواین او، یونیسکو اور دیگر بہت سے اداروں کی معرفت امریکی انگریزی داخل ہے اور انگریزی کے صحافی اور ادیب ایک نئی قسم "پاکستانی انگریزی" متعارف کرا چکے ہیں۔ ایسے میں انگریزی کے کئی پروفیسر مثلاً شاہد حمید "قومی انگریزی اردو لغت کا ایک جائزہ (۱۹۹۳ء) میں اور سید سعادت علی شاہ (۱۹۸۷ء) "Enploring the World of English" جیسی مطبوعات میں نہ صرف برطانوی انگریزی کی رٹ لگائے ہوئے ہیں بلکہ لوگوں کی "اغلاط" درست کرتے پھر رہے ہیں۔ دنیا کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ انگریزی کچھ کی کچھ بن گئی۔ ضرورتیں کیا سے کیا ہو گئیں۔ ایک ہم ہیں کہ آج تک انگریزی کو سینے سے چمٹانے کے اور سر پر مسلط کیے رکھنے کے باوجود یہ طے نہیں کرسکے کہ اس سلسلے میں ہماری تدریسی، تحقیقی اور تصنیفی ضرورتیں کیا ہیں۔

حقیقت یہ کہ اس وقت دنیا میں "انگریزی" نام کی کوئی واحد زبان اب موجود نہیں۔ ہر ملک کی اپنی انگریزی ہے اور اپنی ضرورتیں ہیں۔ کچھ لوگوں نے "عالمی انگریزی" کا شور ضرور مچا رکھا ہے لیکن بات "فنکشنل" اور "کام چلاؤ" قسم کی انگریزی سے آگے نہیں بڑھی۔ قرونِ وسطیٰ میں عربی جیسا عالمی ادبیاتی مقام انگریزی کو ابھی تک

نصیب نہیں ہوا کہ عربی جہاں بھی گئی عربی رہی۔ ایرانی عربی، ہندوستانی عربی اور ترکی عربی نہیں بنی۔ بول چال کی بات جدا تحریری سطح پر یکساں معیار کی زبان رہی۔ لیکن انگریزی جو اگرچہ ۳۵ ملکوں میں موجود ہے، مگر ہر جا زبان دیگر است۔ ۱۹۸۰ء سے امریکا میں سا گر جیسے لوگوں نے "خصوصی مقاصد کی انگریزی" (ESP) کی تحریک چلائی جس کی بنا پر کاروباری انگریزی، قانونی انگریزی، طبی انگریزی، سائنسی و تکنیکی انگریزی وغیرہ جیسی اقسام، تنوع اور امتیاز کی ایک اور صورت میں سامنے آ رہی ہیں۔ چنانچہ خامہ سر بگریباں ہے کہ اب کون سی انگریزی پاکستان میں پڑھائی جائے اور کیوں؟ کن مقاصد کے لیے اور کن ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے؟ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی کہ یہ سب کچھ قومی زبان اور دیگر پاکستانی زبانوں کی قیمت پر کیوں؟ کیا یہ صرف ایک خاص طبقے کی بالادستی برقرار رکھنے کے لیے ہے کہ جسے خود بھی "درست" انگریزی نہیں آتی کہ اگر وہ درست ہے تو برطانوی ہوگی، امریکی لحاظ سے غلط ہوگی۔ اگر پاکستانی ہوگی تو برطانوی لحاظ سے غلط ہوگی۔ عمومی انگریزی ہوگی تو کاروباری، قانونی، طبی یا سائنسی و تکنیکی لحاظ سے غلط ہوگی۔ ابھی تک پاکستان میں ایم اے کی سطح تک کوئی بھی ایسا کورس وضع نہیں ہوا، جو ان تمام ضرورتوں کو پورا کر سکے۔ سوائے اوپن یونیورسٹی کے بی اے کی سطح کے فنکشنل انگلش کورس کے۔ پھر یہ انگریزی خواں طبقے انگریزی پر جتنا عبور رکھتے ہیں اور اپنی قومی ضرورتوں کو جس حد تک پورا کر سکتے ہیں اس کا ایک تجربہ "قومی انگریزی اردو لغت" کی تیاری کے دوران میں مقتدرہ کو بھی ہوا۔ لغت کی تدوین کے دوران میں انگریزی ذریعۂ تعلیم کے انگریزی بولنے اور لکھنے، پڑھنے والے ماہرین انگریزی تو ساتھ چل نہ سکے۔ ہاتھ جوڑ کر کام واپس کر گئے۔ بالآخر قرعۂ فال ان لوگوں کے نام نکلا، جو اُردو ذریعۂ تعلیم اور "ٹاٹوں پر بیٹھ" کر انگریزی پڑھنے لکھنے والے تھے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ پاکستان میں انگریزی کا بھانڈا زبانوں کے چوراہے میں آ کر پھوٹ چکا ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ مختلف "غلط" انگریزیوں نے باہم طے کر لیا ہے کہ ہر

قسم کی غلط سلط انگریزی پاکستان میں بہر طور جائز ہے۔ بشرطیکہ بالادستی "انگریزی" ہی کی رہے۔ خواہ اس کی آڑ میں کچھ بھی کہتے رہو۔ اور کچھ بھی لکھتے رہو، صرف حروف رومن یعنی انگریزی کے ہونے چاہئیں۔ پی ٹی وی کی طرح خواہ اس میں اردو ہی لکھتے رہو۔ ہماری معروف انگریزی ادیب بپسی سدھوا خود اس راز سے پردہ اٹھاتے ہوئے لکھتی ہیں کہ ان کے ناول ایسی ہی انگریزی کے باعث تو مقبول ہوئے۔ یعنی اگر وہ شاہی انگریزی میں لکھتیں تو کبھی معروف نہ ہوتیں۔ دراصل انگریزی میں پاکستانیوں کی برائے نام "اغلاط" جو ہر ایسی کتاب میں واضح کی جاتی ہیں، اکثر پاکستانیوں کی تحریروں اور تقریروں میں موجود رہتی ہیں، اخبارات اور ریڈیو، ٹیلی وژن بھی انہی کو نشر کر رہے ہوتے ہیں۔ مثلاً سعادت شاہ نے "غلطی" کی ایک مثال "To Keep" کے تحت دی ہے کہ حسب ذیل جملہ غلط ہے۔ "Keep this on the table" اور صحیح یہ ہے "Put this on the table"۔ لیکن سندھ ٹیکسٹ بک بورڈ کی چھٹی جماعت کی درسی کتاب (۱۹۸۹ء) میں صفحہ ۵۳ پر یہ جملہ یوں پڑھایا جاتا ہے "My mother is keeping food upon the table"۔ ایک طرف تو ان کی "اصلاح" کی بات ہو رہی ہے اور دوسری طرف تدریسی مواد میں یہ "اغلاط" عام ہیں۔ اس ردعمل کو بوم گارڈنر (۱۹۸۹ء) اپنے ایک مقالہ میں "Pedagogic Shizoglosia" (تدریسیاتی پراگندہ لسانی) قرار دیتا ہے۔

آپ پاکستان میں طبع شدہ انگریزی کی کوئی بھی تحریر: عمومی کتاب، درسی کتاب، ٹیسٹ پیپر، گائیڈ، ڈکشنری اٹھا کر دیکھ لیجیے، یہ پراگندہ لسانی عام طور پر نظر آئے گی۔ کتابستان کی ڈکشنری پاکستان میں بہت فروخت ہوتی ہے۔ جو ایسی "اغلاط" کا مجموعہ ہے۔ اس کی اردو انگلش ڈکشنری (۱۹۸۹ء) میں "جوتی چور" کا ترجمہ (Shoe-lifter) کیا گیا ہے۔ Lifter ہی کے حوالے سے دیکھیں تو بلوچستان اور

پنجاب کی ٹیکسٹ بک بورڈ کی درسی کتاب دہم (۱۹۹۲ء) میں بھی صفحہ ۲۶ پر Child-lifter کا لفظ اسی وضع پر بنایا گیا۔ آکسفورڈ یونیورسٹی پریس کی کتاب The Companion to Oxford English for Colleges (۱۹۸۳ء) یہاں بہت استعمال ہوتی ہے۔ جس میں ایک پیراگراف میں جملہ Train Consists of Six Bogies شامل ہے، جو ثقہ قسم کے اور شاہی انگریزی دانوں کو شاید ناپسند ہو۔ مبینہ طلعت نے اپنے مقالہ ایم فل (۱۹۸۸ء) میں یہ اور ایسے بہت سے الفاظ کا جائزہ پیش کیا ہے۔ اردو اور دیگر پاکستانی زبانوں سے دخیل الفاظ اب پاکستانی انگریزی ادبیات کا معمول بن چکے ہیں۔ ٹیکسٹ بک بورڈ صوبہ سرحد کی چھٹی جماعت کی درسی کتاب میں "محمد علی جناحؒ" پر ایک مضمون میں شیروانی، شلوار وغیرہ کو بعینہ رومن حروف میں لکھا گیا ہے۔ جبکہ ٹوپی کو Cap میں ترجمہ کیا گیا ہے۔ اسی طرح شاہی انگریزی میں شیروانی بھی Knee-length Coat اور شلوار بھی Loose-fitting trousers ترجمہ ہو سکتی تھی۔ پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ کی جماعت نہم کی درسی کتابیں (۱۹۹۱ء) میں پنجاب پر ایک مضمون میں "چوپال"، "ماہیہ"، "ہیر" بعینہ دیے گئے ہیں۔ جبکہ چوپال شاہی انگریزی میں Village Pavilion ترجمہ ہو سکتا تھا۔ ماہیہ کے ساتھ Punjabi folk song اور ہیر کے ساتھ An epic poem بھی لکھا جا سکتا تھا کہ شاہی انگریزی کے لیے تو ان کی تشریح کرنا پڑے گی۔ پاکستان میں جیسی بھی اردو، انگریزی ڈکشنریاں ملتی ہیں، انھیں ملاحظہ کریں تو وہاں ایسی ہی "بوالعجبیاں" پائی جاتی ہیں۔ کتابستان (۱۹۸۹ء) ہی میں دیکھیں:

"گھیراؤ" کا ترجمہ Industrial Blockade، چالان کا ترجمہ Invoice، جرگہ کا ترجمہ Tribal Jury دیا گیا ہے۔ یہ الفاظ کسی طور پر معانی کا احاطہ نہیں کرتے۔ پاکستانی سیکرٹریٹ یا دفتری نظام ہر روز نئے نئے انگریزی الفاظ وضع کر کے

نئے نئے مفاہیم میں چلارہا ہے۔ .Distt. Sectt جیسے مخففات میں "tt" کا استعمال اور Speed-braaker, Move-over, Secondment اصطلاحیں اس کی عام مثالیں ہیں۔

بوم گارڈنر (۱۹۹۳ء) لکھتا ہے کہ پاکستان میں انگریزی اپنے لسانی خدوخال گرامر، لفظ سازی، لغوی و معنوی تغیر، دخیل الفاظ وغیرہ کے حوالے سے بے حد مختلف ہو چکی ہے۔ یہ سب کچھ معیاری برطانوی یا شاہی انگریزی کے حوالے سے "اغلاط" کی صف میں آتا ہے۔ ہمیں پاکستانی انگریزی کے ان پہلوؤں کا ذرا تفصیل سے جائزہ لینا ہوگا۔ خاص طور پر انگریزی اُردو آمیزی کے عمل کا جائزہ بہت ضروری ہے۔ جس کی بنا پر ہم طے کر سکیں گے کہ کیا ہم اردو میں انگریزی ملا کر اسے اردش (Urdish) بنا رہے ہیں یا انگریزی میں اردو ملا کر اُنگلش (Unglish) لا رہے ہیں؟ کیا یہ سب کچھ جائز ہے؟ اور کیا ہمیں تدریس میں بھی اسی انگریزی کو جگہ دینا ہے؟ ان صفحات میں ہم صرف پاکستانی انگریزی کے اردو ایڈیشن کی بات کریں گے۔ اس کے باقی پہلوؤں پر گفتگو کسی اور موقع کے لیے اٹھا رکھیں گے۔ اس موضوع پر رابرٹ بوم گارڈنر، آڈرے، کینیڈی، فوزیہ شمیم اور شاہین معراج نے متعدد مقالے شائع کیے ہیں۔ معروف انگریزی ناول نگار بپسی سدھوا نے اس ضرورت کے تقاضوں کے اعتراف میں لکھا ہے۔ انگریزی زبان کے معروف تاریخ نگار باؤ اور کیبل (۱۹۷۸ء) نے اپنی کتاب میں انگریزی کے مقامی ثقافتوں سے متاثر ہونے کا اعتراف کیا ہے۔ چنانچہ انگریزی ملک سے نکلنے سے پہلے ہی لاطینی، سکنڈے نیویائی اور فرانسیسی زبانوں اور ثقافتوں کو گلے لگا چکی تھی۔ صرف یہی نہیں بلکہ برطانیہ کے اندر، کوئینز انگلش، جنرل انگلش، سکاٹش، آئرش اور ویلش کے ناموں سے کم و بیش پانچ اقسام وجود میں آ چکی ہیں۔

جنوبی ایشیاء میں جس پاکستانی انگریزی کو تسلیم کیا جانے لگا ہے، اس میں زیادہ

زور اردو کا ہے۔ اس کے علاوہ دیگر مقامی زبانوں کے الفاظ بھی اس کا حصہ بنتے چلے جا رہے ہیں، انھیں رومن حروف میں بغیر کسی انگریزی متبادل کے لکھ دیا جاتا ہے۔ گویا یہ سمجھا جا رہا ہے کہ انگریزی کا قاری دراصل اردو ہی کا قاری ہے، اس لیے وہ ان الفاظ کا مطلب خوب جانتا ہے۔

مثلاً:

* The typical Chaudhry taking his chillum under a shady tree at his dera ... (Herald April 1991)
* The Bismillah ceremony of the three-day annual urs of Hazrat Baba Bulliay shah as ..... Ghusl to the Mazalr ..... (The Nation, Lahore, 26 Aug. 1989).
* Awami Qiadat must for positive change. (The Pakistan Observer, Islamabd, 28 Jan. 1997).
* Qazi calls off dharna on govt. assurance. (The Nation, Islamabad, 28 Jan 1997)

رابرٹ بوم گارڈنر، آڈرے، کینیڈی اور فوزیہ شمیم نے اس عمل کو انگریزی کی تارید یا اردوانے (Urduization) کا نام دیا ہے۔ جس میں پاکستان کی دیگر زبانیں بھی شریک ہوتی ہیں۔ انھوں نے اپنی اس رپورٹ پر سات سال صرف کیے اور کوائف جمع کیے۔ شاہین معراج نے اپنی تحقیق میں پاکستانی اردو کے اس عمل (مقامیت آمیزی) کو تفصیل اور مثالوں کے ساتھ بیان کیا ہے جس کا تذکرہ ہم آگے چل کر کرتے ہیں۔ ان زبانوں میں پنجابی، سرائیکی، سندھی، پشتو، بلوچی، بلتی اور کشمیری شامل ہیں۔

صحافتی ضروریات اور اشیائے استعمال سے قطع نظر کہ چودھری، چلم، عرس،

غسل، عوامی قیادت، دھرنا وغیرہ کی طرح اب الفاظ/اسماء کی ایک وسیع تعداد انگریزی میں عام استعمال ہو رہی ہے۔ لیکن زبان کے عام الفاظ جیسے نوسر باز (Tricksters) (دی نیشن، لاہور، ۲۴ جولائی ۱۹۸۸ء)، کروڑ پتی (Millionaire) (نیشن، لاہور ۲۲ فروری ۱۹۹۰ء) مرغی چور (Chicken thief) (دی مسلم، اسلام آباد ۹ جولائی ۱۹۹۰ء)، داداگیر (Godfather)، (دی نیوز، لاہور یکم ستمبر ۱۹۹۱ء) بھی عام طور پر بلامترادف رومن حروف ہی میں لکھ دیے جاتے ہیں۔ (قوسین میں انگریزی ترجمہ قارئین کی سہولت کے لیے ہے) صرف اسی پر بس نہیں بلکہ ان سے انگریزی جمع اور افعال بھی بنا لیے جاتے ہیں۔ جیسے گھیراؤ سے Gheraoed, Gheraos (پاکستان ٹائمز، لاہور، ۲۳ اکتوبر ۱۹۸۹ء، اور ویوپوائنٹ، ۷ جون ۱۹۹۰ء) اسی طرح Sifarish goes (پاکستان آبزرور، اسلام آباد ۳ دسمبر ۱۹۸۹ء) خاص طور پر "والا" کے لاحقے والے الفاظ جن کا انگریزی متبادل بھی موجود ہے، عام استعمال ہو رہے ہیں۔ جیسے گدھا گاڑی والا (Donkey cartman) (دی ٹرائیبیون کراچی ۶ جولائی ۱۹۸۹ء، پانی والا (Water carrier) (فرنٹیئر پوسٹ، لاہور، ۲۶ جولائی ۱۹۸۹ء)، کھوکھا والا (Kiosk keeper) (نیشن، لاہور، ۱۴ جولائی ۱۹۹۰ء)، تیل مالش والا (Masseur) (مسلم اسلام آباد ۱۴ جون ۱۹۹۰ء)۔

عام الفاظ کی مثال ناراض (annoyed) (نیشن لاہور ۱۹ جون ۱۹۸۹ء)، بدتمیز (مسلم، اسلام آباد ۲۲ اکتوبر ۱۹۹۱ء)، گورا (The English) (فرنٹیر پوسٹ، پشاور ۲۰ ستمبر ۱۹۹۱ء)، چھوٹا (Apprentice)، (ویک اینڈ پوسٹ، لاہور، ۴ اکتوبر ۱۹۹۱ء)، ٹک ٹکا (bribe) (دی نیوز، لاہور ۲۹ اپریل ۱۹۹۱ء)، طلاق نامہ اور نکاح نامہ (deed of divorce or marriage certificate) (دی فرائی ڈے، ٹائمز لاہور ۶ تا ۱۲ جولائی ۱۹۸۹ء)، فرشی سلام (low bow) (فرنٹیئر پوسٹ، لاہور ۲۲ جون

۱۹۹۱ء) اور ہٹا کٹا (able-bodied) (مسلم، اسلام آباد ۳۱ اگست ۱۹۹۱ء) وغیرہ کی مثالیں عام ملتی ہیں۔ صرف یہی نہیں بلکہ اردو الفاظ کو انگریزی کے ساتھ ملا کر تراکیب وضع کرنا بھی عام ہے جیسے Earthy tuned nice ghareloo ("یو" لاہور، ۱۸ اگست ۱۹۹۱ء)۔ اردو کے پورے پورے جملے بھی استعمال میں آتے ہیں۔ جیسے "ہمارا کام نہیں ہوتا" (Our work does not get done) (فرنٹیئر پوسٹ لاہور ۲۲ جون ۱۹۹۱ء) "سب اچھا ہے" (Every thing is fine) (مسلم اسلام آباد، ۷ نومبر ۱۹۸۶ء) جو کچھ ہوتا رہا ہے، وہ اب نہیں ہوگا (Those things which have been done in the past will not be repeated) (نیشن لاہور، ۲۲ جولائی ۱۹۹۱ء)، اس موضوع پر تنویر انجم (۱۹۹۱ء) گمپرز (۱۹۸۲ء)، گمپرز، اولکھ اور کالٹ مین (۱۹۸۲ء)، کچرو (۱۹۸۳ء) اور سری دھرو غیرہ (۱۹۸۹ء) کی تحقیقی رپورٹیں اہم ہیں۔ "ہابسن جابسن" کی اردو انگریزی آمیز تراکیب مثلاً برانڈی پانی، جم خانہ، لمبردار آج بھی پاکستانی انگریزی بلکہ اردو میں ملتی ہیں۔ کئی نئی تراکیب بھی سامنے آتی ہیں۔ جنہیں بوم گارڈنر اور اس کے ساتھیوں نے تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔

Anti-goth, Ex-tehsildar, Mini-jirga, Non-haqeeqi, Post-iftar, Gaondaism, Lahorites, Mohalla-wise, Mullacracy, Punjabize, Quaidship, Assemblywala, Baigar camp, Chota peg, International gorrilay, Sarkari hoodlums, Masihi league, Barsati sunset, Desi counterpart, Desi liquor, Servant-cum-chowkidar, Bonafide Chowkidar, Mohtasib secretariat, Lathi-charged, Parda system, Pardah-observing, Pardah-drawn, Chhittar parade, Parchi Sending,

Chamcha discussions, Jagga tax, Gonda-tax etc.

اردو الفاظ کے عجیب و غریب انگریزی ترجمے ملتے ہیں۔ جیسے مسواک (کتابستان ۱۹۸۹ء، ص = ۵۸۸) میں tooth brush ترجمہ کیا گیا ہے، جو درست نہیں۔ ایسی دیگر مثالوں میں اڈا (station)، بازار (Market)، چادر (Cover) وغیرہ بھی کئی دیگر لغات میں عام ملتے ہیں۔

انگریزی تحریروں میں جمع کا عنصر کھوکھاز، ریڑھیز، جلوسز، عُرسز، جاگیردارز، پٹھاز، پینڈوز، مظلومز، شہیدز، مکتبز، مجاہدینز، تکبیرائس، بیگمائس، آیائس، عزادارز، پٹواریز، مدرساز، جھگیز، وغیرہ کہ ایسی کچھ رسم پاکستانی اردو میں بھی چل پڑی ہے۔ پاکستان میں اردو کی طرح انگریزی بھی دراصل کثیر لسانی قارئین کے لیے لکھی جاتی ہے۔ اس لیے یہ کہنا کہ پاکستان میں انگریزی کسی عالمی ضرورت کے لیے تحریر ہوتی ہے، قطعاً غلط ہے اور مذکورہ بالا تحقیق کنندگان اسے تسلیم کرنے سے انکاری ہیں۔ یہ بجا کہ اردو کے بہت سے الفاظ برطانوی اور امریکی انگریزی میں ملتے ہیں۔ ایک تحقیق کے مطابق آکسفورڈ ڈکشنری میں ۳۲۵ صرف اردو (عربی، فارسی کے علاوہ) الفاظ موجود ہیں۔ لیکن جس شرح سے یہ الفاظ پاکستانی انگریزی میں استعمال میں آرہے ہیں، اس سے کہا جا سکتا ہے کہ پاکستان کی انگریزی قطعاً برطانوی انگریزی نہیں، موزد انگریزی ہے۔ مظفر اے غفار (۱۲ اپریل ۱۹۹۰ء) لکھتے ہیں:

"جب ہم انگریزی میں "اچھا" اور "واہ" کے علاوہ دیگر الفاظ بولتے ہیں، تو دراصل ہم اپنے اردو پس منظر میں غوطہ زن ہوتے ہیں، کیونکہ ہم اس کا کوئی انگریزی متبادل تلاش کرنے میں ناکام رہتے ہیں اور اُردو لفظ چپکے سے اس میں داخل ہوتا ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ہم یہ صحیح کام کر رہے ہیں۔ آپ فوراً بڑی عاجزی سے کہیں گے "نہیں بالکل نہیں"، "ہمیں

شرمندہ ہونا چاہیے" وغیرہ لیکن ذرا توقف کیجیے۔ سوچیے اور اپنی معذرتوں کو
زبان کے مقاصد سے ہم آہنگ کیجیے۔ کیا زبان کو صرف خالص ہونا چاہیے یا
اسے ابلاغ کرنا چاہیے (جس کا مطلب ہے دوسروں کے ساتھ مشترکہ افہام و
تفہیم پیدا کرنا)"۔

گویا پاکستانی انگریزی دراصل اردو کی طرف گامزن ہے اور وہ دن دور نہیں جب
ہماری متصورہ "اُردش" اس ملک میں راج کر رہی ہوگی۔ اردو بھی وہ نہیں رہے گی جس
کی تدریس اور تبلیغ بڑے زور وشور سے جاری ہے۔ اُردش کے حوالے سے ریاض حسن
(۱۹۸۳ء) اپنے مقالے میں لکھتے ہیں:

"اردو نہ تو اب غالب کے دور کی زبان ہے اور نہ ہوگی کیونکہ بیسویں
صدی نے ٹیکنالوجی اور اعلیٰ تحقیق کے الفاظ کا منہ کھول دیا ہے۔ بلکہ یوں
کہنا چاہیے کہ اردو اور انگریزی کا کچومر سا بن رہا ہے۔ دیدۂ بینا رکھنے والے دیکھ
سکتے ہیں کہ یہ کچومر بن چکا ہے"۔

بوم گارڈنر اور ان کے رفقائے کار کے نزدیک پاکستان میں انگریزی بھی وہ نہیں
جو میکالے کے وقت تھی۔ ثقافتی، نسلی اور مذہبی سیاق و سباق رکھنے والے الفاظ ترجمہ
نہیں ہوسکتے، انھیں بعینہٖ استعمال کیا جائے گا۔ پھر ان سے مرکب الفاظ وضع ہوں گے۔
اردو اور انگریزی کے یہ نئے گینڈے (Genres) دوسرے ملکوں کی طرح نئی اردو اور
نئی انگریزی وضع کر رہے ہیں۔ بلکہ انگریزی اردو میں اور اردو انگریزی میں ڈھل رہی
ہے۔

بپسی سدھوا کا مشہور ناول (The Crow Eaters, 1980) ہے۔ انھوں
نے اپنے ناول کو ایسی ہی دیسی انگریزی میں پیش کیا ہے۔ اس سلسلے میں وہ لکھتی ہیں کہ

انگریزی صرف انگریزوں کی اجارہ داری میں نہیں رہی۔ ہم جو اُن کی سابقہ نو آبادیوں کے باشندے ہیں، ہم نے اس انگریزی کو مار مار کے اپنا بنا لیا ہے۔ انگریز خواہ کچھ بھی کہیں لیکن انگریزی کو اپنا بنانے کے لیے کبھی اس کے سر پر ہتھوڑے مارنا اور کبھی اس کی دم مروڑنا پڑتی ہے۔ جس کے بعد ہی ہم نے اسے نئی صورت، وجود اور اطراف بخشے ہیں۔ اپنی ایسی انگریزی کی وجود کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے انھوں نے زبانوں کے سماجی تداخل کی طرف اشارہ کیا ہے۔ وہ لکھتی ہیں:

"ایک ادیب کی حیثیت سے میں اس بات سے آگاہ ہوں کہ میرے افکار کی فطرت اکثر اور میری تخلیقات کی واقعاتی سمت عام طور پر اس زبان سے متاثر رہتے ہیں جو میں لاشعوری طور پر اپنی سوچ کے عمل میں استعمال کرتی ہوں۔ میرے کرداروں کی بولی بھی اس عمل کو متاثر کرتی ہے۔ پارسی کردار مسلمان، ہندو اور عیسائی کرداروں سے مختلف زبان بولتے ہیں۔ ایسا نہ صرف روایات اور ثقافت کے باعث ہوتا ہے بلکہ اس زبان کے باعث بھی جو وہ بولتے ہیں اور اس روزمرہ کے باعث بھی جو وہ منتخب کرتے ہیں"۔

اس ضمن میں وہ اُردو کی نزاکت بیان کی تحسین کرتے ہوئے لکھتی ہیں کہ ایسی نازک خیالی کو وہ اُردو ہی کے انداز میں لکھ سکتی ہیں۔ کیونکہ قاری تک باریکی اور نزاکت کا ابلاغ کرنا ہی ان کا بنیادی مسئلہ ہے۔ اگرچہ وہ بعض اوقات قوسین میں ایسے الفاظ کا انگریزی ترجمہ بھی لکھ دیتی ہیں۔ لیکن زیادہ تر سیاق و سباق سے اس لفظ کے معنی وضع ہوتے ہیں۔ ان کے خیال میں چپاتی، چارپائی، ریڑھا، ٹانگہ ایسے الفاظ ہیں، جن کا انگریزی میں متبادل ممکن نہیں اور نہ بے جا تشریح درکار ہے کہ اس سے قاری بدک جاتا ہے۔ ان الفاظ کے ذریعے وہ ثقافتی رنگ اور خوشبو بھی پیش کرتی ہیں۔ ایسا ہی کچھ تاثر ۱۹۶۵ء کی جنگ کے حوالے سے کچھ نئے انگریزی ناولوں میں دیا گیا ہے اور مقامی آمیز

انگریزی میں اپنے ادبی جوش و جذبہ کو پیش کیا گیا ہے۔ یہ ثقافتی تنوع برطانوی اور امریکی تحریروں میں بھی ملتا ہے۔ اس لیے ہر علاقے میں دوسری ہی طرح کی زبان وجود میں آتی ہے۔

اس کے علی الرغم شاہین معراج نے پاکستانی اردو کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے اردو اشتہارات میں انگریزی زبان کا تجزیہ کیا ہے اور لکھا ہے کہ شاید ہی کوئی اشتہار ہوگا جو انگریزی سے عاری ہوگا۔ گھریلو اشیاء، کپڑے اور دیگر سامان آرایش، فرنیچر، صابن، پیسٹ، پینٹ، صنعت، مشینیں، سگریٹ، کھیل، ہوائی جہاز، تجارتی ادارے اور بینک غرضیکہ ہر موضوع پر اشتہارات میں انگریزی الفاظ کی بھرمار ہے بلکہ بعض اوقات انھیں رومن حروف ہی میں رہنے دیا جاتا ہے۔ اُنھوں نے ایسے تین چار سو الفاظ کی ایک فہرست بھی مرتب کی ہے اور بعض اردو انگریزی مرکب الفاظ بھی درج کیے ہیں جیسے: "ہونا اور کرنا کے فعل کے ساتھ" الاٹ، بلیچ، بلینڈ، بک، بُرش، چارج، چیک، کنٹرول، ڈیزائن، ایکسپورٹ، فوکس، فیوز، گلیز، لوڈ، نارمل، پیک، پینٹ، پالش، پریس، ریکارڈ، ریپیئر، ریٹائر، رول، شیو، سمارٹ، سٹارٹ، سپلائی، نیٹ، ویلڈ وغیرہ کی آمیزش عام ہے۔ یہ الفاظ اردو میں آئیں یا انگریزی میں جائیں، نتیجہ ان کی آمیزش ہی ہے۔ جسے کل یقیناً کوئی اور نام مل جائے گا، آج ہم اُردش کہہ لیں یا اُنگلش۔ یہ نئی زبانیں بن کر رہیں گی، بن رہی ہیں بلکہ بن چکی ہیں۔

پاکستانی اخبارات کی انگریزی اور اس پر اردو اثرات

ڈاکٹر عبدالحمید خاں

جاوید عثمان شامی

اس ریسرچ پیپر کا بنیادی مقصد پاکستان میں مقامی اور قومی پریس میں چھپنے والی انگریزی زبان کا جائزہ لینا ہے۔ کیونکہ پاکستان میں چھپنے والے انگریزی اخبارات میں بہت سے نئے الفاظ شامل کیے گئے ہیں جو خصوصاً اردو زبان یا مقامی زبانوں سے محاورۃً مستعار لیے گئے ہیں۔ بلاشبہ یہ الفاظ اور فقرے انگریزی زبان ہی میں لکھے جاتے ہیں مگر ایک غیر پاکستانی ان انگریزی الفاظ اور محاوروں کو سمجھنے سے قاصر ہوتا ہے۔ یہ مسئلہ نہ صرف پاکستان میں بلکہ جہاں بھی انگریزی بحیثیت دوسری اہم زبان یا سرکاری زبان کے بولی جاتی ہے، موجود ہے۔ کیونکہ مقامی زبان کے الفاظ اور ان کی ساخت کا اثر بہرحال انگریزی زبان پر محسوس کیا جاتا ہے۔

زبانوں میں ارتقاء ایک قدرتی عمل ہے۔ اسی طرح انگریزی زبان بذات خود ارتقاء پذیر ہے۔ انگریزی زبان میں دوسری اہم زبانوں کی طرح بہت سی تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں اور خصوصاً جدید دور میں جہاں نقل و حرکت اور میڈیا کی وجہ سے یہ تبدیلی اور تیزی سے عمل میں آ رہی ہے۔ سائنسی ترقی سے انگریزی زبان میں کئی نئے الفاظ معرض وجود میں آئے ہیں جبکہ آواز اور انگریزی میں لکھے حروف جو تبدیل نہیں ہوئے

مگر لوگ بولتے ہوئے بہت سی تبدیلیاں لا رہے ہیں۔ نئے تاثرات پیدا کیے جا رہے ہیں۔ پرانے ختم کیے جا رہے ہیں اور تجرباتی طور پر بولنے اور لکھنے میں بھی بہت فرق پیدا ہو رہا ہے۔ اسی طرح نئے لغات بھی اس رجحان میں اہم کردار ادا کر رہی ہیں اس سے زیادہ کیا ہو سکتا ہے کہ دو جدید لغات میں دیئے گئے الفاظ مختلف تلفظ اور معنوں کے حامل ہوتے ہیں اور دونوں لغات کسی ایک بات پر متفق نہیں ہوتیں۔ ایک لغت ایک تلفظ پر زور دیتی ہے تو دوسری کسی اور تلفظ پر۔

انگریزی زبان میں بہت سے الفاظ، تاثرات فرانسیسی، لاطینی اور دوسری زبانوں سے لیے گئے ہیں سب سے پہلا دور انگریزی زبان کی تاریخ میں "قدیم انگریزی دور" کے نام سے جانا جاتا ہے جو کہ ۴۵۰ء سے ۱۱۰۰ء تک ہے۔ انگلستان میں ان صدیوں کے دوران میں نچلے درجے کی جرمن، انگریزی حملہ آور لائے جو اینجل، سیکسن اور جوئس تھے پھر ۸۰۰ء سے ۱۰۵۰ء تک یہاں ڈینیز، نورویگئین اور سویڈش بھی آئے جو نچلے درجے کی جرمن زبان مختلف تلفظ سے بولتے تھے۔ ان تمام لوگوں کے انگلستان میں آنے سے ان کے بہت سے الفاظ اور تلفظ انگریزی زبان میں شامل ہو گئے۔

کسی زبان سے واقف ہونے کے لیے اتنا ہی کافی نہیں ہے کہ ہمیں اس کا تلفظ گرامر یا ذخیرۂ الفاظ پر عبور حاصل ہو بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ ہم اس زبان کے منطقی قوانین، تاثر سے بھی خاصی واقفیت رکھتے ہوں کیونکہ ہر زبان کے اپنے منطقی قوانین ہوتے ہیں اور ان میں بولے گئے محاورے مختلف معنی دیتے ہیں۔ مثلاً یہ چند ایک جرمن محاورے ہیں۔ "Unterviret Augen" جب ہم اس کا انگریزی میں ترجمہ کرتے ہیں تو "Under four eyes" یا "چار آنکھوں کے نیچے"۔ اب اگر دیکھا جائے تو اس کا کوئی واضح مفہوم ظاہر نہیں ہوتا مگر جرمن زبان میں محاورة "face to face" یعنی "آمنے سامنے"۔ دوسری زبان پہلی زبان سے کس قدر مختلف ہوتی ہے اور بعض

اوقات اسے کتنی وسعت کے ساتھ استعمال کیا جاتا ہے جس میں تقریباً تمام شعبہ حیات ہائے زندگی شامل ہوتے ہیں مثلاً سرکاری انتظامات، سیاست، قانون، ادویات، صنعت، کاروبار، اخبارات، عام اشاعت اور تعلیم۔

پاکستان میں انگریزی زبان کی ساخت بہت تبدیل شدہ حالت میں ہے جو کہ برطانوی اسٹینڈرڈ انگلش BSE کے معیار سے بہت کم تر ہے۔ اس کی ایک اہم وجہ یہاں اردو اور انگریزی الفاظ کا ملاپ ہے جنھیں صرف اور صرف پاکستانی سمجھ سکتے ہیں۔ اس بارے میں مسٹر رابرٹ۔ جے۔ بوم گارڈنر نے تفصیل سے ایک میزان شائع کیا ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ مسٹر رابرٹ جے بوم گارڈنر نے پاکستان میں استعمال ہوتے انگریزی کے ایسے الفاظ بھی ایک چارٹ کی شکل میں چھاپے ہیں جنھیں انگریز بھی نہیں سمجھ سکتے۔ مثلاً ٹیکسی (طوائف)، ڈبل روٹی (سینڈوچ)، پَینٹ (پیسٹر آف ٹراوزر)۔

مسٹر رابرٹ نے اپنی بحث سمیٹتے ہوئے کہا ہے "پاکستان میں شائع ہونے والے انگریزی اخبارات کو پڑھنے کے لیے آپ کو اردو محاورے اور پاکستانی انگریزی آنا ضروری ہے مثلاً Baradari (Clan), Wadera (Iand Iord) mela (fair), Kachchi Abadi (Town), Kabbadi (sport), goonda (Thug) اسی طرح کے الفاظ جو یہاں انگریزی اخبارات میں شائع ہوتے ہیں ان میں سیاست، سرکاری انتظامات، خوراک، فن اور دوسرے شعبہ جات بھی شامل ہیں۔ نہ صرف اردو زبان کے الفاظ اور محاورے انگریزی زبان میں داخل کیے گئے ہیں بلکہ فارسی اور عربی کے محاورے اور الفاظ بھی شامل کر دیئے گئے ہیں مثلاً Namaz (Prayer), Jehad (Holy war), Inshallah (god wishes), a Woman was condemned to rejim (stoning to death), Zaqat (Islamic due).

پاکستان میں انگریزی زبان کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ یہاں بعض الفاظ سے پہلے اپنی مرضی سے کچھ حصہ (affixes) لگا لیا جاتا ہے۔ مثلاً "De" جیسے de-nationalize, de-shape, de-load, de-notify اسی طرح اپنی مرضی سے (Suffixes) یا بعد کا حصہ لگا لیا جاتا ہے جو عموماً "er", "ee" یا "ism" ہوتا ہے اور اکثر اردو الفاظ سے ملا کر انگریزی میں لکھ دیا جاتا ہے مثلاً Bhuttoism, Ziaism, Loaism, Mullahism, goondaism ایک اور مثال "A policy of ad-hocism and stop-gapism has been followed with respeet to Azad Kashmir".

پاکستان میں شائع ہونے والے انگریزی اخبارات انگریزی کے بین الاقوامی اصولوں کی خلاف ورزی کرتے ہوئے غلطیاں کرتے ہیں مثلاً "Regularisation of Adhocees".

انگریزی زبان میں شائع ہونے والے پاکستانی اخبارات میں گرامر، لغت، حرف اضافت، معروف و غیر معروف، جزو جملہ کی بے شمار غلطیاں ہوتی ہیں۔ بعض اوقات اردو کے کئی محاورے ویسے کے ویسے ہی لکھے دیئے جاتے ہیں جس کی وجہ سے پاکستان میں شائع ہونے والے انگریزی اخبارات کے بارے میں ایک خاص رائے معرض وجود میں آتی ہے۔ مثلاً اردو زبان میں کہا جاتا ہے کہ "خالصتاً سیاست دان" کو انگریزی میں بھی ایسے ہی لکھ دیا جاتا ہے (A true-blooded Politician) جب کہ انگریزی زبان میں صرف (A genuine politician) ہی قابل فہم ہے۔ اسی طرح (They opposed his comming back) یعنی "انھوں نے اس کی واپسی مخالفت کی" جبکہ انگریزی دان، اسے تب سمجھیں گے جب لکھا جائے (They opposed his returning) اسی طرح سے۔ "افواہیں" پہنچ رہی تھیں۔ انگریزی اخبارات میں

بھی ایسے ہی لکھ دیا جاتا ہے۔ (Rumouers were reaching) حالانکہ انگریزی زبان میں ہونا چاہیے (Information was following)۔

ڈاکٹر طارق رحمان پاکستان کے ایک مشہور زبان داں ہیں۔ انھوں نے پاکستان میں سرزد ہونے والی انگریزی کی غلطیوں کی درجہ بندی کی ہے۔ خصوصاً جب پاکستانی لوگ انگریزی بولتے یا لکھتے وقت جس قسم کی غلطیاں کرتے ہیں۔ درجہ "الف" میں وہ انگریزی ہے جسے "اینگلی سائز" انگریزی کہا گیا ہے۔ یہ برطانوی اعلیٰ معیار BSE سے ملتی جلتی ہے۔ درجہ "ب" میں کہیں کہیں معروف و غیر معروف جزو جملہ کی غلطی ہوتی ہے یعنی (The error of defnite or indefnitie article) جبکہ درجہ "ج" نیں درمیانی قسم کی انگریزی لکھی اور بولی جاتی ہے جس میں گرائمر، لغت، حرف اضافت کی غلطیاں ہوتی ہیں۔ اس سے نچلے درجے کی ایک اور انگریزی بھی ہے جس میں فاعل اور فعل کے درمیان مناہمت نہیں ہوتی۔ حرف اضافت غائب ہوتا ہے۔ اسم سے پہلے جزو جملہ نہیں ہوتا اور زمانے کے استعمال میں قطعاً لاپروائی برتی جاتی ہے۔

پاکستان میں بولی اور لکھی جانے والی انگریزی کو ڈاکٹر طارق رحمان کی درجہ بندی سے بھی زیادہ درجوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے اور اس کی کئی وجوہات ہیں۔ اول علاقائی اور قومی زبانیں انگریزی زبان کے تلفظ اور گرائمر پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ انگریزی زبان اور پاکستان کی علاقائی اور قومی زبان کی گرائمر بالکل ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ مثلاً انگریزی زبان میں ہم کہتے ہیں "He drinks water"۔ پہلے فاعل آیا پھر فعل اور آخر میں مفعول جبکہ اردو میں "وہ پانی پیتا ہے" پہلے فاعل پھر مفعول اور بعد میں فعل آتا ہے۔ اردو زبان اور انگریزی زبان میں ایک اور اہم فرق یہ ہے کہ اردو میں حرفِ اضافت (Preposition) صرف دو ہیں "میں" اور "پر"۔ اردو زبان میں گفتگو کرتے ہوئے عموماً یہ دونوں حروفِ اضافت کا استعمال کرتے ہیں جبکہ انگریزی زبان میں حروف

اضافت لاتعداد ہیں مثلاً Under, upon, within, onto, above, of, in, on, to, at, with, from, into وغیرہ وغیرہ۔ اس لیے انگریزی زبان کے استعمال میں اکثر پاکستانی حرف اضافت کی غلطیاں کرتے ہیں۔

پاکستان میں انتخابات کے موقع پر پاکستان انگریزی اخبارات سیاسی میدان میں کئی نئے الفاظ اور اصطلاحات متعارف کراتے ہیں۔ خصوصاً جب بعض پاکستانی انگریزی اخبارات کارٹون شائع کرتے ہیں تو ان کے ساتھ دی گئی عبارت عموماً غیر پاکستانیوں کو بالکل سمجھ نہیں آتی۔ مثلاً (Pre. Polls Dharnaas, Zalmoo Qazi pher aa raha hae).

اخبارات اور جرائد ہمیشہ سے ایک خاص ثقافت کے زیر اثر ہوتے ہیں اور بہت سے الفاظ سیاسی سرگرمیوں کی تصویر کشی کرتے ہیں۔ بعض اوقات سیاستدان اپنی ہمدردیاں تبدیل کر لیتے ہیں جو بدلتی ہوئی ملکی سیاست میں اہم کردار ادا کرتے ہیں یا پھر اپنے ذاتی مفادات کو مد نظر رکھتے ہیں۔ جو سیاستدان ابن الوقت ہوتے ہیں انھیں صحافت میں "لوٹا" کہا جاتا ہے۔ یہ ایک ایسا برتن ہے جو بیت الخلاء میں استعمال ہوتا ہے اور کسی کی ملکیت نہیں ہوتا۔ اسی طرح بعض سیاستدان اپنے ذاتی مفادات کے لیے خفیہ طریقوں سے برسرپیکار رہتے ہیں۔ پریس انہیں خصوصی اہمیت کے لوٹے یا (Potential lotas) کہتی ہے۔ اس طرح پریس بہت سے نئے سیاسی محاورے، الفاظ اور ان کے مرکبات انگریزی زبان میں ویسے کے ویسے شائع کر دیتی ہے۔ مثلاً "Political axes"۔

ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ کئی الفاظ، محاورے اردو زبان سے پاکستانی انگریزی زبان پر اثر انداز ہوتے ہیں لیکن ہماری یہ مجبوری بھی ہے۔ یہ اردو ماخذ کے الفاظ جو ہم ہر روز پاکستان انگریزی اخبارات میں دیکھتے ہیں ہماری روایات اور ثقافت کا حصہ بن

چکے ہیں اور وقت کے ساتھ ساتھ ان میں اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ پاکستان قاری اردو اور انگریزی کے مرکب کو بہت شوق سے پڑھتے ہیں اور وہ ان مخصوص الفاظ اور محاوروں سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔

لیکن یہ زبان دانی کے لحاظ سے بہتر نہیں ہے کیونکہ اس کا سب بڑا نقصان یہ ہے کہ ہمارے ہاں انگریزی زبان کا معیار دن بدن گرتا جا رہا ہے۔ غیر ملکی ہمارے کالم، مضامین کو سمجھنے سے قاصر ہوتے ہیں بعض اوقات ہم بین الاقوامی طور پر اپنا مدعا بیان کرنے میں ناکام رہتے ہیں۔

حصہ سوم

پاکستانی اُردو اور پاکستانی زبانیں

اردو اور پاکستانی زبانیں

ڈاکٹر فرمان فتحپوری

زبان انسان کی سماجی اور معاشرتی ضرورتوں کی ایجاد ہے۔ ہر زبان اپنی ارتقائی منزلیں سماجی زندگی ہی کے سہارے طے کرتی ہے اور اس کے زیر اثر اس کی صورت اور معنی میں تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں۔ کسی زبان کے عروج و زوال کی داستان کو دراصل کسی قوم کے عروج و زوال کے تاریخ سمجھنا چاہیے۔ بات یہ ہے کہ زبان بھی اپنے بولنے والوں کی طرح اپنے سماجی محرکات و عوامل کی پابند ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں جس طرح افراد یا کسی قوم و ملک کے لیے ضروری ہے کہ وہ نہ صرف اپنے ہمسایہ ملکوں یا قوموں سے بلکہ دور دراز کے ملکوں اور قوموں سے بھی زیادہ سے زیادہ تعلقات و روابط قائم کرے۔ بالکل اسی طرح کسی زندہ زبان کے لیے بھی ضروری ہے کہ دوسری زبانوں سے اس کا ربط و ضبط بڑھتا رہے اور ایک دوسرے سے اخذ و استفادہ اور ترجمے کی راہیں کشادہ ہوتی رہیں۔ اس کے بغیر نہ کوئی قوم بین الاقوامی مسائل میں اپنا کردار ادا کر سکتی ہے اور نہ کوئی زبان۔ اس لیے زبانوں کا ایک دوسرے سے استفادہ کرنا ناگزیر ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ دنیا کی ترقی سے ترقی یافتہ زبان بھی اس بات کا دعویٰ نہیں کر سکتی کہ وہ دوسری زبانوں کے اثرات یا الفاظ سے یکسر خالی ہے۔ اردو زبان بھی اس قانون فطرت سے مستثنیٰ نہیں ہے بلکہ اس کی تو بنیاد ہی آس پاس کی مختلف زبانوں یعنی پنجابی، ہندی، خروشتی، سندھی، پشتو، بلوچی اور سرائیکی وغیرہ کے اشتراک پر رکھی گئی ہے۔ بعد میں اس نے عربی، فارسی، انگریزی اور ترکی کے بھی بے شمار الفاظ اپنے اندر جذب کر لیے اور آج وہ اپنے مزاج اور اپنی ساخت کے لحاظ سے زبانوں کی ایک ایسی انجمن ہے جس میں شرکت کے دروازے ہر زبان کے الفاظ پر یکساں کھلے ہوئے ہیں

خاص طور پر ہندوستانیوں اور پاکستانیوں کے لیے اردو کی سبھا ایک ایسی سبھا ہے جس میں ہر علاقے کے بول صاف پہچان میں آجاتے ہیں اور ہر شخص کلی طور پر نہ سہی جزوی طور پر یہ ضرور محسوس کرنے لگتا ہے کہ اردو کا خمیر جس مسالے سے تیار کیا ہوا ہے اس میں بعض اجزاء اس کے علاقے کے بھی شامل ہیں۔ جزو اور کل کا یہ تعلق معمولی نہیں غیر معمولی ہے۔

اردو اور علاقائی زبانوں کا رشتہ دراصل ایک ہی خون، ایک رنگ و نسل، ایک ہی آسمان، ایک ہی زمین، ایک انداز فکر اور ایک ہی طرز ادا کا رشتہ ہے، دور حاضر سے لے کر قدیم تر زمانے تک سراغ لگاتے چلے جائیے، یہ رشتے پوری طرح واضح ہوتے چلے جائیں گے۔ صاف اندازہ ہو جائے گا کہ اردو اور علاقائی زبانیں ایک دوسرے کی حریف و رقیب نہیں بلکہ عزیز و رفیق ہیں۔ یہ بھی صحیح نہیں کہ ان میں ماں بیٹی کا رشتہ ہے۔ وجہ یہ ہے کہ نہ تو اردو نے کسی علاقائی زبان کے پیٹ سے جنم لیا ہے اور نہ کوئی علاقائی زبان اس کے بطن سے پیدا ہوئی ہے۔ لسانی نقطۂ نظر سے ایسا ممکن بھی نہیں ہے۔ زبان سے زبان جنم نہیں لیتی بلکہ سماجی، علاقائی اور معاشرتی ضرورتوں سے کبھی ایک اور کبھی بہ یک وقت کئی زبانیں وجود میں آجاتی ہیں۔ ہندوستانی اور پاکستانی علاقے کی صورت حال بھی یہی ہے یعنی اردو اور دوسری علاقائی زبانیں ایک ہی ماں کی بیٹیاں ہیں۔ ایک ہی قسم کے ماحول میں انھوں نے یکے بعد دیگرے جنم لیا ہے اور ایک ہی قسم کی فضا میں پروان چڑھی ہیں۔ ان میں جو مشابہت اور مماثلت نظر آتی ہے وہ اسی خاص رشتے کے سبب سے ہے۔ اردو کے بارے میں ایک غلط فہمی کو بہت ہوا دی گئی ہے وہ یہ کہ اردو کا رشتہ مقامی یا علاقائی زبانوں سے اتنا استوار نہیں جتنا کہ بعض بیرونی زبانوں سے ہے۔ یہ بات کسی نقطۂ نظر سے بھی صحیح نہیں ہے۔ اردو کا صوتی نظام، اس کے جملوں کی ساخت، قواعد کے بیشتر اصول اور بول چال کا لب و لہجہ، سب پر مقامی اثرات کا غلبہ ہے۔ اردو کے بعض علمی اور ادبی شعبوں پر یقیناً فارسی اور عربی کا گہرا اثر ہے لیکن اس اثر و تاثیر کا تعلق اردو زبان کے مزاج یا باطن سے نہیں ہے بلکہ

اس لی اوپری سطح سے رہا ہے۔ اردو شاعری نے وزن، بحر اور بعض اصناف سخن یقیناً عربی فارسی سے لی ہیں، لیکن اپنے اثر، لب و لہجہ اور موضوع کے اعتبار سے اردو کا رنگ و آہنگ عربی فارسی سے بہت الگ رہا ہے۔ حتیٰ کہ اس علاقے میں عربی و فارسی میں بھی جو کچھ لکھا گیا ہے اسے بھی سبک ہندی کا نام دیا گیا ہے۔ ایسی صورت میں یہ کہنا کہ اردو پر عربی و فارسی کے اثرات، مقامی زبانوں کے اثرات سے قوی تر ہیں، صحیح نہیں ہے۔ اردو زبان کا مزاج شروع ہی سے مقامی یا دیسی رہا ہے، اس نے عربی، فارسی، ترکی اور انگریزی سب سے حسب ضرورت فائدہ اٹھایا ہے اور باہر کی زبانوں کے بے شمار الفاظ اپنے اندر جذب کر لیے ہیں، لیکن یہ انجذاب، کیفیت کے اعتبار سے ہمیشہ علاقائی یا مقامی زبانوں سے متاثر رہا ہے۔

اس سلسلے میں ایک اور بات قابل توجہ ہے کہ اردو میں جو الفاظ دوسری زبانوں سے آئے ہیں وہ صرف اسماء تک محدود ہیں۔ ایک وقت تھا کہ مختلف علوم و فنون کے بہت سے اسماء عربی فارسی سے لیے گئے تھے۔ آج ریڈیو، ٹی وی، ہوائی جہاز اور دوسری مشینوں کے توسط سے بے شمار الفاظ انگریزی سے آگئے ہیں۔ ان الفاظ سے صرف پڑھے لکھے لوگ ہی نہیں ایک معمولی مکینک، بلکہ ٹیکنیکل اداروں کا مزدور بھی خوب واقف ہے لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ اردو میں دخیل الفاظ کا یہ سلسلہ صرف اسماء تک محدود رہا ہے۔ دوسرے قسم کے الفاظ یعنی فعل و حرف (Verbpreposition) وغیرہ سارے کے سارے مقامی ہیں۔

اسماء کے سلسلے میں بھی ایک وضاحت ضروری ہے کہ عربی و فارسی کے جو الفاظ مستعمل ہیں ان میں بھی بیشتر کا تعلق مخصوص سطح کی علمی و ادبی زبان سے ہے۔ روزمرہ کی گفتگو میں خواہ اس گفتگو کا تعلق عام آدمیوں سے ہو یا خاص سے زیادہ تر مقامی الفاظ ہی استعمال ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر شکم، انگشت، چشم، گوش اور دست کے الفاظ ہی کو لے لیجیے۔ یہ فارسی سے آئے اور اردو میں مستعمل ہیں لیکن ان کا مصرف صرف علمی اور ادبی زبان میں ہوتا ہے۔ روزمرہ کی بات چیت میں عوام و خواص سب شکم کی جگہ پیٹ، انگشت

کی جگہ انگلی، چشم کی بجائے آنکھ اور گوش کی جگہ کان اور دست کے بجائے ہاتھ کے الفاظ کا استعمال کرتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ اس قسم کے الفاظ اردو میں مفرد بولے ہی نہیں جاسکتے۔ ان کو استعمال کرنے کے لیے انھیں اسی قسم کے دوسرے الفاظ سے مرکب کرنا پڑتا ہے جیسے شکم سیر، انگشت بدنداں، گوش و ہوش، چشم عبرت اور دست کرم وغیرہ۔ ظاہر ہے اس قسم کے مرکبات کی تخلیق اور ان کا استعمال ہر شخص کے بس کی بات نہیں ہے۔ پھر یہ بھی ہے کہ اردو نے عربی و فارسی یا انگریزی و ترکی سے جو اسماء لیے ہیں، ان میں سے جو اردو کے مزاج کے موافق نہیں تھے انھیں خراد پر چڑھا کر مزاج کے موافق بنا دیا گیا ہے۔ راونٹر اور لکشمنٹر، اردو میں راون اور لچھمن ہوگئے ہیں۔ آرڈرلی کو اردلی کر لیا گیا ہے۔ میچ باکس کو ماچس، ہاسپٹل کو اسپتال، فبرواری کو فروری اور مے کو مئی بنا دیا گیا ہے۔ عربی کے سید جید، سیدھے سادھے، سید جید ہوگئے ہیں، یہی حال، بے شمار عربی، فارسی اور سنسکرت سے آنے والے لفظوں کا ہے۔ تارید یا اردو بنالینے کا یہ عمل صرف تلفظ تک محدود نہیں بلکہ الفاظ کے معنی، املا، واحد، جمع اور تذکیر و تانیث کے اصول سبھی میں اس طرح کا تصرف کیا گیا ہے۔ حروف تہجی سے لے کر الفاظ کی ساخت، جملوں کی بناوٹ، صرف و نحو کے قاعدے، الفاظ کے استعمال اور فصاحت و بلاغت تک سب میں اردو کا اپنا ایک منفرد اسلوب اور مخصوص لب و لہجہ ہے۔ وہ کسی بیرونی زبان کی مقلد یا تابع نہیں ہے۔ اس لیے یہ خیال کرنا کہ اردو کا تعلق کسی بیرونی زبان سے ہے یا اس کی جنم بھومی علاقائی زبانوں سے الگ کہیں اور ہے کسی طرح درست نہیں ہے۔ اردو نے بھی اسی سرزمین میں جنم لیا ہے۔ اس لحاظ سے بھی بدیسی نہیں علاقائی کہنا چاہیے۔ یہ ضروری ہے کہ اردو کے اثر و نفوذ کا علاقہ، علاقائی زبانوں کے مقابلے میں بہت بڑا ہے۔ اس کی یہی بڑائی اردو کو دوسری علاقائی زبانوں یعنی ہندی، سندھی، بلوچی اور پشتو وغیرہ سے بڑا بنا دیتی ہے۔ اس بڑائی پر اردو کو فخر کرنے اور علاقائی زبانوں کو رشک کرنے کا حق ہے۔ لیکن اس فخر و رشک کی بنیاد نفرت و تعصب پر نہیں، اخوت اور محبت پر ہونی چاہیے۔

میں نے ابھی عرض کیا تھا کہ اردو اور دوسری علاقائی زبانوں کی جنم بھومی ایک ہی ہے۔ اردو، بلوچی، سندھی، پنجابی، پشتو، سرائیکی، سب ایک ہی قسم کی تہذیبی زندگی، ایک ہی قسم کی معاشرت اور ایک ہی قسم کی آب و ہوا کی زائیدہ اور پروردہ ہیں۔ ان کے ظاہری خدوخال ایک دوسرے سے کچھ الگ سہی، لیکن بباطن وہ ایک دوسرے سے بہت قریب ہیں۔ ان سب کی روحوں پر اسلامی تہذیب و تمدن اور صوفیائے کرام کے احساس کا سایہ ہے۔ ان کے سرمایۂ علم و ادب اور مزاج و اسلوب میں بھی ایسی قدریں مشترک ہیں کہ وہ ایک دوسرے سے قریب تر ہوتی چلی جا رہی ہیں۔ لیکن افسوس کی بات ہے کہ بعض مفاد پرست حلقوں کی طرف سے اردو اور علاقائی زبانوں کو ایک دوسرے سے الگ رکھنے اور انھیں ایک دوسرے کی حریف و رقیب ثابت کرنے کی شعوری کوشش کی جا رہی ہے۔ یہ کوشش چونکہ ساری زبانوں کے حق میں غیر مفید اور غیر فطری ہے اس لیے کامیاب نہ ہوگی۔ علاقائی زبانیں اردو سے بہت کچھ لے رہی ہیں اور اردو پر علاقائی زبانوں کی اثر پذیری کی رفتار بھی روز بروز تیز ہوتی جا رہی ہے۔

اردو اور علاقائی زبانوں کو باہم ملنے جلنے اور ایک دوسرے سے قریب تر آنے کا موقع دراصل جمہوری نظام نے دیا ہے جس میں عوام خود اپنی تقدیر کے خالق و مالک اور حکمران، عوام کی خواہشوں کے تابع بنتے جا رہے ہیں۔ یوں بھی زبانوں کے ارتقاء کی راہ میں کسی فرد یا ادارے کی حاکمیت کبھی حائل نہیں ہو سکتی۔ زبانوں کا تاریخی مطالعہ ظاہر کرتا ہے کہ دنیا کی ہر زبان میں زندگی کے تقاضوں کے مطابق برابر تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ اس کا لب و لہجہ عہد بہ عہد بدلتا رہتا ہے۔ بہت سے الفاظ متروک و مردہ ہوتے رہتے ہیں۔ ان کی جگہ نئے جاندار الفاظ خود بخود جگہ پا جاتے ہیں۔ یہ سارا عمل عوامی سطح پر انجانے طور پر ہوتا ہے۔ زبان کی تراش خراش اور حذف و اضافہ میں کسی خاص شخص، گروہ یا علاقے کی حاکمیت کو زیادہ دخل نہیں ہوتا۔ کہا جاتا ہے کہ ناسخ نے بعض الفاظ متروک قرار دیئے تھے اور اپنے شاگردوں کے

ذریعے ایک طرح کی تحریک بھی چلائی تھی لیکن یہ تحریک چونکہ غیر فطری تھی اس لیے کامیاب نہ ہو سکی۔ حتیٰ کہ جن الفاظ کو انھوں نے متروک قرار دیا تھا ان میں سے کئی لفظ خود ان ہی کے کلام میں لاشعوری طور پر داخل ہو گئے۔ دوسروں پر تو اس کا بہت ہی کم اثر ہوا، شہنشاہوں کی طرف سے شراب کو رام رنگی اور سنترہ کو رنگترہ کہنے کا حکم صادر ہوا لیکن عوام نے اسے پسند نہ کیا۔ پاکستان کے سابق صدر محمد ایوب خاں مرحوم نے صبح شام ریڈیو سے نشر کرایا کہ مغربی پاکستان کو پچھمو پاکستان اور مشرقی پاکستان کو پوربو پاکستان کہا جائے لیکن کسی نے ایک نہ سنی۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ زبان پر کسی کی اجارہ داری اور حکمرانی کبھی قائم نہیں رہ سکتی۔ آج کے جمہوری دور میں جیسے جیسے ایک عام شہری کی وزیر اعظم سے، ایک باری کی زمیندار سے، ایک مزدور کی کارخانے کے مالک سے اور ایک کسان کی جاگیر دار سے ملاقات کرنے کے امکانات روشن ہوتے جا رہے ہیں۔ ویسے ویسے اردو اور علاقائی زبانوں کے ملاپ اور باہم اشتراک کی راہیں بھی ہموار ہوتی جا رہی ہیں۔ علاقائی زبانوں کا حلقۂ اثر بڑھ رہا ہے۔ ان کے ذخیرۂ الفاظ، موضوعات اور اسالیب بیان سب پر اردو کا اثر بہت نمایاں نظر آ رہا ہے۔ اردو پر بھی علاقائی زبانوں کے اثرات پوری طرح رونما ہو رہے ہیں۔ اس کے اسلوب اور لب و لہجہ میں خاصی تبدیلی آ چکی ہے۔ یہ تبدیلی کسی کو گوارا ہو یا ناگوار عوام کی حاکمیت اس کی پروا نہیں کرتی۔ سمجھنے کی بات صرف اتنی ہے کہ زبان اور اس کے لہجے میں عہد بہ عہد اور مقام بہ مقام تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں اور یہی تبدیلیاں جب قبول عام حاصل کر لیتی ہیں تو معیاری زبان کا جزو بن جاتی ہیں۔

اردو زبان موجودہ سماجی زندگی اور علاقائی زبانوں کے زیر اثر کیا رنگ و روپ اختیار کر رہی ہے۔ اس کا اندازہ کرنے کے لیے چند جملے دیکھیے۔

۱۔ اس نے آج بہت بور کیا۔

۲۔ حامد کی تقریر نے جلسے میں بے سبب بوریت پیدا کر دی۔

۳- آیا دلا کہیں کا۔

۴- میں آپ کی دادا گیری نکال دوں گا۔

۵- اس نے خواہ مخواہ پھڈا کھڑا کر دیا ہے۔

۶- ایک روپے کا کھلا چاہیے۔

۷- اس جگہ محمود کے بازو میں حامد کی دکان ہے۔

۸- کاغذ کے بیوپاری نے کہا مال خلاص ہو گیا۔

۹- اس نے ایک بیان داغ دیا اور کہا سیاست میں سب چلتا ہے۔

ان جملوں میں بور، بوریت، دلا، دادا گیری، پھڈا، کھلا، بازو، خاص اور چلتا ہے، ایسے الفاظ ہیں جو آئے دن سنے اور بولے جاتے ہیں۔ اب محض اس بنا پر کہ یہ الفاظ اردو میں پہلے سے موجود نہ تھے یا فلاں علاقے اور فلاں طبقے میں استعمال نہیں ہوتے، کون ہے جو انہیں مردود قرار دے گا۔ ان الفاظ نے معاشرتی زندگی میں پوری طرح جڑ پکڑ لی ہے اور اب انھیں عام و خاص سبھی استعمال کر رہے ہیں۔ نئے الفاظ کے ساتھ ساتھ پرانے الفاظ بھی نئے معنوں کے ساتھ اردو میں جگہ پا رہے ہیں۔ چند جملے دیکھیے:۔

۱- جلد بازی کی ضرورت نہیں ہے تسلی سے کام کرو۔

۲- آرام آرام سے چلو ورنہ ٹھوکر کھا کر گرو گے۔

۳- میرا دوست آج کل فلاں جگہ کمشنر لگا ہوا ہے۔

۴- آپ نے بہت کم کھایا کچھ اور لیجیے۔

۵- محمود صاحب آپ کو ساتھ والے کمرے میں مل جائیں گے۔

ان جملوں میں تسلی، آرام، کمشنر لگا ہوا ہے، اور لیپیے اور ساتھ والے کمرے میں، کے الفاظ و فقرات پر غور کرنے سے اندازہ ہوگا کہ وہ اپنے معنی کس طرح بدل رہے ہیں۔ اس طرح کے اور نہ جانے کتنے الفاظ و فقرات اور محاورات و اسالیب ہیں جو مقامی زندگی اور علاقائی زبانوں کے زیر اثر اردو کو نیا رنگ روپ دے رہے ہیں۔ یہی صورت علاقائی زبانوں کی ہے۔ اردو کی معرفت ان کا دامن وسیع سے وسیع تر اور ان کا سرمایہ وقیع سے وقیع تر بنتا جا رہا ہے۔

باہم اخذ و استفادے کا یہ نیا سلسلہ چونکہ آزادانہ ماحول میں شروع ہوا ہے اس لیے یقین ہے کہ کسی طبقے کی اجارہ داری اب زیادہ عرصے تک باقی نہ رہے گی۔ ضرورت اس کی ہے کہ علاقائی زبانیں اور اردو اپنے باہمی رشتوں کو سمجھیں اور اپنے اپنے منصب کو پہچانیں۔ ساری علاقائی زبانیں اپنی اپنی جگہ اہم ہیں اور ان سب کا اپنا اپنا حلقۂ اثر ہے لیکن ان کا یہ حلقۂ اثر اپنے اپنے علاقے تک ہی محدود ہے۔ اس کے برعکس اردو ہر علاقے اور ہر خطے میں بولی اور سمجھی جاتی ہے اس کا علمی اور ادبی سرمایہ بھی علاقائی زبانوں کے مقابلے میں زیادہ ہے اس لیے اسے پاکستان میں قومی زبان کا درجہ دیا گیا ہے۔ ہندوستان میں بھی کم از کم دوسری سرکاری زبان کی حیثیت سے اردو کو یہی مقام ملنا چاہیے کہ یہی زبان عموماً زیادہ بولی اور سمجھی جاتی ہے۔

قومی زبان کسی خاص علاقے یا گروہ کی زبان نہیں پوری قوم اور پورے ملک کی زبان ہوتی ہے۔ اس لیے اس پر پشاور سے لے کر کراچی تک سب کا یکساں حق ہے۔ اردو کا تصادم کسی علاقائی زبان سے نہیں بلکہ انگریزی زبان سے ہے۔ اس کا حق علاقائی زبانیں نہیں انگریزی زبان غصب کر رہی ہے۔ ملک آزاد ہو گیا، انگریز کی غلامی سے قوم نجات پا گئی لیکن انگریزی کی غلامی سے نجات اب تک نہیں مل سکی۔ جب تک قوم و ملک کو اس غلامی سے نجات نہ مل سکے گی اردو اور علاقائی زبانیں سب حبس بے جا میں رہیں گی۔ ان کا دم گھٹتا رہے

گا اور زبانوں کے دم گھٹنے کا صاف مطلب یہ ہے کہ ان زبانوں کے بولنے والے حقیقی معنوں میں کبھی اس ملک میں آزادی کا سانس نہیں لے سکیں گے۔ اس لیے اردو، سندھی، پنجابی، بلوچی، پشتو اور سرائیکی بولنے والوں کو اپنے اصل دشمن کو پہچاننا چاہیے۔ انہیں ایک دوسرے کے خلاف نہیں بلکہ انگریزی کے خلاف آواز بلند کرنی چاہیے۔ جب تک اس سلسلے میں متحد کوششیں نہ کی جائیں گی ہمارے فروعی اختلافات کو بہانہ بنا کر انگریزی ہم پر مسلط رکھی جائے گی۔ اس تسلط بے جا سے قومی زبان کو بھی نقصان پہنچے گا اور علاقائی زبانوں کو بھی۔ یہ وقت آپس میں لڑنے کا نہیں انگریزی کی بندر بانٹ سے جان چھڑانے کا ہے۔

پاکستانی اردو اور بلوچستان

ضیاء الرحمٰن

اصل موضوع کے مختلف پہلو اجاگر کرنے سے قبل قارئین کی رہنمائی کے لیے چند توضیحات پیش خدمت ہیں۔ اولاً نولفظیت، لفظ سازی، مرکبات، روزمرہ، محاورہ، تشبیہات، استعارات، ضرب الامثال اور تسمیہ کی جو مثالیں اس مضمون میں فراہم کی گئی ہیں، وہ اپریل ۱۹۹۶ء تک شائع ہونے والی مختلف اصناف نظم و نثر سے تلاش کی گئی ہیں۔ ثانیاً مثالوں کی فہرست کو "کم از کم" کے زمرے میں شمار کیا جانا چاہیے کیونکہ تلاش کے عمل میں، کوشش کے باوجود مواد اور مثالوں کا صرف نظر ہو جانا عین ممکن ہے۔ ثالثاً مضمون کے لیے مواد کی فراہمی میں صرف مطبوعہ مثالوں ہی پر اکتفا کیا گیا ہے۔ لہٰذا بلوچستان میں عام بول چال کی اردو کا تجزیہ اس مضمون میں شامل نہیں ہے۔ رابعاً فراہم کردہ مثالیں صرف بلوچستان کے لکھنے والوں کی تحریروں سے تلاش نہیں کی گئی ہیں بلکہ پاکستان کے دیگر علاقوں کے شعرا اور نثر نگاروں کی نگارشات سے بھی حاصل کی گئی ہیں جن میں پاکستان کے معروف قلم کاروں کے فن پارے بھی شامل ہیں۔ خامساً اس مضمون کا اصل مقصد اس حقیقت کو واضح کرنا ہے کہ پاکستانی اردو اور اس کے ادب کو متشکل کرنے میں بلوچستان کے جغرافیائی خدوخال، تاریخ اور ثقافتی عوامل کا حصہ قابل ذکر ہی نہیں، قابل قدر بھی ہے۔

قیام پاکستان کے بعد ہی سے پاکستان کے مختلف علاقوں میں اردو زبان و ادب نے مقامی ثقافتوں کی رنگ آمیزی کو قبول کرنا شروع کر دیا تھا۔ ان اثرات میں پرورش پانے والی اردو کو "پاکستانی اردو" کہا گیا، جو قیام پاکستان سے قبل برصغیر میں

اردو کے اہم مراکز میں بولی اور لکھی جانے والی اردو کی نسبت اپنی اٹھان کے اعتبار سے بڑی حد تک مختلف تو ہے تاہم یہ اسی گنگا جمنی اردو ہی کا ایک تسلسل ہے جو ماضی کی روایات کو ساتھ لیے پاکستانی و علاقائی ثقافتوں، علاقائی زبانوں اور بولیوں سے استفادہ کرکے اپنی الگ شناخت کا موجب بنی ہے۔ یہ عمل نہ صرف اردو زبان و ادب کو تازہ خون فراہم کرنے کا باعث ہوا ہے بلکہ بحیثیت زندہ زبان اردو کے روشن مستقبل کی دلیل بھی ہے۔

بلوچستان اگرچہ علمی و ادبی خدمات کے اعتبار سے پاکستان کے دوسرے صوبوں کا ہم پلہ نہیں سمجھا جاتا لیکن پاکستانی اردو کی تشکیل میں اس خطے نے اپنے قد کاٹھ سے کہیں زیادہ حصہ لیا ہے۔ نو لفظیت کا جائزہ لیا جائے تو اردو افسانے میں مقامی زبانوں (بلوچی، براہوی اور پشتو" نرم لہجے کی قندھاری پشتو") کے الفاظ کی طویل فہرست مرتب کی جا سکتی ہے، جو اردو میں اپنے اصل مفہوم میں استعمال ہوئے ہیں جیسے اسپان (آٹے کی بڑی مشک)، ایرت گوات (سرد مغربی ہوا)، ایزک (دہی، لسی کی مشک)، ایلم (بھائی)، ایلوگ (کانٹا)، ایلی دھند (کلمہ استعجابیہ)، باشت (تکیہ)، باہوٹ (زیر پناہ)، بزگر (کسان)، بوبٹ (کانٹا)، بوگڑے (بھنے ہوئے چنے)، پلارا (باپ، باپ کو مخاطب کرنا)، پوخ (پختہ)، پیش (ایک جھاڑی جس کے پتے پام جیسے ہوتے ہیں)، تربور (چچازاد، تایازاد بھائی)، ترڑو (مخصوص قسم کی کشیدہ کاری سے مزین زنانہ لباس)، تبئی (تمہارا)، ٹکری (زمین دار)، ٹوپک (بندوق)، ٹول (تمام)، چاوٹ (چپل)، چبر (کانٹا)، چرت (غور و فکر، توجہ)، خواہ (پانی کی مشک)، خیساری (پروائی)، خیری (مردوں کے کندھے پہ پڑی چادر)، ڈنی (غیر مقامی)، زباد (خوشبو)، زک (گھی کی مشک)، سرنا (شنائی)، سورگز (بید مجنوں)، سرگوات (پروائی)، سندرے (گیت)، شلمبے (لسی)، شنے (سبز روغنی چھلکے والا چنے کے برابر جنگلی پھل جسے بلوچستان کے لوگ بڑی رغبت سے کھاتے

ہیں)، شواست (گھول کر پیا جانے والا تعویز)، شیب (چھوٹی ندی، اندازاً پانچ میل لمبی)، شین (سبز)، صنامن (بیٹا)، غر (پہاڑ)، کاریز (زیر زمین جڑے ہوئے کنویں، آب پاشی کا قدیم نظام)، کاکا (چچا)، کچنیان (بچے)، کلی (گاؤں)، کمبی (نسیم بحری)، کہور، کور (برمی ندی)، کور (گھر)، کورہ کئی (گھروندا)، کوہ کور (پچاس میل تک لمبی ندی)، کھلی (پانی کی چھوٹی مشک، مشکیزہ)، کیت (آٹے کی درمیانی مشک)، گدان (ہشت پہلو بلوچی خیمہ)، گوریچ (شدید سرد شمالی ہوا)، گوش (خوشگوار ہوا)، گونچان (آٹے کی سفری مشک)، لاندھی (خشک گوشت جو سرد موسم کے لیے خصوصیت سے تیار کیا جاتا ہے)، لور (بیٹی)، لوڑ (بگولا)، لیچی بو (کانٹا)، کیلوال (مصنف)، مچ (نخلستان)، مرغہ (گھاس)، مور (ماں)، مئی (میرا)، میر (قبائلی نظام میں اعلیٰ مرتبہ فرد)، میری (قلعہ)، ناشی (سمندری ہوا، نسیم بحری)، نوئین (ریشمی قالین)، وعدہ (شادی)، ولور (لڑکی کا معاوضہ جو شادی سے قبل لڑکا ادا کرتا ہے)، ونہ (درخت) اور حلی (گھوڑا)۔

دیگر اصناف نثر میں بلوچستانی زبانوں کے الفاظ اتنی بڑی تعداد میں استعمال نہیں ہوئے ہیں، جتنے اردو افسانے میں نظر آتے ہیں۔ کیونکہ افسانہ دیگر اصناف کے مقابلے میں زیادہ لکھا گیا ہے۔ ناول اور ناولٹ میں جو نئے لفظ متعارف ہوئے ہیں وہ یہ ہیں۔ رخدار (توڑے دار بندوق)، شین (سبز)، غر (پہاڑ)، میرٹھ (صلح کرانے کی ایک رسم)۔

ڈرامہ میں یہ لفظ ملتے ہیں۔ چاپ (رقص کا مخصوص انداز)، دوچاپی (رقص کا ایک اور انداز)، دیوان (محفل، مجلس، اجتماع)، میری (قلعہ)، واجہ (محترم، صاحب عزت شخص)، یک چاپی (رقص کا ایک انداز)۔

طنز و مزاح میں بھی نو لفظیت کی کثرت نہیں، جو دستیاب ہوئے ہیں، وہ یہ ہیں۔ داشتی (نان بائی)، سجی (خاص طریقے سے انگاروں کے گرد پکا ہوا گوشت)، گواز،

گنواز (دونوں بازو پھیلانے کے بعد ان کا درمیانی فاصلہ)، لختیٔ (ناچنے والے لڑکے)۔

رپورتاژ میں بلوچستانی زبانوں کے استعمال ہونے والے الفاظ کی تعداد خاصی زیادہ ہے، جیسے پشک (بلوچی زنانہ قمیص)، پن پلی (چھوٹا زرد جنگلی پھول)، پندول (زنانہ فراک نما قمیص کے دامن پر بنی ہوئی لمبی تکونی جیب کا کھلا حصہ)، تروپہ (کچا ٹانکا)، تل ملو (کشیدہ کاری کا ایک نمونہ)، تنگی (درہ)، توف (ایک ٹانکا)، جوک (کشیدہ کاری کا ایک خوب صورت نمونہ Lazy Daisy)، جیگ (گریبان اور سینے پر کشیدہ کاری)، چاپیل (ایک ٹانکا)، چھاچمپ (ایک ٹانکا)، دوچ (بلوچی کشیدہ کاری)، دوچ گر (کشیدہ کاری کرنے والی عورت)، زرلب، لب (دلہن کے معاوضہ کی رقم)، زرملو (کشیدہ کاری کا ایک نمونہ Back Stitch)، زہی (گریبان اور سینے پر کشیدہ کاری)، سانگ، سنگ (منگنی)، شنے (سبز جنگلی پھل)، شوتک (ایک بوٹی)، شیراز (کشیدہ کاری کا ایک نمونہ)، شیشگی (شیشوں والی کشیدہ کاری)، فراری (حکومت کا روپوش باغی)، کاک (پتھر پر آٹا لپیٹ کر انگاروں کے گرد پکائی جانے والی روٹی، جسے دیہاتوں میں سجی کے جوڑ کے طور پر پکایا جاتا ہے)، گرنیری (اسمگلنگ)، گریگن (بلوچی کشیدہ کاڑھنے والی عورت)، گردد (کشیدہ کاری کا ایک نمونہ)، گز (بید مجنوں)، لوپو (کشیدہ کاری کا ایک نمونہ Chain stitch)، واجہ (محترم، صاحب عزت شخص)، ولور (دلھن کے معاوضے کی رقم)، ہاؤشنگ (رشتہ کی پیشکش پر اظہار رضامندی، بات پکی ہونا)۔

ایسے ہی الفاظ کا داخلہ تحقیقی مقالات میں بھی ہوا جیسے اخپل (خود، اپنا)، تورہ (رسم، رواج)، جرگہ (جھگڑے کے تصفیہ کے لیے قبائلی عمائدین کی کونسل)، کبین (متین، باوقار، بھاری، مشکل)، گوریچ (سرد شمالی ہوا)، مرکہ (مقتول کے گھر جا کر اقبال جرم کر کے معافی طلب کرنا)، میری (قلعہ) اور ولور (دلھن کے معاوضہ کی رقم)۔

شاعری میں بھی بلوچستان کی مقامی زبانوں کے کئی الفاظ پاکستانی اردو اور اس کے

ادب میں داخل ہوئے ہیں۔ مثلاً غزل میں "تلکس (دام، جال) تنگیں (پیاسا) اور کاریز (زیر زمین آب پاشی کا نظام)، اس کے علاوہ شعرا نے غزل میں بولان، چلتن اور شال (کوئٹہ کا پرانا نام) کے الفاظ بھی اپنے اشعار میں باندھے ہیں۔

نظم (مسدس، مخمس، مثمن، مثنوی، رباعی، قطعہ، ترکیب بند، ترجیع بند، گیت، نظم معر آزاد نظم اور ہائیکو) میں بھی ایسے نووارد الفاظ کی کثیر تعداد نظر آتی ہے۔ مثلاً آمین (لو کا موسم)، پن ریچ (پت جھڑ)، دیوان (محفل، مجلس)، زرباد (جنوب کی ہوا)، سیال (عزیزدار، رشتہ دار)، شفتالو (آڑو)، شنے (سبز جنگلی پھل)، قلات (قلعہ)، کاریز (زیر زمین آب پاشی کا نظام)، کلگ (مرد کے بال)، گوریچ (سرد شمالی ہوا)، نود (سمندر میں تیزی سے اٹھنے والے بادل جو برستے نہیں)۔

ان نووارد الفاظ کے جائزے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ان میں سے بیشتر الفاظ ایک سے زائد اصناف میں، ایک سے زیادہ لکھنے والوں نے کئی کئی بار استعمال کیے ہیں، جیسے شنے، شین، قلات، کاریز، کلی، گوریچ، گز یا سور گز، میر، میری۔ بولان، چلتن اور کیچ، جس سے یہ نتیجہ نکالنا بہت آسان ہے کہ یہ الفاظ نامانوسیت کا حصار توڑ چکے ہیں۔

جب کہ تورہ، جرگہ، چاپ، دو چاپی، دیوان، سجی، شفتالو، کاریز، گدان، گریزی، لاندھی، میر، میرٹھ، واجہ اور ولور اب کثیر الاستعمال الفاظ کے زمرے میں شامل ہو چکے ہیں۔ ان کا استعمال کرنے والے شاعر اور نثر نگار اب ان کے معنی قوسین، واوین یا پاورقی توضیحات میں فراہم کرنے پر مجبور نہیں رہے، جبکہ بہت سے نووارد الفاظ اپنی جگہ بناتے جا رہے ہیں۔ اب سے پچاس سال قبل یہ نووارد الفاظ اردو میں داخل نہیں ہوئے تھے، کیونکہ برصغیر کے ادبی ماحول میں جس اردو کا سکہ رائج تھا، اس میں ان کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ لیکن اب ان میں سے بیشتر الفاظ پاکستانی اردو کا مستقل حصہ

بن کر اردو لغات میں شامل ہونے کے منتظر ہیں۔

اختراع تراکیب اور مرکب سازی کے میدان میں بھی یہ خطہ کسی سے پیچھے نہیں رہا۔ مرکب سازی کے لیے ہندی اور فارسی دونوں زبانوں کے اصولِ قواعد سے استفادہ کیا گیا ہے۔ خوش آئند پہلو یہ ہے کہ ان مرکبات کا ہر صنف نظم و نثر میں استعمال ہوا ہے۔ یہاں صرف ان مرکبات کی فہرست مرتب کی گئی ہے جو بلوچستان کی تہذیب و ثقافت کی نمائندگی کرتے ہیں۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ ان کی بڑی تعداد مقامی ادیبوں اور شاعروں کی تخلیقی صلاحیتوں کی مظہر ہے جو اردو کے بہی خواہوں کو اس بات کا یقین دلاتی ہے کہ وہ حسب ضرورت مرکبات کی تراش خراش اور اسے برتنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ بلوچستان کے پس منظر میں تراشے گئے مرکبات کی تعداد نووارد الفاظ کے مقابلے میں کم ہے لہذا انہیں اصناف نظم و نثر کے تحت الگ الگ پیش کرنے کی بجائے یکجا کر دیا گیا ہے۔ جیسے آب تہ سنگ، انگارِ جاں، بادبان، سپر سنگ، برگ خشک، برف وردی، برف برف رستے، برف مکان، پتھر دریا، پنوں قلات (بلوچی و براہوی ترکیب)، تحریک سنگ، جلے پتھر، حبسِ جاں، حجابِ حبس، حرام تخم، خشابہ جاں، خشابہ مراد، خطہ جاں، خلوتِ یخ، خیمہ برف دباد، خیمہ جاں، خیمہ فکر کہن، دشت دمن، دشت ہوا بستہ، دشتِ تپاں، دلِ زنگ ظرف، دوزخی سفر، دوشیزہ راستے، ریگزارِ حیات، سکوتِ یخ، بے سکت، سنگ پیکر، سنگ زاد، شب حبس بے کراں، شرر بجاں، عکسِ منجمد، گشتِ سنگ، کہسار بجاں، گرم زار جاں، گل برف، گل زمین، منجمد ہاتھ اور ہوائے حبس۔

لفظ سازی کے کئی طریقے استعمال کر کے نئے الفاظ تراشے اور استعمال کیے گئے۔ اسماء کے بعد ی معروف بڑھا کر اسمائے کیفیت بنائے جیسے بھنگ سے بھنگی، چرس سے چرسی، چینک سے چینکی (چینک میں بنی ہوئی چائے)، شطرنج سے شطرنجی،

معتبر سے معتبری (گھمنڈ) اور وقت سے وقتی (جلدی)، لفظ بھنگی اور شطرنجی کے نئے معنی بھی وضع کیے گئے۔ جبکہ مقامی لفظ چرت (غور وفکر، توجہ) جو خود اسم کیفیت ہے، اس کے بعد بھی یائے معروف بڑھانے سے نیا اسم کیفیت "چرتی" وضع کیا گیا نیز چرتی اسم فاعل کے طور پر بھی استعمال کیا گیا۔ چرتی بمعنی (چرت مارنے والا، غور وفکر کرنے والا)، لفظ ہیروئن سے لفظ سازی کے لیے دو طریقے بیک وقت استعمال کیے گئے۔ اولاً یائے معروف بڑھانے سے "ہیروئنی" بنایا گیا۔ ثانیاً اسم تصغیر کی علامت چی کے اضافے سے ہیروئنچی وضع کیا گیا۔ "ہیروئنی اور ہیروئنچی" دونوں کا استعمال بیک وقت جاری ہے اور دونوں الفاظ قبول عام کا درجہ حاصل کر چکے ہیں۔

اسماء کے ساتھ گیری، گوز، خواہ، خور، بان، آب، والا، ماری اور وال کے لاحقے لگا کر اسم اور صنعت سازی کے کامیاب تجربے ہوئے۔ جیسے براہوی گیری (براہوی طرز زندگی کو اصل اوصاف کے ساتھ روا رکھنا)، پناہ گوز (پناہ گزین، لہجہ حقارت)، پشتون خواہ (پشتو بولنے والے شمالی علاقہ جات)، دال خور (سماجی اور معاشی اعتبار سے کمتر، جسمانی طور پر کمزور)، ریگبان، زہراب، سنگاب، کوروالا (شوہر)، منہ ماری (بحث، تکرار، جھگڑا) اور ہانڈی وال۔ جبکہ چرت اور منہ ماری سے چرت مارنا اور منہ ماری کرنا جیسے کثیر الاستعمال محاورات بھی تراشے گئے۔ صاحب مقامی لہجے میں ڈھل کر "صیب" بنا۔ اردو میں مستعمل چلے آنے والے الفاظ ڈبہ اور راکٹ کو نئے معنی پہنائے گئے اور آج ڈبہ بمعنی "بس" اور راکٹ بمعنی "ٹرک" استعمال ہو رہے ہیں۔

یہاں کا روزمرہ بھی نئے ڈھب سے پاکستانی اردو اور اس کے ادب میں جگہ بنا رہا ہے۔ اس روزمرہ کی مثالیں زیادہ تر اصناف نثر ہی میں دستیاب ہوتی ہیں۔ خصوصاً افسانہ، ناول، ڈرامہ اور طنز و مزاح کے ان حصوں میں انھیں آسانی سے تلاش کیا جا سکتا ہے جہاں مکالمے موجود ہوں۔ یہ امر بلوچستان میں عام بول چال کی اردو کی طرف توجہ

مبذول کراتا ہے۔ اس روزمرہ کے نمونے یہ ہیں۔

اڑے (او): "اڑے کھڑا ہو جاؤ"۔

باپ کا زور: "تمہارا باپ کا زور ہے"

بچو (کلمہ حقارت): "جاؤ بچو تم کو اچھی طرح جانتا ہے"۔

بنانا (کرنا): "وعدہ نہیں بنائے گا" یا شادی نہیں بنائے گا۔

بی بی جان (کلمہ تخاطب): "سوچے گا بی بی جان"

پہ خیر (خیریت سے): "پہ خیر اے"

چرتی (اپنی دھن میں مگن): "اس چرتی کو چھوڑو کسی اور کو بھیجو"

خدائے پہ امان (خدا امان میں رکھے): "بی بی جی اب جاوے۔ خدائے پہ امان"

خو (ہاں، اچھا): "خو ام بخیر اے"

زوئے (پشتو میں اصل معنی بیٹا ہیں لیکن اردو میں اسے "یار" کے معنی میں استعمال کیا جاتا ہے) "اچھا زوئے کل ضرور ملنا"

واری (باری): "واری واری آؤ جلدی مت کرو"

واللہ کے (بالکل، حتمی، پختہ عہد): "واللہ کے چھوڑے آج پیسہ لے گا"

محاورات کے ذیل میں یہ وضاحت ضروری ہے کہ ایسے کئی محاورات ہیں جو بلوچستانی شناخت کے ساتھ ساتھ عوام الناس کی گفتگو کا حصہ چلے آتے ہیں اور اب شعر و نثر میں بھی ان کا استعمال ہو رہا ہے۔ یہ محاورات بلوچستان کی تہذیب و ثقافت اور

یہاں عام بول چال کی اردو کے مخصوص لہجے کی عکاسی کرتے ہیں۔ مثلاً آنکھیں پتھر ہونا (شدید انتظار کی کیفیت، یاسیت کی انتہا)، پیشاب ہونا (کیا دھرا برباد ہونا)، ٹن ہونا (گم سم رہنا، مدہوشی)، جوتیاں ٹکالنا (جوتے اتارنا)، چرت مارنا (غور وفکر کرنا، پروا ہونا)، چٹ ہونا (کورا ہونا، کچھ نہ جاننا)، حال کرنا (حال احوال معلوم کرنا)، خیال کرنا (خیال رکھنا، محتاط رہنا)، دماغ کو کرسی چڑھنا (اپنے منصب پر گھمنڈ ہونا)، دماغ کو مکان چڑھنا (تکبر ہونا)، دل پشوری کرنا (حظ اٹھانا)، دل کرنا (خواہش ہونا، جی چاہنا)، دوپٹہ لینا/چادر لینا (دوپٹہ یا چادر اوڑھنا)، دھوپ اوڑھنا (دھوپ تاپنا)، روٹیاں پھاڑنا (ہڈحرامی کرنا)، سرمہ پہننا (سرمہ لگانا)، شف شف کرنا (آنا کانی کرنا) یہ محاورہ بلوچی ضرب المثل "شف شف مکن شفتا لو بگش" سے مشتق ہے۔ کمر تختہ ہونا (تھک جانا)، کمرہ کھڑا ہونا/کرنا (کمرہ تعمیر کرنا/ہونا)، گم ہونا/کرنا (نظروں سے دور ہونا)، لائین سیٹ ہونا/لین کرنا (رسم و راہ استوار کرنا)، معتبری دکھانا (گھمنڈ ہونا)، منہ ماری ہونا/کرنا (تکرار، جھگڑا، بحث)، نسوار ڈالنا/نسوار لگانا (منہ میں نسوار رکھنا)۔

ادب میں تشبیہات اور استعارات اپنے تاریخی و جغرافیائی حالات و کیفیات اور اپنے ثقافتی مزاج سے بنتے اور فروغ پاتے ہیں۔ انھیں کے ادراک و استعمال سے تحریر میں ندرت اور معنویت پیدا ہوتی ہے۔ پاکستانی اردو اور اس میں تخلیق ہونے والے ادب کی ایک اہم ضرورت یہ تھی کہ پاکستان کے مختلف علاقوں کے جغرافیہ، تاریخ اور ثقافتی عوامل سے تشبیہات و استعارات کو تراشا اور استعمال کیا جائے۔ لہذا روایت کو ساتھ لے نئی تشبیہات اور استعارات کی تلاش جاری رہی۔ ایسا ہونا اچنبھے کی بات نہیں تھی۔ اس سے پہلے بھی اردو میں اسی نوعیت کے رجحانات داخل ہو کر اپنے قدم جما چکے تھے۔ اسی تسلسل میں شعرا اور نثر نگاروں نے بلوچستان کے تہذیبی اور ثقافتی پس منظر میں تشبیہات اور استعارے ڈھالنے کا کام کیا۔ یوں اردو ادب کو تشبیہات اور استعاروں

کا نادر ذخیرہ فراہم ہوا جو اردو زبان و ادب کے فروغ کے لیے اردو کے نئے مراکز میں ناگزیر تھا۔ تشبیہات اور استعارات تراشنے کے لیے بلوچستان کے جغرافیائی خدوخال، پہاڑ، چوٹیاں، آتش فشاں، دریا، ندی نالے، موسمی کیفیات، پودے، جانور، رہن سہن کے مختلف پہلو، مقامی لوک داستانیں، ان کے کردار، واقعات، قبائلی مزاج، بہادری، غیرت اور خود داری کے اوصاف سے مشبہ، مشبہ بہ، مستعارلہ، اور مستعارمنہ تلاش کیے گئے۔ دلچسپ پہلو یہ ہے کہ اصناف نظم کے مقابلے میں اصناف نثر خصوصاً افسانہ میں ایسی تشبیہات کی تعداد نہ صرف زیادہ ہے بلکہ ان میں ندرت اور تہ دار معنویت بھی کارفرما ہے۔ ایسی تشبیہات کی مثالیں منتخب تحریری حوالوں کے ذریعہ پیش کی جا رہی ہیں تاکہ ان کے مقاصد کے ساتھ ساتھ ان کا بلوچستانی پس منظر بھی واضح ہو سکے۔

تشبیہات

- "بالکل اکیلا کوہ خلیفت سا ویران جہاں ہوائیں سنسناتی ہیں"
- "سپیراراغہ کے کچے راستوں کی طرح پرہول جہاں سے کوئی مسافر نہیں گزرتا"۔
- "اورناچ کی تپتی چٹانوں کی طرح اس کے رخساروں پر سرخی پھیل رہی تھی"۔
- "روی کے چہرے سے کرب گزر گیا۔ گرد اڑاتے بگولوں کی طرح جو مرغزانی کے راستوں میں دھول اڑاتے ہیں"۔
- "بابری مسجد کا قضیہ ایک بار پھر بلوچستان کے سوئے آتش فشاں کوہ سلطان کی طرح جاگ اٹھا"۔
- "ڈھول کا طوفان ناز کے ذہن میں کوندنے لگا جیسے دشت گوران میں دھواں اڑاتی ہوائیں براجتی ہیں"۔

- "ایسی اطاعت ایسا احترام --- کیا راجہ کیا پرجا --- جیسے پھنکارتا ناگ سپیرے کے سامنے سر جھکا دے۔ جیسے بلوچستان کے سرکش دریا کبھی کے میدانوں میں حلیم ہو جایا کرتے ہیں"۔

- "پروین کا چہرہ غصے سے دہکنے لگا، جیسے گرمیوں میں کاریز کلاں کی چٹانیں تمتما اٹھتی ہیں"۔

- "اس ۵۹ میل طویل درے میں جو کبھی سرمایہ دار کے دل کی طرح سمٹ کر انتہائی تنگ ہو جاتا اور کبھی کسی غریب کے دل کی طرح وسعت اختیار کر لیتا"۔

- "وہ حسین لڑکی جس کے گھنے بال چلتن کی وادیوں میں اترنے والی گھٹاؤں کی طرح پرپیچ اور متحرک تھے دوبارہ نمودار ہوئی"۔

- "بلوچستان کی سوئی سوئی بستیوں میں شہ مرید کے اونٹ کی طرح اس کا علی دندناتا پھرے"۔

- "یہ اس کی آنکھوں میں اتنے آنسو کہاں سے ہیں۔ میں حیران ہوا کرتا۔ فرن تنگی کی بلندی سے گرنے والے قطروں کی طرح"۔

- مچ جیل میں چکی کی مشقت اور بید سے ان کے کتنے جوان رعنا شین شوب کے پتوں کی طرح مرجھا گئے"۔

- "اس کا کندن سا رنگ مجھے زیادہ ہی شوخ لگا جیسے سیال سونا۔ جیسے ڈوبتا سورج پسنی کے پرسکون سمندر پر ہر شام دم لینے رک جاتا ہے"۔

- "شمال کی جانب اگر بڑھتے ہی چلے جائیں۔ ایک تیز رفتار اونٹ پر، جو شاہ مرید کے اونٹ کی طرح بلند ہمت اور ان تھک ہو"۔

- "فرید کی جیب میں پڑے نوٹ جلم اور غندک کی طرح کلبلا رہے تھے"۔

- "شہری ٹھہری زندگی کتنی یکساں اور بور ہوتی ہے۔ جیسے فلاش میں کوئی بھی کھلاڑی کارڈ اٹھانے پر تیار نہ ہو، جیسے رند اور لاشار آپس میں خوفناک جنگ لڑ رہے ہوں"۔

- "براندمی کی آگ نے اسے شاشان کے طوفانوں کی طرح سرکش اور سنگر کے باغوں میں کھلنے والے گلابوں کی طرح پر بہار بنا دیا"۔

- "نہ جانے یہ لڑکیاں اس قدر سٹنٹ کیوں ہوتی ہیں۔ کوئٹہ کے موسم کی طرح اچانک بدل جاتی ہیں"۔

- دونوں نے ہاتھ ملایا۔ دنیا بہت شوخ بہت خوش رنگ ہو گئی۔ جیسے بسیمہ کے تپتے صحراؤں میں گھٹائیں امڈ آئیں۔ جیسے بولان کی طویل وادیوں میں چاند اتر آئے"۔

- "پھر سے یوں دھیرے دھیرے بہتا رہا جیسے سخا کا صدیوں سے بہتا پانی"۔

- "ٹین کی چھت پر چھائے اخروٹ کے درخت سے قطرے ٹپ ٹپ گر رہے ہیں۔ جیسے کوئی آنکھ مچولی کھیلنے میں بھاگتا ہی جائے"۔

شاعری کو بھی ایسی ہی تشبیہات سے سنوارا گیا۔ ملاحظہ ہو:

جہاں بھولے سے کچھ پیاسے پرندے اب بھی آتے ہیں
ہمارا شہر بھی سوکھے ہوئے تالاب جیسا ہے

وادیٔ شال کے اطراف پہاڑوں کی طرح
دل کو گھیرے ہوئے یادوں کا حصار آج بھی ہے

ہائے وہ آرزو مرے دل میں دبی ہوئی

ندی ہو کوہسار میں جیسے رکی ہوئی

برف کے گالوں سی نازک، خوبصورت کون تھی

مرمریں بے داغ، برفیلی سی صورت کون تھی

ہم نے ان گدانوں کو اس طرح بنایا ہے

جیسے کہکشاؤں نے آسماں سجایا ہے

استعارات

آگ کا صحرا، آماج کی تپتی چٹان، اخروٹی بال، اخروٹی رنگ، بے باک پہاڑ، بے مہر ہوائیں، آزادی پسند صحرا، چھتوں کا اسیر، حسن کی کھیتی (سیب کے باغات کے لیے)، خیموں کی تحریر، دشت گوران کی پاگل ہوا، دھوپ کی کھڑاؤں، زندگی کے چشمے (ارک کے چشمے)، زمین کی چھلنی، سرخ مٹی کی مونالیزا، سورج کا سائبان، سورج کا صحرا، قرض کی کاریز، کہسار کے پلو، گیتوں کا سہاگ رنگ (عورتوں کی مدھر تانیں)، مبالغہ کی زرغون، محبت کا مہر گڑھ، مردانگی و استقامت کا کہسار، مکرانی کھجور کی پژمردہ شاخ، ہامون ماشکیل سے بھی پست، ہونٹوں کے شستوت، یخ کے خرابے۔

پاکستانی اردو ادب میں بلوچستان کی مقامی زبانوں کی ضرب الامثال کا استعمال اس ادب کے بدلے ہوئے مزاج کا قابل ذکر پہلو ہے۔ یہ ضرب الامثال صرف اصناف نثر ہی میں اپنے مفاہیم کو بیان کر کے یہاں کے طرز حیات کو سمجھانے کے مواقع فراہم کرتی ہیں۔ اس میں بھی اردو افسانے میں ان کی تعداد زیادہ ہے، جس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ شاعروں اور نثر نگاروں نے اب تک اس جانب بھرپور توجہ نہیں دی ہے۔ اکثر مصنفین نے انھیں اصل شکل میں لکھنے کے بعد ان کے مروجہ معنی بھی قوسین یا واوین میں فراہم کر کے اپنی بات

کی تکمیل و تفہیم کی ہے جبکہ چند لکھنے والوں نے اصل ضرب الامثال لکھنے کی بجائے ان کے اردو مفہوم ہی کو اپنی تحریروں میں جگہ دی ہے، جنھیں جوں کا توں پیش کیا جا رہا ہے۔ یہ ضرب الامثال قبائلی نظم، عزت و غیرت کے معاملات، لڑائی جھگڑے، بھائی برادری خاندان و قبیلہ کے مراتب و مرکزیت، عشقیہ داستانوں کے اشارے اور کنائے کے پس منظر کی تفہیم کرتی ہیں۔

ضرب الامثال

- آسک تچیت چم ماں مات کرہ ہندا انتا۔ (پہاڑی بکرا جہاں بھی دوڑتا ہے اس کی نظریں سب سے اونچی چوٹی پر لگی رہتی ہیں۔)
- دانکہ دنیا استیں شہ مرید گوہراں مستیں۔ (جب تک دنیا قائم ہے شہ مرید کا جوان اونٹ مست خرام رہے گا۔)
- سانگ بندی لانگ بندی۔ (اعزا کی خاطر جنگ لازم ہے)
- سیال چہ سیالاں کم بود گوش بائے بر۔ (بڑا دشمن کزن، سیال ہوتا ہے)
- شنے چھپ کر نہیں کھائے جاتے۔ (عیب چھپتا نہیں)
- لٹھے ایلم کن خلس، ایت خدا کن کرکہ۔ (لٹھ بھائی کے لیے چلاؤ، بات خدا لگتی کہو)
- میر کا پانی ہمیشہ بلندی پر جاتا ہے۔ (قبائلی معتبرین کا مرتبہ گھٹایا نہیں جا سکتا)۔

قیام پاکستان سے قبل اور اس کے کچھ عرصہ بعد تک شعر و نثر کی مجموعی فضا،

اکثر و بیشتر برصغیر کے بڑے علمی مراکز یا موجودہ ہندوستان کے شہروں، قصبوں اور دیہاتوں سے فراہم ہوتی تھی۔ لیکن پاکستانی اردو کے خدوخال مرتب کرنے میں پاکستانی فضا اور ماحول نے بنیادی کردار ادا کیا۔ دلی، لکھنو، آگرہ، الہ آباد، بمبئی، بھوپال، رام پور اور حیدر آباد دکن کی بجائے پاکستانی علاقوں، شہروں، قصبوں اور دیہاتوں کے نام استعمال ہونے لگے۔ گنگا جمنا، برہم پتر اور گوداوری کی جگہ اس خطے کے دریاؤں، ندیوں اور نالوں نے لے لی۔ لال قلعہ، تاج محل، چاندنی چوک، پائیں باغ، ہزاری باغ اور لکھ پیڑا باغ کی جگہ پاکستانی عمارتوں، پلوں، مختلف شہروں اور قصبوں کے محلوں، سڑکوں اور مضافاتی علاقوں کو مل گئی۔ لیلیٰ مجنوں، شیریں فرہاد، وامق عذرا اور نل دمن کی بجائے علاقائی عشقیہ داستانیں اور ان کے کردار اپنائے جانے لگے۔ نوشہ میاں، اچھے میاں، چھوٹے میاں، اچھن، ببن، شبن، لدمن، رمضانی اور شبراتی کے بدلے مقامی ہیرو اور عام لوگوں کے کردار متعارف ہوئے۔ زیب النساء، نورالنساء، اصغری، اکبری، ببو، چھمو، کانتی، شانتی، پرمشوری کی بجائے اسی سرزمین سے زنانہ کرداروں کے نام تلاش کیے گئے۔ تبدیلی کے اس عمل، اور پاکستانی اردو کی نشوونما کے اس شعبے میں بھی بلوچستان نے اپنا کردار بخوبی انجام دیا ہے۔ نظم و نثر میں جو بلوچستانی نام برتے گئے ہیں انہیں مختلف عنوانات کے تحت یکجا کر دیا گیا ہے۔

شہروں، قصبوں اور دیہاتوں کے نام

آبِ گم، اتھل (اوتھل)، اشکنہ، اورمارا (اورماڑہ)، اورناچ، ایری، بھاگ، بمبا، بسیمہ، بوڑھی لان دانی، بوستان، بی بی نانی، بیجی، بسیلہ، پھلیجی، پٹے باغ، پڑنگ آباد، پسنی۔ پشین، پنجگور، پنگوڑا، پنیر، پیدارک، تربت، تیری، ٹمپل ڈیرہ، جھل اجھل مگسی، چھتر، چگل، چمن۔ حاجی رضا، حاجی شہر، خداداد شہر، خضدار، خلی، خنائی، خوست، داد تلی، دُر خان، دشت، درینگڑ، ڈھاڈر، ڈیرہ بگٹی، دوزان، رکھنی، رندلی، رودہنی، زندرہ،

زرن شہر، زہری گھٹ، زیارت، ژوب، سبی اسپوی، پسیرارانمہ، پیرنڈ، سریاب، سناؤ، سنگر، سوراب، سونا بوٹی، سوئی، شالکوٹ (کوئٹہ کا پرانا نام)، شاہرگ، شاہی تمپ، فتح پور، فورٹ سنڈیمن، قلات، قولیج، کاریز کلاں، کالی کانی، کھنڈلانی، کانک، کٹ منڈانی، کچکروک، کرتہ، کڑک، کلت، کلی سفرزئی، کلی سلیمان، کلی کریم داد، کلی گوہر خان، کلی قیصرانی، کلی منگل، کلی نخل، کن تی، کنگڑ، کوشگک، کولپور، کولواہ، کوئٹہ، کوئیٹہ شہر، کوہلو، کہان، گاجان، گرزنی، گنداوہ، گوادر، لاسے زئی، لٹل لندن (کوئٹہ)، لوپ، لورالائی، زبک، نلی، مشری، مچ، مچھ قدیم، مرغزانی، مَرغہ، مَرغہ فقیرزئی، مستونگ، مستونگ روڈ، مشکاف، ملک زئی، موند، نال، نجارہ، نوقبر، نہال خان رشند، وناگ لواشنا، وڈھ، وزیران شہر، ونگہ سر، ہرک، ہرنائی، ہزار گنجی۔

علاقوں کے نام

جھالاوان، چلتان رینج، دشت گوران، ساراوان، سیاہ آف، شوران کچھی، کیچ، مکران۔

پہاڑوں کے نام

آماچ، بسول، جاندارن، چلتن، خلیخائی، خلیفت، سلطان، سلیمان، شاشان، شین غر، مراد، مردار۔

چوٹیوں کے نام

آماچ، تخت سلیمان، زرغون، شین غر۔

دروں کے نام

بولان، فرن تنگی، کورٹک، لک پاس، ولی تنگی۔

پھلوں اور میوؤں کے نام

آڑو، اخروٹ، انگور، بادام، بیر، چلغوزہ، چیری، خوبانی، زرد آلو، سیب، شفتالو، شہتوت۔

پرندوں، چوپایوں، حشرات کے نام

اڑنے والے سانپ، اونٹ، بھیڑ، بھیڑیا، جلم (بچھو)، چکور، چیل، خاکستری چڑیاں، خیلخاہ (چیتا)، دنبہ، زمری (چیتا)، غنڈک (تیز رفتار انتہائی زہریلی مکڑی جسے اس کے زہریلے پن کی وجہ سے بچھو بھی کہا جاتا ہے)، لسیوہ (بھیڑیا)، مارخور۔

جھیل، ندی نالوں، دریاؤں کے نام

بحرین، بسول کور، سی، شادی کور، کیچ کور، گرو، ہامون ماشخیل۔

عمارتوں، پلوں، ہوٹلوں کے نام

اڑک ریسٹ ہاؤس، بدھڑا شال، پردہ کلب، نیجرہ پل، پنوں کا قلعہ، چاکر کا قلعہ، چائینیز ہوٹل، ڈاکٹر جبار کی دوکان (پرنس روڈ کوئٹہ)، ریلوے سنیٹوریم، شہباز پارک، فرح ہوٹل، کالی مندر، کوئٹہ ڈسٹلری، لال کباب، مچ جیل، ملنگ ہوٹل، نشاط ہوٹل، ہنگلاج کے مندر (بیلہ)۔

کوئٹہ کے محلے، سڑکیں اور مضافاتی علاقے

اڑک، بروری، تیل گودام، دیبا، سبزی منڈی، سعید آباد، سیون ایسٹریمز، شالدرہ، کاسی روڈ، کیقباد روڈ، وحدت کالونی، ہنہ۔

ہیروز، رزمیہ و عشقیہ داستانوں کے کرداروں، قبائلی اور معروف شخصیات کے نام

بانڑی، بجار، بی برگ، پنوں، جاتن، جاڑو خان، جلال خان، چاکر اعظم خان، حانی، حسو، خیر جان بلوچ، دودا خان زرکزئی، دوستین، رامن، رند، ریحان، سمو، سومری، سیٹھ حاجی فتح خان، شاہو خان، شہداد، شیرین، شیہک، شہ مبارک، شہ مرید، عالی، علی رند، عمر میروارڑی، عومر، گراناز، گواہرام، گوہر بی بی، فیض بلوچ، للہ، نودبندغ، مائی سیوی، مراد خان، مست توکلی، مندو خان، مہناز، میر رسول بخش، مہر محراب خان، بیگم بیگی، میر مہر اللہ، میر غوث بخش بزنجو، میر نصیر خان نوری اور ہدہ۔

عشقیہ داستانوں کے نام

حانی و شاہ مرید، حمل ومہ گنج، شیریں و دوستیں، مہناز و شہداد۔

ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں کے نام

آر تھر جاوید، زاہد آفاق، حاوی اعظم، صاحبزادہ حمید اللہ، عبدالسلام عشے زئی، عبدالعلی اخوندزادہ، عطااللہ ولہاری، کامل القادری، محمد حسین عنقا، مولانا دین محمد پندرانی، میر کریم امن، میر گل خان نصیر، نور محمد پروانہ۔

قبائل کے نام

بادینی، بجارانی، بندرانی، پھرٹ پیر محمدانی، جمالدینی، چانڈیو، دشتی، ڈوکی، رند، زرکزئی، سانگزئی، شاہوانی، شیرانی، حالیانی، قلندرانی، کورائی، کھوسہ، گشکوری، لاشار، لہڑی، مری، مسوری، مگسی، میرانی، نوحانی، نوشیروانی اور ہوت۔

مردانہ کرداروں کے نام

بیرگ، بیزن، چبر، دراخان، دودو، شامیر، شاہ ولی، شہک، شیر باز، ماما خیرو، میر گل، نبو، نود۔

زنانہ کرداروں کے نام

برشنا، بیگی، دلوتی، زباد، سازو، صابرو

افسانوں، افسانوی مجموعوں، نظموں اور مجموعہ کلام کے نام بھی مقامی زبانوں کے الفاظ، ثقافتی عوامل اور لفظ سازی کے ذریعہ رکھے گئے۔

افسانوں کے نام

بولان کی بیٹی، چبر، شلیبے تازی شلیبے، طالب (دینی مدرسہ کا طالب علم)، کورہ کئی، کھلی والا، گوریچ، اور حلی، جبکہ افسانوی مجموعہ کا نام گوریچ رکھا گیا۔

نظموں کے عنوانات

اب فیض بلوچ سنائے، بلوچ کا ورثہ، پن ریچ (پت جھڑ)، پنوں قلات، حانی وشاہ مرید، کاریز، گل زمین، گل کدہ (مہر گڑھ کے آثار قدیمہ)، گومتی سے بیکڑ تک،

اور ماہناز۔ جبکہ لفظ سازی کر کے مجموعہ مکدم کا نام "سنگاب" رکھا گیا۔

نو لفظیت، مرکبات، لفظ سازی، روزمرہ، محاورات، ضرب الامثال، تشبیہات، استعارات اور تسمیہ کی فہرستیں اپنے اپنے شعبوں میں پاکستانی اردو کی ضرورت، قبولیت اور فروغ میں بلوچستان کے کردار کو واضح کرتی ہیں۔ زبان و ادب کے یہ گل بوٹے کس قدر پھلے پھولیں گے اس کا فیصلہ وقت اور عوام الناس میں ان کی مانوسیت و مقبولیت ہی کرے گی۔ رد و قبول کے ذریعے بہت سے تناور سایہ دار درخت منظر پر آئیں گے۔ بہت سے مرجھا جائیں گے۔ کچھ اپنی صوتی کرختگی کے باعث پس منظر میں چلے جانے پر مجبور ہوں لیکن ان کے شانہ بشانہ نونہال اپنی جڑیں مضبوط کریں گے۔ کیونکہ زندہ زبانوں میں لفظ اور اس کی معنویت کا سفر انہی پر پیچ راستوں پر ہوتا ہے۔

اردو زبان
کی تذکیر و تانیث پر پنجابی زبان کے اثرات

ساجدہ شمیم۔ تاشقند

(۱)

(صرفی)

حقیقی دنیا میں جان داروں کی جنس کی شناخت اور امتیاز مشکل نہیں اور مذکر و مؤنث ہی کی زیادہ اہمیت ہے۔ جبکہ حقیقی دنیا میں بے جان اشیاء کی تذکیر و تانیث نہ موجود ہے اور نہ اہمیت رکھتی ہے لیکن زبان کی دنیا ایسی ہے جس میں جان داروں کے ساتھ ساتھ بے جان اشیاء کی تذکیر و تانیث کو بھی بہت اہمیت حاصل ہے۔ لیکن بے جان اشیاء میں کوئی علامت تذکیر و تانیث موجود نہیں ہوتی اس لیے امتیاز کرنا دشوار ہو جاتا ہے۔

دنیا کی تمام زبانیں تذکیر و تانیث کا ایک جیسا نظام نہیں رکھتیں۔ کسی زبان میں جنس کی تینوں قسموں مذکر، مؤنث اور بے جنس (Neuter gender) کا استعمال ہوتا ہے۔ روسی اور کسی دوسری زبان میں تذکیر و تانیث کا لحاظ نہیں رکھا جاتا جیسے ترکی، ازبک، فارسی اور بعض دیگر زبانوں میں صرف مذکر اور مؤنث ہی استعمال ہوتے ہیں جیسے اردو، پنجابی، سندھی وغیرہ۔

اردو زبان میں اکثر الفاظ کی تذکیر و تانیث کے تعین اور استعمال میں ہم آہنگی پائی جاتی ہے لیکن پھر بھی کئی ایسے الفاظ مل جاتے ہیں جو کبھی مذکر استعمال ہو جاتے

ہیں کبھی مؤنث۔ اردو اور پنجابی زبان میں "جان" اور "رسم" مؤنث ہیں۔ اردو زبان میں جان کو میر نے مذکر باندھا ہے۔

جان اپنا جو ہم نے مارا تھا
کچھ ہمارا اسی میں وارا تھا

(میر)

لیکن مرزا شوق لکھنوی، ذوق، انیس، رنگین، جان صاحب اور امیر نے مؤنث باندھا ہے۔

جان پر بن رہی ہمارے ہے
مر رہا تو جھگت کے مارے ہے

(مرزا شوق لکھنوی)

"رسم" کو درد نے مذکر استعمال کیا ہے جیسے "جو رسم تھا سو کار گر تھا" لیکن بحر نے مؤنث جیسے "دلبروں میں بیوفائی کی اگر ہوتی نہ رسم"۔ اسی طرح "راہ" کو قائم نے مذکر لیکن شوق، جلال، رشک نے مؤنث باندھا ہے۔

ان مثالوں سے محسوس ہوتا ہے کہ الفاظ کی تذکیر و تانیث میں کتنا اختلاف پایا جاتا تھا۔

اس بارے میں سلیم جعفر لکھتے ہیں "الفاظ کی تذکیر و تانیث کوئی مستقل چیز نہیں۔ بہت سے الفاظ جو میر اور سودا کے زمانے میں مذکر تھے۔ اب مؤنث استعمال ہوتے ہیں مثلاً خلش، رسم، راہ وغیرہ (اص ۳۳۶)۔ الفاظ کی تذکیر و تانیث کے سلسلے

میں مولانا محمد حسین آزاد میر و سودا کے زمانے کے متعلق لکھتے ہیں "مگر حق یہ ہے کہ اس وقت تذکیر و تانیث لفظوں کی مقرر نہیں ہوئی تھی" (۱ص ۳۳۶)۔ ڈاکٹر رام بابو سکسینہ میر و سودا کے زمانے کے بارے میں لکھتے ہیں "الفاظ میں تذکیر و تانیث کی پابندی نہ تھی۔ مصنف کی خواہش اور خوشی کے موافق الفاظ مؤنث اور مذکر لکھے جاتے تھے" (۲)۔

لیکن الفاظ کی تذکیر و تانیث میں یہ اختلاف اب بھی پایا جاتا ہے۔ دیسی (مقامی) الفاظ میں یہ فرق برائے نام ہے۔ جیسے "آنکھ" کو مخلص، ناسخ، امیر، اسیر، مصحفی، مسکین، نظیر، قائم، امانت، انس، جرأت اور قدر سب نے مؤنث ہی باندھا ہے۔ لیکن دخیل الفاظ میں یہ فرق زیادہ پایا جاتا ہے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ اردو اور پنجابی زبانوں میں تذکیر و تانیث کے ٹھوس قواعد موجود نہیں ہیں اور اکثر قیاسی قاعدوں کے تحت تذکیر و تانیث کا تعین کیا جاتا ہے اور بہت سے دخیل الفاظ کا ان قاعدوں کے تحت صحیح تعین ممکن نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ قواعد کی کتابوں میں بھی بعض الفاظ مثلاً ٹکٹ، تار، اخبار، ہوش (۳) اور سانس، غور، طرز، گیند (۴) کی صحیح تذکیر و تانیث کا تعین کرنے کی بجائے یہ لکھ دیا گیا کہ یہ مذکر اور مؤنث دونوں طرح بولے جاتے ہیں۔ اسی طرح لغات میں بھی کئی الفاظ مذکر اور مؤنث دونوں طرح درج کر دیے گئے ہیں (۶،۵)۔ ڈیمشتیس نے قدرے تفصیل سے الفاظ کی تذکیر و تانیث کی درجہ بندی کی ہے۔ البتہ تصیفہ طلب الفاظ کی تذکیر و تانیث کے تعین کے بارے میں کچھ نہیں لکھا (۷)۔

اس کے ساتھ ساتھ زمانہ بعید سے اب تک الفاظ کی تذکیر و تانیث میں اختلاف کی ایک وجہ زبانوں کا ایک دوسرے پر اثر بھی ہے۔ اُس وقت جب اردو زبان اپنے ارتقاء کی طرف رواں دواں تھی اور جن مقامات (لکھنؤ، دلی، دکن وغیرہ) پر اس کی

افزایش ہو رہی تھی یہ علاقے مختلف اقوام عرب، ایرانی، ترک، ازبک، افغان، سندھی، پنجابی وغیرہ کے اکٹھ کے مراکز تھے۔ یہ لوگ مادری زبانوں کے علاوہ اردو بھی بولتے تھے۔ مادری زبانوں اور اردو میں الفاظ کی تذکیر و تانیث میں اکثر فرق پایا جاتا ہے۔ مثلاً اردو زبان کے برعکس سندھی زبان میں کتاب، تصویر، نظم، مذکر اور دل مؤنث استعمال ہوتے ہیں۔ اس طرح اردو زبان بولتے وقت کسی سندھی نے سندھی زبان کے زیر اثر اردو میں بھی کبھی کبھار کتاب، تصویر یا نظم کو مذکر اور دل کو مؤنث استعمال کر دیا ہو تو یہ کوئی اچنبھے کی بات نہیں اور پھر کسی دوسرے نے سن لیا اور پھر اسی طرح استعمال کر دیا تو یہ بھی ممکنات میں ہے۔ پھر ترکی، فارسی، ازبک اور کئی دوسری زبانوں میں تذکیر و تانیث موجود نہیں۔ ان لوگوں کے لیے اردو بولتے ہوئے تذکیر و تانیث کا صحیح لحاظ رکھنا کافی مشکل رہا ہوگا۔ یہ زبانوں کے اثرات ہی کا نتیجہ ہے کہ اردو زبان کے ان الفاظ میں بھی جن کے تذکیر و تانیث کے تعین میں کوئی اختلاف نہیں، اکثر اختلاف مل جاتا ہے۔ یہ فرق مختلف علاقوں میں تو عام ملتا ہے لیکن ایک ہی علاقے میں بھی مل جاتا ہے۔

ایسے ہی اثرات اب پنجابی زبان کے اردو پر محسوس کیے جا سکتے ہیں۔ "ڈکار" پنجابی زبان (۸) میں مذکر ہے لیکن اردو زبان (۶،۵) میں مؤنث ہے۔ پنجابی زبان کے زیر اثر اردو میں مذکر استعمال بھی مل جاتا ہے۔ مثلاً مجھے کھانا کھانے سے پہلے بہت ڈکار آتے ہیں (۹)۔ قمیص، اردو زبان میں مذکر لیکن پنجابی زبان میں مؤنث ہے۔ اہل پنجاب پنجابی زبان کے زیر اثر اکثر مؤنث ہی استعمال کرتے ہیں۔ احمد ندیم قاسمی نے اپنی کتاب بگولے میں گیارہ مرتبہ قمیص کو مؤنث ہی استعمال کیا ہے۔ مثلاً تیری قمیص چھین لی جائے گی۔ (۱۰ ص ۷۷)، اور قمیص کا بطور مؤنث استعمال اکثر مصنفین کی تحریروں میں مثلاً (۱۱ ص ۴۴)، (۱۲ ص ۲۶)، (۱۳ ص ۸)، (۱۴ ص ۸۱)، (۱۵ ص

۱۲۶) اور (۹ ص ۱۶) مل جاتا ہے۔ اسی طرح "غار" اردو زبان میں مذکر ہے لیکن پنجابی میں مؤنث۔ اقبال نے اسے مؤنث ہی باندھا ہے "کر دے اسے چاند کی غاروں میں نظر بند"۔ اسی طرح کئی دوسرے الفاظ جو اردو زبان میں مذکر ہیں لیکن پنجابی زبان میں مؤنث، اردو زبان میں اہل پنجاب کے ہاں اکثر و بیشتر مؤنث ہی استعمال ہوتے ہیں۔ وہ الفاظ مثلاً فکر اور قلم جنھیں اردو میں مذکر اور مؤنث (۴) دونوں طرح استعمال کی اجازت ہے، وہ بھی اکثر مؤنث ہی استعمال ہوتے ہیں۔ جیسے اسی لیے مجھے ہر وقت فکر رہتی ہے" (۱۰ ص ۴۷) اور "تو پھر وہ قلم کہاں غائب ہو گئی (۱۱)۔

یہ چیز بھی مشاہدہ کی گئی ہے کہ اہل پنجاب میں الفاظ کو بطور مؤنث استعمال کرنے کا رجحان پایا جاتا ہے۔ چنانچہ وہ الفاظ جو اردو اور پنجابی دونوں زبانوں میں مذکر ہیں اہل پنجاب کی تحریروں میں ان کا بطور مؤنث استعمال بھی مل جاتا ہے۔ مثلاً اقبال نے پرہیز کو مؤنث باندھا ہے۔ "اشارہ پاتے ہی صوفی نے توڑ دی پرہیز"۔

(۲)

(معنوی)

دنیا کی ہر چیز زمانے کی تبدیلی کے ساتھ اتار چڑھاؤ کا شکار رہتی ہے۔ زبانیں بھی اس عمل سے نہیں بچ سکتیں اور الفاظ میں معنوی اونچ نیچ کا عمل جاری رہتا ہے۔ بعض پرانے معنی اپنی حیثیت ختم کر رہے ہوتے ہیں اور کئی نئے معنی جڑ پکڑ رہے ہوتے ہیں۔ بعض اوقات معنوی تبدیلی الفاظ کی صوتی تبدیلی سے وابستہ ہو جاتی ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ پرانا لفظ پہچانا جاتا ہے نہ وہ پرانے معنوں کو اپنے پاس پھٹکنے دیتا ہے۔ بقول ماریو پے "لفظ یا جملہ صرف آوازوں کا مجموعہ ہی نہیں ہوتا بلکہ اس کے ساتھ بہت کچھ وابستہ ہوتا ہے"۔ (۱)

معنوی تبدیلی کئی طرح کی ہوتی ہے۔ کئی الفاظ کسی زمانے میں جس پیمانے اور معنوی عروج کے ساتھ استعمال ہوتے تھے آج ان کو یہ حیثیت حاصل نہیں رہی۔ مثلاً لفظ "خلیفہ" کے معنی نائب اور جانشین کے تھے۔ جس کے معنی اب زوال پذیر ہو کر حجام اور اکھاڑے کے استاد کے بھی ہوگئے ہیں۔ اسی طرح لفظ "بادشاہ" جو ملک کے حاکم اور بادشاہ کے لیے استعمال ہوتا تھا، کم عقل اور بے وقوف کے معنوں میں بھی استعمال ہورہا ہے۔ جیسے "آپ بھولے بادشاہ ہیں" (۲) یہی نہیں بلکہ اب لفظ "بادشاہ" صرف قصے اور کہانیوں ہی میں کبھی کبھی پڑھنے کو ملتا ہے۔

بعض الفاظ اپنے وسیع اور عام معنوں میں استعمال ہوتے تھے لیکن آہستہ آہستہ وہ صرف مخصوص معنوں میں استعمال ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔ مثلاً عربی لفظ "خیرات" کے معنی نیکیاں ہیں لیکن اب یہ صرف "صدقہ دینا" کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ "مرغ" فارسی میں مطلق پرندہ کو کہتے ہیں، اردو میں صرف "مرغ" کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ گوشت کے معنی خوراک کے تھے لیکن اب صرف گوشت کے معنوں ہی میں استعمال ہوتا ہے۔ تاجک زبان میں "شادی" خوشی کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے لیکن اردو میں صرف "بیاہ" کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ "ان تمام لفظوں کے قدیم اور جدید معنوں میں عام اور خاص کا تعلق ہے" (۳)

اسی طرح بعض حکمرانوں کے ادوار اور نام وقت کی تبدیلی کے ساتھ مفہوم تبدیل کرتے رہتے ہیں۔ مثلاً نادر شاہی دور نادر شاہ کے زمانے میں ان کے فرمانرواؤں کے نزدیک عظیم دور تھا اب وہی دور ظلم اور بربریت کا دور تصور کیا جاتا ہے۔

بعض اوقات الفاظ اپنے حقیقی معنوں میں استعمال ہوتے ہیں اور بعض اوقات مجازی معنوں میں۔ اسی طرح بعض الفاظ جب فقروں میں پیوست ہوتے ہیں تو تب ہی ان کی قدر و قیمت متعین ہوتی ہے۔ مثلاً اس کے گلے میں پھولوں کا "ہار" ہے۔ اور

ہماری ٹیم میچ "ہار" گئی۔ بعض الفاظ ایک زبان میں جن معنوں اور ناموں کے لیے استعمال ہوتے ہیں دوسری زبان میں وہ مختلف معنوں اور ناموں کے ساتھ استعمال ہوتے ہیں۔ مثلاً "روزگار" فارسی میں زمانے کو کہتے ہیں جبکہ اردو میں "نوکری یا کمائی" کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ اسی طرح ازبک زبان میں جس سبز رنگ کی دال کو "ماش" کہتے ہیں اردو میں اس کو "مونگ" کی دال کہتے ہیں۔ جبکہ "ماش" اردو میں ایک دوسری دال کا نام ہے۔

اردو اور پنجابی دونوں زبانوں کے مشترک الفاظ میں عموماً یکساں طور پر معنوی اتار چڑھاؤ ہوتا ہے۔ لیکن پھر بھی کچھ الفاظ معنوی اختلاف کے ساتھ استعمال ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح بعض خالص پنجابی اور اردو زبان کے الفاظ ایک دوسری زبان میں داخل ہوتے ہیں تو کچھ معنوی تبدیلیاں بھی کر لیتے ہیں۔ یہ عمل روزمرہ انسانی ربط اور میل ملاپ کی وجہ سے ہوتا ہے۔ اردو زبان موجودہ سماجی زندگی اور پنجابی زبان کے زیر اثر کیا رنگ روپ اختیار کر رہی ہے اور کیا معنوی اثرات قبول کر رہی ہے اس کا اندازہ ان مثالوں سے ہو سکتا ہے:

تمہارا گھروالا کہاں ہے۔

خیر مٹی پاؤ ایسے واقعات تو ہوتے رہتے ہیں۔

ہیروئن کی لت مجھے زیادہ دیر اس دنیا میں نہیں رہنے دے گی۔

عملہ ڈومیسٹک لاؤنج میں مسافروں سے مک مکا کرتا ہے۔

اکا دکا گرفتاریاں بھی عمل میں آئیں۔

میں نے بغیر دیکھے بھالے ایک فلائنگ کک جڑ دی۔

اسی طرح بعض الفاظ جو اردو اور پنجابی دونوں زبانوں میں ایک طرح بولے جاتے ہیں لیکن معنوی اختلاف بھی رکھتے ہیں۔ مثلاً لفظ "سرہانا" اردو میں "سر کی جانب" کو کہتے ہیں یعنی وہ رُخ جس طرف تکیہ رکھ کر لیٹے ہیں۔ میر کا یہ شعر اسی مفہوم کی وضاحت کرتا ہے۔

سرہانے میر کے آہستہ بولو
ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے

مگر پنجابی میں بطور "تکیہ" بھی مستعمل ہے۔ علامہ اقبال نے اسی معنی میں اردو میں بھی نظم کیا ہے۔

ہو ہاتھ کا سرہانہ سبزے کا ہو بچھونا
شرمائے جس سے جلوت، خلوت میں وہ ادا ہو

"زمین دار" کے معنی اردو میں "زمین کا مالک" ہیں لیکن پنجابی میں کھیتی باڑی کرنے والے کو کہتے ہیں۔ مثلاً "اس کے دو بھائی گاؤں میں رہتے ہیں، زمینداری کرتے ہیں"۔

"شریک" اردو میں "حصہ دار" اور "شامل" کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے لیکن پنجابی میں رشتہ داروں کے لیے بھی۔ مثلاً "اور تم شریکوں کے سامنے سر نہ اٹھا سکو گے" (۴)

"بال" اردو میں عموماً گیند اور پَر کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے جبکہ پنجابی میں یہ "جلانے" اور بچہ کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً "پوری سردیاں کمرے میں انگیٹھی بال کے رکھا کرتی تھی" (۵) اور

"جس کو رئیس لے گیا دارالامان سے

وہ بال اس کی اپنی ہی بیٹی کی بھول تھا"(۶)

"چھینٹ" پانی کی بوند یا چھینٹے کو کہتے ہیں۔ لیکن پنجاب میں ایک کپڑے کا نام بھی ہے جیسے "اس کے گلے میں دیسی چھینٹ کا چولا نہیں بدیشی ریشم کی قمیض بھی ہے"(۷)

"بھاگ" اردو میں بھاگنا، دوڑنا کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے لیکن پنجابی میں نصیب کے معنوں میں۔ "میں تو اپنے بھاگ پر ناز کرتی ہوں"(۸)

"کھوتا" اردو میں کھونا یا ضائع کرنے کے معنوں میں لیکن پنجابی میں گدھا کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً "یہ کس کو پکڑ لیا ہے کھوتے کے پتر"(۹)

اسی طرح کئی الفاظ خاص اصطلاحی معنوں میں بھی استعمال ہوتے ہیں۔ اردو زبان میں گشتی (گشت کرنا) اور رنڈمی (وہ عورت جس کا خاوند مر گیا ہو) کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ لیکن پنجابی میں یہ اصطلاحیں طوائفوں کے لیے بھی استعمال ہوتی ہیں۔ مثلاً چل نی گشتیئے۔ جیسی تو ویسی تیری ماں گشتی(۱۰)

تیرا لاڈلا رنڈیوں کے گھر جاتا ہے۔ ایک رنڈمی سے اس کا یارانہ ہو گیا ہے(۱۱)

اردو میں استعمال ہونے والے بعض الفاظ پنجاب کی خاص رسمیں ہیں اور بعض صرف خاص مواقع کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔ مثلاً

آئینہ دکھانا: وہ رسم جس میں شادی کے موقع پر دولہا دلہن صرف شیشے کے ذریعے ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں۔ (۱۲)

سلامی دینا: شادی کے موقع پر دولہا، دلہن کو رشتہ دار جو روپے پیسے دیتے ہیں

اسے "سلامی" کہتے ہیں۔ (۱۳)

کندھا دینا: میت کو چارپائی پر ڈال کر قبرستان تک باری باری لوگ اٹھاتے ہیں اسے "کندھا دینا" کہا جاتا ہے۔ (۱۴)

بسم اللہ: خالہ سعیدہ نے جو جوڑا دیا تھا بلو کی بسم اللہ پر۔ وہ درزی کے پاس ہے۔ (۱۵)

کتابیات

۱) نقوش، ادبی معرکے نمبر ا، ادارہ فروغ اردو، لاہور، شمارہ ۱۲۷، ۱۹۸۱ء

۲) تاریخ ادب اردو، مترجم مرزا محمد عسکری، علمی کتاب خانہ، لاہور، ص ۷۱

۳) قواعد پنجابی، مقبول بیگ بدخشانی، اردو بازار لاہور، ۱۹۷۳ء

۴) اردو صرف و نحو، مولوی عبدالحق، انجمن ترقی اردو، علی گڑھ، ۱۹۶۹ء

۵) جدید نسیم اللغات اردو، لاہور، ۱۹۸۴ء

۶) علمی اردو لغت، علمی کتاب خانہ، لاہور، ۱۹۸۳ء

۷) ضمیمہ "روسی اردو ڈکشنری" اردو گرائمر کا مختصر خاکہ، ماسکو، ۱۹۵۹ء

۸) پنجابی اردو لغت، تنویر بخاری، اردو سائنس بورڈ، لاہور، ۱۹۸۹ء

۹) ماہنامہ "چاند" لاہور، دسمبر، ۱۹۸۹ء، ص ۴۳

۱۰) "بگولے" احمد ندیم قاسمی، گلوب پبلشرز، لاہور، ۱۹۸۶ء

۱۱) "وارث" امجد اسلام امجد، ماورا پبلشرز، لاہور، ۱۹۸۸ء

۱۲) "کالعدم تحریریں" قمر زمان، پیپلز پبلیکیشنز، لاہور، ۱۹۸۴ء

۱۳) "خندہ مکرر" عطاالحق قاسمی، غالب پبلشرز، لاہور، جنوری، ۱۹۸۷ء

۱۴) "عطائیے" عطاءالحق قاسمی، غالب پبلشرز، لاہور، جنوری، ۱۹۸۳ء

۱۵) "اک تیرے آنے سے" قدسیہ بانو، المرا پبلشرز، لاہور، ۱۹۶۲ء

۱۶) روزنامہ امروز، لاہور، ۱۴ اگست ۱۹۷۰ء، ص ۵

۱۷۔ عطاالحق قاسمی "خندِ مکرر" غالب پبلشرز لاہور ۱۹۸۷ء، ص ۳۲

۱۹، ۲۲، ۲۳۔ احمد ندیم قاسمی "بگولے" گلوب پبلشرز لاہور، ۱۹۸۶ء، ص ۱۵۰، ۲۲۶، ۱۳۹۔

۲۰، ۲۴۔ امجد سلام امجد "وارث" ماورا پبلشرز لاہور، جون ۱۹۸۸ء، ص ۲۱۰، ۲۶۲

۲۱۔ تنویر سپرا "لفظ کھردرے" مکتبہ فنون لاہور، ۱۹۸۲ء، ص ۹۱

۲۵، ۲۶۔ میرزا ادیب "حسرت تعمیر" مقبول اکیڈمی لاہور، ۱۹۸۹ء، ص ۱۹۳، ۵۹

۲۷، ۲۸، ۲۹۔ عطاالحق قاسمی "خندِ مکرر" غالب پبلشرز لاہور، جنوری ۱۹۸۷ء، ص ۲۱، ۱۸، ۲۵

۳۰۔ قدسیہ بانو "اک ترے آنے سے" المرا پبلشرز لاہور، بار اول، ۱۹۶۲ء، ص ۲۵

اردو زبان، روشن مستقبل

(پشاور کے حوالے سے)

تاج الدین

تہذیب آدم کے ارتقاء کے ساتھ زبانیں ردو بدل، ترقی و زوال اور نشیب و فراز کے مراحل سے گزرتی ہیں۔ کسی زبان کی ترقی اور زوال، ہمہ گیری اور معدومیت میں جغرافیائی سرحدیں، مٹی اور آب و ہوا اور سیاسی حالات و عوامل بنیادی کردار ادا کرتے ہیں۔ لسانیات کا ارتقائی سفر زمانی کے ساتھ مکانی بھی ہوتا ہے۔ تاریخ کے مطالعے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ کسی زبان کا مکانی سفر مختلف النوع حادثات اور سیاسی عوامل کا نتیجہ ہوتا ہے۔ زبانوں کا یہ مکانی سفر کسی زبان کی ترقی میں اہم کردار ادا کرتا ہے کیونکہ لسانیات کے مکانی سفر میں مختلف خطوں کی آب و ہوا، مزاج، ان خطوں میں بسنے والے مختلف لوگ (جو مختلف بولیاں بولتے ہیں) اور سیاسی ضرورتیں معمولی زبان یا بولی کو علمی اور ادبی زبان کی صورت اور درجہ دے دیتی ہیں۔

یہاں لسانیات کا ایک اہم نکتہ مد نظر رہے کہ جس طرح کوئی زبان فرد واحد یا گروہ تخلیق اور رائج نہیں کر سکتا اسی طرح کوئی بڑی یا چھوٹی زبان نہ تو ختم ہو سکتی ہے اور نہ ختم کی جا سکتی ہے بلکہ اصول یہ رہا ہے کہ جو زبانیں (مختلف علاقوں میں) مختلف ادوار میں بولی جاتی تھیں وہ یا تو ارتقائی عمل سے گزر کر نئی شکل اختیار کر گئیں یا کوئی بولی (زبان) سیاسی عمل یا نقل مکانی (حادثاتی یا ضرورتاً) کی وجہ سے کسی اور زبان میں جذب ہو گئی۔ لیکن اپنی خصوصیات سے دوسری زبان (جس میں جذب ہوئی) کو ضرور متاثر

(لہجے اور لفظی مواد کو) کر گئی۔

اردو زبان اپنے آغاز سے آج تک زمانی سفر کے ساتھ ساتھ مسلسل مکانی سفر سے دوچار ہے اس زبان کی تاریخ میں یہ نکتہ اہمیت کا حامل ہے کہ اردو زبان کا مکانی سفر زیادہ تر سیاسی رہا ہے۔ اردو زبان اپنے ہر دو سفروں میں مسلسل ترقی کرتی رہی، مختلف ادوار اور مختلف خطوں کے سفر میں اس کا لہجہ اور مزاج تبدیل ہوتا رہا۔ اس زبان کا یہ ارتقائی سفر ایک روشن مستقبل کی طرف جاری ہے اور یقیناً مستقبل کی اردو آج کی نسبت نئے لہجے کی جدید اردو ہوگی۔ اس ضمن میں ایک اہم نکتے کی وضاحت ضروری ہے، اس تجزیاتی مضمون کا دارومدار پاکستان کی جغرافیائی حدود بلکہ پاکستان کے وجود سے وابستہ ہے کیونکہ جدید دنیا میں ملک بنتے اور ٹوٹتے ہیں۔ حال ہی میں کمیونسٹ بلاک (خصوصاً سویت یونین) کی شکست و ریخت نے مختلف زبانوں پر گہرا اثر ڈالا اور یوں بعض زبانوں (فارسی اور ترکی) کی اہمیت اور افادیت میں اضافہ کر دیا جبکہ دوسری طرف نو آزاد مسلم ممالک میں روسی زبان (جو لازمی تھی) کا اثر و رسوخ ختم ہوتا نظر آ رہا ہے۔ اسی طرح ماضی قریب میں تقسیم ہندوستان کے بعد ہندی (سنسکرت، آمیز) کو سرکاری زبان قرار دینے سے اردو زبان کو بھارت میں شدید دھچکا لگ چکا ہے۔

زبان کا تعلق اگر ایک طرف قوم (نسل) کے ساتھ ہے تو دوسری طرف مٹی (جغرافیائی حدود) سے اس کا رشتہ بھی انتہائی گہرا ہوتا ہے۔ زبان کا مٹی کے ساتھ تعلق اور اثر وقت کے ساتھ گہرا ہوتا جاتا ہے۔ اس کی مثال ہم آج کے دور کے حوالے سے عربی، انگریزی اور ہسپانوی (اسپینش) کی صورت میں دے سکتے ہیں اس لیے کہ یہ تینوں بڑی زبانیں تین قوموں (بڑی حد تک) میں ایک سے زائد ممالک میں بولی جاتی ہیں اور ان ممالک کے مابین ہزاروں میل کا فاصلہ موجود ہے اسی فاصلے کی بنا پر مختلف علاقوں کی مٹی کے مزاج اور آب و ہوا کے زیر اثر ہم دیکھتے ہیں کہ ان تینوں مذکورہ زبانوں میں

سے ہر ایک زبان مختلف ممالک میں کافی حد تک الفاظ کے اختلاف اور مختلف لہجوں میں بولی جاتی ہیں مثلاً:۔

عربی: مراکش، مصر، سعودی عرب، عراق اور امارات وغیرہ

انگریزی: برطانیہ، امریکہ، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ وغیرہ

ہسپانوی: اسپین، میکسیکو، برازیل، ارجنٹائن وغیرہ

اگرچہ آج کے دور کے جدید مواصلاتی نظام نے علاقوں، خطوں اور ملکوں کے فرق کو بڑی حد تک ختم کر دیا ہے۔ آج ایک علاقے کا ادب دوسری جگہ باسانی دستیاب ہے۔ اسی طرح ہم دیکھتے ہیں کہ اردو زبان بھی مختلف علاقوں میں معمولی اختلاف کے ساتھ مختلف لہجوں میں بولی جاتی رہی ہے اور مستقبل میں اس خطے (پاکستان) کے مختلف علاقوں میں مزید ارتقائی عمل سے گزر کر اسی لسانی اصول کے تحت مختلف لہجوں میں بولی جائے گی۔

اردو زبان کی خوش قسمتی کہ قیام پاکستان کے ساتھ ہی اسے قومی زبان کا درجہ دیا گیا۔ یہ زبان اپنی ارتقائی منازل میں پنجاب سے اپنے سفر کا آغاز کرکے دہلی، دکن اور پھر شمالی ہند پہنچی اور اب پاکستان کے مختلف علاقہ اس کے ارتقاء کی منزل بن رہے ہیں۔ قیام پاکستان سے قبل دہلی، لکھنؤ، علی گڑھ، رام پور، بھوپال، حیدر آباد اور لاہور (ادب کی حد تک) وغیرہ اردو زبان کے حوالے سے بڑے مراکز تھے اور اردو ادب، نظم و نثر کا بیشتر حصہ انہی شہروں میں تخلیق ہوا۔ قیام پاکستان کے وقت پاکستان کی جغرافیائی حدود میں لکھنؤ، دہلی اور حیدر آباد دکن وغیرہ جیسا کوئی بھی اردو دان طبقے کا شہر یا علاقے نہیں تھا لیکن یہی ایک زبان (اردو) تھی جو اس خطے کی کسی بھی دوسری زبان (علاقائی، صوبائی یا بین الاقوامی) کے مقابلے میں زیادہ اثر رکھتی تھی۔ اگرچہ بد قسمتی سے حکمرانوں

نے اس زبان کی طرف توجہ نہ کی لیکن چونکہ یہ اس مٹی کی زبان ہے اور زیادہ اثر پذیر ہے اس لیے یہ خود مقبول ہوتی گئی اور آج پاکستان اور خصوصاً پاکستان کے شہری علاقوں میں اردو کے وہ خدوخال بنتے جا رہے ہیں جو اپنے علاقائی رجحانات کی بنا پر پاکستانیت لیے ہوئے ہیں۔ دوسرے یہ پہلو بھی سامنے آ رہا ہے، جس طرح ماضی میں ہندوستان کے کئی ایک علاقے (شہر) اردو زبان و ادب کے مراکز اور دبستان کا درجہ رکھتے تھے، اسی طرح آئندہ سات آٹھ عشروں میں پاکستان کے مختلف شہر اور علاقے بھی اردو زبان و ادب کے مراکز اور دبستانوں کا درجہ اختیار کر جائیں گے۔

مستقبل میں اردو کیا روپ دھارے گی، اس کے بارے میں دو ٹوک بات کرنا ممکن نہیں ہے لیکن اس مضمون کے لکھنے کا محرک ہی وہ اسباب ہیں جن کی بنا پر مجھے اس زبان کے روشن مستقبل اور نئے روپ (جو یقیناً آج سے مختلف ہوگا) کے بارے میں لکھنے پر مجبور کیا۔ اردو زبان کی نشوونما اور ترقی کے اسباب پر بات کرنے سے پہلے ایک نظر پاکستان میں بولی جانے والی بولیوں اور زبانوں (اپنے اثر کی وجہ سے) پر ڈالنا ضروری ہے۔ پاکستان کی موجودہ تقسیم صوبائی ہے اور ہر صوبے میں ایک سے زائد بولیاں بولی جاتی ہیں۔ بلوچستان میں پشتو، بلوچی، سرائیکی اور براہوی جبکہ سندھ میں سندھی، اردو اور سرائیکی بولی جاتی ہیں۔ اسی طرح پنجاب میں پنجابی، سرائیکی، پوٹھوہاری، پہاڑی اور اردو وغیرہ جبکہ صوبہ سرحد میں ہندکو، پشتو، گوجری، کھوار (چترالی) اور سرائیکی جیسی زبانیں اور بولیاں رائج ہیں۔ پاکستان کی یہ مختلف بولیاں اردو زبان پر اثر انداز ہو رہی ہیں اور لاشعوری اور غیر محسوس طور پر ان مختلف زبانوں کے الفاظ اپنے کلچر کے ساتھ اردو زبان میں داخل ہو رہے ہیں۔ ان رجحانات اور نئے ابھرنے والے خدوخال میں پاکستان کے مختلف شہر بنیادی کردار ادا کر رہے ہیں اور ان رجحانات کو محسوس کرتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ مستقبل کی اردو (پاکستانی اردو) آج سے اور ڈیڑھ دو سو سال پہلے

کی اردو سے کافی حد تک مختلف ہوگی۔ بنظر غائر مطالعے (حالات و رجحانات) سے (میرے نزدیک) اس ترقی اور ارتقاء کے جو اسباب سامنے آتے ہیں ان میں اردو کا قومی رابطے کی زبان، ذرائع ابلاغ کی زبان اور علمی و تعلیمی زبان ہونا سرفہرست ہے۔

اگرچہ یہ نکات اور عوامل باہم ایک دوسرے سے منسلک بھی ہیں لیکن ان میں سے ہر سبب اپنے طور پر بھی اردو زبان کے فروغ بلکہ جدید اردو کے پروان چڑھانے میں اہم کردار ادا کر رہا ہے۔

قیام پاکستان کے ساتھ ہی (جو بظاہر بھی جغرافیائی خطے کی زبان نہ تھی) اردو کو دور اندیشی کی بنا پر قومی زبان کا درجہ دیا گیا۔ انگریزی اس ملک کی سرکاری زبان رہی لیکن انگریزی چونکہ اس زمین سے میل نہیں کھاتی، یہ ہمارے مزاج اور ثقافت سے دور کا تعلق بھی نہیں رکھتی، اس لیے آج پچاس سال گزرنے کے بعد بھی عوام میں اپنی جڑیں پیدا نہ کر سکی۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ہر سال ہر درجے کے امتحانوں میں طالب علم انگریزی مضمون میں سب سے زیادہ فیل ہوتے ہیں اور پھر اہم دلیل یہ بھی ہے کہ باوجود اتنے اثر و رسوخ کے نہ تو ہم نے اس زبان میں کوئی بڑا شاعر پیدا کیا اور نہ ہی بڑا ادیب۔ ہاں یہ درست کہ اس زبان نے اپنے اثرات اردو پر ڈالے ہیں۔ سینکڑوں انگریزی الفاظ آج اردو میں مستعمل ہیں۔ لیکن یہ بھی اردو زبان کی خوبی ہے (اور ہر بڑی زبان کی یہ خوبی ہوتی ہے کہ وہ دوسری زبانوں کے الفاظ کو جذب کرتی ہے) کہ وہ ہر زبان کے الفاظ کو قبول کر کے اپنے وجود کو وسعت دے رہی ہے۔ سرکاری طور پر نظر انداز ہونے کے باوجود آج اردو زبان بھرپور رابطے کی زبان ہے۔ تجارت، ملازمت اور سیاحت (بین الصوبائی) میں یہ زبان وسیلہ ہے، اسی رابطے کی زبان ہونے کی وجہ سے پاکستان کے مختلف علاقوں کے لوگ اپنے لہجے کے ساتھ علاقائی زبانوں کے الفاظ بھی اردو میں بے دریغ استعمال ہوتے ہیں۔

جدید دنیا میں میڈیا کے اثر سے انکار نہیں کیونکہ یہ ملکی اور بین الاقوامی سطح پر زبانوں کی ترویج اور فروغ کا اہم ذریعہ ہے۔ ہمارے ہاں اخبارات، ریڈیو اور ٹیلی وژن کا دائرہ وسیع ہو رہا ہے۔ اردو زبان کے فروغ میں ٹیلی وژن ہمارے ملک میں سب سے زیادہ مؤثر ثابت ہو رہا ہے، پاکستان بھر میں ٹیلی وژن کی نشریات جہاں دیکھی جاتی ہیں وہاں ان پڑھ لوگ بھی اردو سمجھ اور کم خواندہ افراد بھی باسانی اردو بول سکتے ہیں۔

ہمارا نظام تعلیم طبقات میں بٹا ہوا ہے لیکن ملک کی غالب اکثریت جن تعلیمی اداروں کا رخ کرتی ہے وہاں ذریعۂ تعلیم اردو زبان ہے۔ یہی وجہ ہے کہ طالب علم اپنے خیالات کا اظہار اس زبان میں (نسبتاً کسی اور زبان کے) بآسانی کرتے ہیں۔ بڑے شہروں میں جہاں ایک سے زائد مادری زبانیں بولی جاتی ہیں، طالب علم باہمی بات چیت اردو زبان میں کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ اردو نے اس ملک میں جلد ہی علمی زبان کا درجہ اختیار کر لیا ہے۔ آج اس ملک کا دانشور طبقہ اسی زبان کو وسیلۂ اظہار بناتا ہے۔ زندگی کے ہر شعبے سے متعلق تجاویز اس زبان میں دستیاب ہیں۔ الغرض تعلیم و تحقیق کا کام اس زبان میں بھرپور ہونے کی وجہ سے اس کی اہمیت تیزی کے ساتھ قبول کی جا رہی ہے۔

اردو زبان کے فروغ اور جدید لہجے کی تشکیل میں سب سے اہم نکتہ اور سبب یہ ہے کہ پاکستان کے مختلف شہر مختلف زبانوں (بولیوں) کے سنگم ہیں۔ ایک طرف ہمارے اکثر شہر مثلاً پشاور (ہندکو، پشتو، اردو اور فارسی)، کوئٹہ (پشتو، فارسی، اردو اور بلوچی)، کراچی (اردو، پنجابی، سندھی، پشتو)، حیدر آباد (اردو، سندھی اور پنجابی)، اسلام آباد (تقریباً ہر پاکستانی زبان)، ملتان (پنجابی، اردو اور سرائیکی) وغیرہ بنیادی طور پر دو یا دو سے زیادہ زبانوں اور بولیاں بولنے والی آبادی کے مستقل شہر ہیں یا ہو چکے ہیں۔ دوسری طرف تعلیم، تجارت، ملازمت اور سیاحت کی غرض سے پاکستان بھر سے لوگ

شہروں کا رخ کر رہے ہیں۔ بذات خود یہ نکتہ اور سبب کہ پاکستان کے مختلف شہر مختلف زبانوں اور بولیوں کے سنگم ہیں، یہاں اگر ایک طرف ایک شہر میں مقامی آبادیاں (جو مختلف بولیاں اور زبانیں بولتے ہیں) ایک دوسرے سے اظہار کے لیے اردو زبان کو ذریعہ بناتی ہیں تو دوسری طرف باہر سے آنے والے (تعلیم، ملازمت، تجارت اور سیاحت کی غرض سے) صرف اردو ہی میں بات چیت کرتے یا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یوں بولی جانے والی زبان (اردو) میں کئی ایک بیرونی الفاظ (پاکستان کی مختلف علاقائی زبانوں کا الفاظ) بھی استعمال ہوتے جا رہے ہیں۔ قیام پاکستان کے پچاس سال ہونے کے بعد یہ حیرت انگیز حقیقت سامنے آ رہی ہے کہ چند شہر تو بڑی حد تک اردو خواں ہوگئے ہیں جو کبھی بھی اردو خواں شہر نہ تھے۔

جس طرح کسی زمانے میں (آج بھی ایک حد تک) انگریزی بولنا قابل فخر گردانا جاتا تھا اور یہی زبان تہذیب کی علامت (بزعم خود) سمجھی جاتی تھی، اسی طرح آج متوسط اور غریب طبقے (اصل اکثریت) میں اس زبان (اردو) کا استعمال بھی اسی طرح قابل فخر سمجھا جاتا ہے۔ اب تو ملک کے بیشتر شہروں میں یہ رجحان تیزی سے پھیل رہا ہے کہ شہروں میں آباد گھرانے بچوں سے اردو میں بات چیت کرتے ہیں اور ایسے شہر جہاں کی زبانیں اردو سے نزدیک تر ہیں، وہاں تو خاص طور سے اب اردو ہی میں بات چیت ہونے لگی ہے۔ پنجاب کے شہری علاقوں اور صوبہ سرحد کے ہندکو دان شہروں میں پڑھے لکھے گھرانوں میں اب پنجابی اور ہندکو کی بجائے اردو عام مستعمل ہے بلکہ کچھ ایسے گھرانے بھی سامنے آ چکے ہیں کہ جہاں بچے مادری زبان (والد اور والدہ کی زبان) بول ہی نہیں سکتے اور یہی رجحان آگے جا کر جدید پاکستانی اردو کی تشکیل میں بنیادی کردار ادا کرے گا۔

اردو زبان کی ابتداء و آغاز اور ترویج و ترقی میں علماء کرام اور مشائخ عظام کا کردار

شروع ہی سے واضح ہے۔ دین کی تبلیغ کے سلسلے میں وہ یہاں کی مقامی زبان سیکھ کر عوام سے ان کی زبان میں بات چیت کرتے تھے۔ گذشتہ اور اس صدی کے پہلے تین چار عشروں میں دیوبند کے کردار سے کون واقف نہیں۔ پاکستان میں علماء کی اکثریت ہندوستان کے دینی مدرسوں کی فارغ التحصیل یا ان کے شاگردوں پر مشتمل ہے۔ آج پاکستان بھر کے بڑے بڑے مدرسوں میں دوسری زبانوں کے ساتھ ساتھ اردو پڑھائی جاتی ہے۔ خود علماء بڑی فصیح اردو بولتے ہیں۔ اس سلسلے میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ ہمارے علماء نے مذہب سے متعلق زیادہ تر لٹریچر اردو ہی میں تخلیق کیا ہے۔ مذہب اسلام کا ایسا کوئی موضوع نہیں جس پر مختلف علماء کی سینکڑوں کتابیں دستیاب نہ ہوں۔ عربی اور فارسی کے بعد اردو زبان ہی میں مذہبی لٹریچر سب سے زیادہ لکھا گیا اور لکھا جا رہا ہے۔ آج پاکستانی عوام کا اپنے مذہب سے اردو زبان ہی کے ذریعے تعارف ہو رہا ہے۔

اردو زبان کے فروغ، الفاظ کے لین دین اور نئے لہجے کے بننے میں ایک حیرت انگیز نکتہ "شادی" بھی ہے۔ پاکستان کے کئی ایک شہر ایسے ہیں جہاں کئی ایک بولیوں اور زبانوں کا رواج ہے جس کا پہلے ذکر ہو چکا ہے۔ اس لیے کئی ایک شہری علاقوں میں ایسی شادیاں جن میں مرد اور عورت دو الگ زبانوں (بولیوں) سے وابستہ ہوتے ہیں، شادی کے نتیجے میں اردو کو ذریعۂ اظہار بناتے ہیں۔ پشاور، کوئٹہ اور کراچی و حیدر آباد میں یہ عمل تیزی کے ساتھ جاری ہے۔ اس طرح کی شادیوں کے نتیجے میں پیدا ہونے والے بچے خاص طور پر اردو میں بات کرتے نظر آتے ہیں اور اکثر اس طرح کے بچے مادری زبان سے پہچان ہی نہیں رکھتے۔

ان تمام اسباب و حالات کے تجزیے سے یہ بات سامنے آ رہی ہے کہ پاکستان کی موجودہ جغرافیائی حدیں اردو زبان کی ترقی میں اہم کردار ادا کر رہی ہیں اور اردو زبان

موجودہ سفر میں مختلف دھاروں کے ساتھ آگے بڑھ رہی ہیں۔ آئندہ صدیوں میں جس روپ کی زبان سامنے آئے گی وہ "پاکستانی اردو" ہوگی جو یقیناً الفاظ اور لہجے کے حوالے سے آج کی اور دہلی، لکھنؤ کی اردو سے مختلف ہوگی۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ مختلف صوبوں میں بھی اس کے مختلف لہجے محسوس کیے جا سکیں گے کیونکہ اس کے خدوخال ابھی سے ظاہر ہورہے ہیں۔

اب میں پاکستان کے ایک شہر یعنی صوبہ سرحد کے دارالحکومت کو مثال کے طور پر پیش کرکے اپنے مقالے کے عملی اطلاق کی طرف آتا ہوں۔ ماضی کی روایتوں کا امین، حال کے عبوری رجحانات کا حامل اور مستقبل میں اردو زبان و ادب کا ایک مرکز پشاور، اپنے صحت مند لسانی رجحانات کی بنا پر امید کا روشن مینار ہے۔ دراصل پشاور پر ایک علیحدہ عنوان سے اپنے خیالات کا اظہار اس لیے ضروری سمجھا کہ بنیادی طور پر اسی شہر کے لسانی رجحانات نے اس مضمون کو لکھنے پر ابھارا۔

صوبہ سرحد میں پشتو کے علاوہ بھی زبانیں اور بولیاں بولی جاتی ہیں۔ ہندکو صوبہ سرحد کی دوسری بڑی زبان ہے۔ ہندکو زبان (پشاوری، کوہاٹی، ڈیرہ کی سرائیکی اور ہزاروی) معمولی اختلاف سے صوبہ بھر میں جگہ جگہ بولی جاتی ہے۔ ماہرین لسانیات کے نزدیک ہندکو "لہندا" کی ایک شاخ (پنجابی اور ہندکو میں ۸۰ فی صد اشتراک ہے) ہے۔ قیام پاکستان کے وقت پشاور اپنی زبان (ہندکو) کے ساتھ ایک مخصوص کلچر سے بھی عبارت تھا اور یہ کلچر بہت حد تک ایک طرف لاہور اور دہلی اور دوسری طرف وسط ایشیاء سے مماثلت رکھتا تھا۔ قیام پاکستان کے بعد پشتون علاقوں (مہمند، باجوڑ، چارسدہ، مردان، دیر اور سوات وغیرہ) سے آبادی کا انتقال پشاور کی طرف ہوا۔ جو بدستور جاری ہے اور یوں آج ہندکو دان طبقے کے مقابلے میں پشتون آبادی زیادہ ہوگئی ہے۔ اس کے ساتھ افغان بحران کی وجہ سے لاکھوں پشتون اور فارسی بولنے والے گذشتہ پندرہ سال

سے پشاور و بیرون کے گرد و نواح میں بس رہے ہیں۔ باہر سے آنے والے چونکہ مختلف علاقوں سے آ کر پشاور میں آباد ہو رہے ہیں، اس لیے پشاور کا مخصوص کلچر گذشتہ چالیس سالوں سے شدید متاثر ہوا ہے اور اب پشاور رنگ اندرون شہر کے چند مخصوص علاقوں تک محدود ہوتا نظر آ رہا ہے۔ یوں زمانی سفر اور بیرونی آباد کاروں کی وجہ سے پشاور کلچر کے حوالے سے ایک عبوری دور سے گزر رہا ہے۔ نئے تہذیبی رجحانات اور مختلف قوموں اور زبانوں کے سنگم کا شہر آئندہ چند عشروں میں ایک امتزاجی ثقافت کا علمبردار شہر بن جائے گا۔

پشاور کے مخصوص پس منظر پر بات ہونے کے بعد میں اس مضمون کی بنیادی تحریک کی طرف آتا ہوں کہ آئندہ سات آٹھ عشروں میں اور یقینی طور پر بائیسویں صدی میں پشاور پاکستان کا ایسا شہر ہو گا جس کی زبان (اردو) اس مٹی کی اردو ہو گی جس کا لہجہ یقینی طور پر سے مقامی اور دوسرے مراکز سے مختلف ہو گا یہاں یہ بتانا ضروری سمجھتا ہوں کہ سندھ کے شہری علاقوں میں آج بھی اردو کا راج اور رواج ہے۔ اس کے لہجے پر بھی مقامی آب و ہوا اور لسانیات کا اثر ہے لیکن اردو ان شہروں کی اپنی زبان نہیں ہے۔ ہجرت کے وقت بڑی تعداد میں اردو دان طبقے نے ان شہروں کو اپنا مسکن بنا لیا تھا۔ دوسری طرف پنجاب کے شہری علاقوں میں پنجابی اور اردو میں قریبی مماثلت کی بنا پر اردو سے جان پہچان عام ہے لیکن اتنی بڑی تعداد میں یہ گھروں میں نہیں بولی جا رہی ہے جتنی پشاور میں آج اور کل بولی جائے گی۔ کسی بات کا دعویٰ کرنا آسان ہے لیکن تجزیاتی طور پر ثابت کرنا دلائل کا متقاضی ہے اور آج لسانیات ایک سائنسی عمل کے مترادف ہے یہاں چونکہ دو سوال لازم و ملزوم بھی ہیں اس لیے حقائق کا تجزیہ کرتے ہوئے اپنے دعوے کی دلیل میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ پشاور کے حالات پاکستان کے کسی بھی خطے اور شہر سے الگ ہیں۔ اس سلسلے میں دو نکات پیش کر رہا ہوں۔

۱) پشاور دو بڑے اور مختلف گروہوں کی زبانوں کا مرکز ہے۔

(الف) پشتو: فارسی اوستا

(ب) ہندکو: سنسکرت (ایک خیال)

ہندکو: دراوڑ (دوسرا خیال)

۲) تجربے اور مشاہدے کی روشنی میں یہ بات سامنے آ رہی ہے کہ پشاور کے باشندے بہت تیزی سے (شعوری اور لاشعوری طور پر) اردو قبول کر رہے ہیں۔ اس کے ساتھ اردو کا ضرورتاً استعمال عادت (یا مستقل طور سے اس زبان کا اپنانا) بنتی جا رہی ہے۔

پشاور کا ایک مستقل اردو والے شہر کے طور پر اُبھرنا اور لب و لہجے کا منفرد رنگ ہونا انہی دو نکات کا پیش خیمہ ثابت ہو رہا ہے۔ یہاں دوسرے سوال کا جواب پہلے دیا جا رہا ہے کیونکہ اس سوال کا تعلق لسانیات کے سادہ اصولوں سے ہے۔ لہجے کا اور الفاظ کا اختلاف اور ایک حد تک تذکیر و تانیث کا فرق زمینی ساخت اور آب و ہوا کے ساتھ ساتھ کسی خطے میں وہاں موجود زبانوں اور بولیوں کے سنگم پر ہونے سے ہے۔ اس لیے ہم دیکھتے ہیں کہ انہی مختلف آب و ہوا اور پھر زبانوں کے منفرد سنگم کی بنا آج بھی پشاور میں جو اردو بولی جا رہی ہے اس میں لہجے اور الفاظ کے فرق کو محسوس کیا جا سکتا ہے اور مستقبل میں یہ فرق مزید واضح ہو جائے گا۔

اب ہم پہلے سوال کی طرف آتے ہیں کہ پشاور وہ پاکستانی شہر ہے کہ جو مقامی اور خالص پاکستانی اردو کے طور پر ایک ٹھوس مرکز کی صورت میں اُبھر رہا ہے۔ دراصل یہ تجزیاتی دعویٰ مذکورہ بیان کردہ دو نکات کا نتیجہ ہے اور آخر الذکر نکتہ کہ پشاور کے لوگ بہت تیزی سے (شعوری اور لاشعوری طور پر) اردو قبول کر رہے ہیں۔ دراصل اس کی

وجوہات وہ عوامل ہیں جن کا اطلاق پشاور پر (کسی دوسرے پاکستانی شہر کی نسبت) سب سے زیادہ ہوتا ہے اور انہی حالات اور رجحانات کو مد نظر رکھتے ہوئے حقیقت پسندانہ تجزیے کی بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ آئندہ ۷۰/۸۰ سال بعد پشاور کی نصف آبادی (تقریباً دس لاکھ) خالص اردو خواں (جدید پاکستانی اردو) ہو گی کیونکہ یہاں کا ہندکو دان طبقہ مکمل طور پر اور پشتونوں کی بڑی تعداد اردو کو گھریلو طور پر قبول کر لے گی۔ اس کے واضح آثار آج دیکھے جا سکتے ہیں کہ پشاور میں بڑی تعداد میں ہندکو اور پشتو گھرانے اب گھروں میں اردو بولتے نظر آتے ہیں۔ یہ نکتہ بھی مد نظر رہے کہ آئندہ نصف صدی میں بہت کم لوگ (ہزاروں کی تعداد) ہندکو سے وابستہ نظر آئیں گے۔

چونکہ یہ مضمون تمام تر تجزیاتی ہے اس لیے بعض نکات کا اعادہ بار بار ہو رہا ہے جو اگرچہ ایک ادبی مضمون پر بار ہو سکتا ہے لیکن چونکہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ لسانیات کا علم اور لسانیات پر بات کرنا سائنسی عمل بن چکا ہے اس لیے بعض نکات کا اعادہ ابلاغ کی آسانی کے تحت ہو سکتا ہے اور یہاں ایک مرتبہ پھر ان عوامل اور اسباب کا تذکرہ کیا جا رہا ہے جو اردو زبان کی ترقی میں ممد و معاون ثابت ہو رہے ہیں اس لیے کہ ان عوامل اور اسباب کا اثر پشاور کے خطے پر کسی بھی پاکستانی خطے سے زیادہ ہے۔ بیان کردہ تمام اسباب اپنے دائرہ عمل میں اثر رکھتے ہیں لیکن مضمون کو سمیٹنے اور ابلاغ میں آسانی کی خاطر اور دائرہ اثر کے حوالے سے تمام اسباب کو تین نکات کا قالب بنا کر بات آگے بڑھائی جاتی ہے۔

کوئی بھی علمی زبان دنوں، مہینوں اور برسوں میں نہیں بن سکتی مگر بعض اوقات خارجی حالات کے سبب کسی زبان کی ترقی اور ارتقاء کا عمل خاص علاقے میں تیز تر ہو سکتا ہے اور کسی ایک بڑی زبان کا مختلف علاقوں میں ارتقاء کا عمل (ہر جگہ مٹی، آب و ہوا اور حالات مختلف ہو سکتے ہیں) مختلف رفتار سے بھی اس بڑی زبان میں علاقوں کی

نسبت امتیاز پیدا کر سکتا ہے۔ پشاور ہندکو، پشتو اور فارسی (ایک حد تک) کا سنگم ہے۔ اس کے ساتھ اردو زبان کی جڑیں بھی گذشتہ دو صدی سے اس خطے میں پیوست ہیں۔

جنگ آزادی کے وقت "مرتضائی" اخبار کا پشاور سے اجراء اس کا بین ثبوت ہے۔ ہندکو اردو سے قریب تر بولی ہے۔ اردو رابطے کے حوالے سے قومی زبان قرار پائی ہے جس کی بدولت آج اردو ذرائع ابلاغ کی زبان بن چکی ہے۔ ذرائع ابلاغ میں ٹیلی وژن کا اثر اتنا زیادہ اور پائیدار ہے کہ جہاں جہاں ٹیلی وژن کی نشریات دیکھی جاتی ہیں (یہاں تک کہ پاکستان کے دور دراز علاقوں میں بھی) وہاں کے لوگ اردو سمجھ لیتے ہیں اور معمولی تعلیم یا پھر شہروں میں رہائش کی وجہ سے باسانی اردو بول سکتے ہیں۔ پشاور میں دوسرے عوامل کے ساتھ ذرائع ابلاغ (خاص کر ٹیلی وژن) کی وجہ سے ہر پشاوری اردو سمجھ سکتا ہے اور غالب اکثریت اردو بول سکتی ہے۔

پشاور میں جدید اردو کا ارتقاء اور ترقی اور پشاور کے بحیثیت ایک "اردو شہر" اُبھرنے کے پس منظر میں ایک اور اہم وجہ پشتون اور ہندکو دان گھرانوں کے مابین باہمی شادیاں ہوتی ہیں۔ دراصل پشاور ایک ایسا شہر ہے کہ جہاں اگر ایک طرف اتنی بڑی تعداد میں دو مختلف زبانوں (بولیوں) کے شہری آباد ہیں وہاں پاکستان کے کسی بھی شہری علاقے کی نسبت اس طرح مختلف الزبان لوگوں میں باہمی شادیوں کا رجحان بہت زیادہ ہے۔ اس سلسلے میں پشتون گھرانے کی لڑکی اگر ہندکو گھرانے میں بیاہی جاتی ہے یا ہندکو گھرانے کی لڑکی پشتو گھرانے میں آجاتی ہے تو نتیجتاً ہر دو صورتوں میں میاں بیوی کا اردو زبان میں بات چیت کرنے کا رجحان قابل غور ہے۔ یہ عمل دراصل زبردست نفسیاتی محرکات رکھتا ہے کیونکہ درمیانی راستے (اردو) اختیار کرنے سے فریقین لاشعوری اور شعوری طور پر مطمئن رہتے ہیں اور کسی دوسرے کی برتری اور اپنی سبکی کا خیال جاتا رہتا ہے۔ اس بڑھتے ہوئے رجحان کو اس قسم کے گھرانوں کے بچوں

میں زیادہ محسوس کیا جا سکتا ہے۔ اس قسم کی شادیوں (جو بڑی تعداد میں ہو رہی ہیں) کے نتیجے میں پیدا ہونے والے بچے ہندکو اور پشتو سمجھ بھی نہیں سکتے وہ اردو میں گفتگو کرتے ہیں اور جب میں بحیثیت ایک استاد اور تجزیہ نگار اس قسم کے بچوں سے ان کی مادری زبان کی بابت پوچھتا ہوں تو جواباً کہتے ہیں کہ ہماری مادری زبان اردو ہے کیونکہ اس کی وجہ وہی ہے کہ اس طرح کے بچے اپنے والدین کو اردو ہی بولتے سنتے آئے ہوتے ہیں۔

اس تجزیاتی دعوے کے سلسلے میں تیسرے اور اہم سبب پر جو دراصل دو نکات یعنی علمی زبان اور مقام یا رتبے کا مجموعہ ہے اظہار رائے کرتا ہوں۔ پاکستان کے کسی بھی شہر میں وہ گھرانے جو نہایت ماڈرن (الٹرا ماڈرن) کہلاتے ہیں۔ ان گھرانوں میں بہت سی دیگر چیزوں کے ساتھ انگریزی کو رتبے کی علامت (اسٹیٹس سمبل) خیال کیا جاتا ہے اور یہ بات سب کے مشاہدے میں ہے کہ یہ لوگ انگریزی یا انگریزی زدہ اردو میں بات کرتے ہیں۔ (ایسے گھرانے اگرچہ بہت محدود ہیں) اسی تناظر میں بات آگے بڑھاتے ہوئے کہنا چاہتا ہوں کہ وہ گھرانے (خاص کر پشاور کے ہندکو گھرانے) جو تعلیم یافتہ (کسی بھی درجے کے) ہیں اور جو جدید آبادیوں میں منتقل ہو چکے ہیں، وہ "ہندکو" کی نسبت اردو میں بات چیت پسند کرتے ہیں اس سلسلے میں پشاور کے سکولوں اور کھیل کے میدانوں سے یہ بات مشاہدے میں آ جاتی ہے کہ ہندکو گھرانوں کے بچے آپس میں ہندکو کی بجائے اردو ہی میں بات چیت کرتے ہیں۔ یہاں اس نکتے کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ اردو زبان اس خطے کے لیے اجنبی نہیں ہے بلکہ گزشتہ ڈیڑھ صدی سے یہ زبان اس خطے کی علمی زبان ہے اس ضمن میں پشاور کا پہلا اردو اخبار "مرتضائی" سن اجراء ۱۸۵۴ء، اس خطے کی اردو سے وابستگی کی اہم دلیل ہے لیکن اس سے بڑھ کر ایک اور اہم نکتہ یہ رہا ہے کہ پشاور اور صوبہ سرحد کے ہندکو خواں علاقے کے ادب و شاعری اردو ہی کو وسیلۂ اظہار سمجھتے ہیں۔ اس پورے عرصے میں ہندکو زبان کا کوئی بڑا

شاعر اور ادیب سامنے نہیں آیا بلکہ اردو زبان کے بڑے بڑے شاعر اور ادیب مثلاً رضا ہمدانی، فارغ بخاری، پطرس بخاری، قتیل شفائی، محسن احسان، خاطر غزنوی، احمد فراز وغیرہ سامنے آئے۔ ان سب شعراء اور ادباء کی مادری زبان ہندکو ہی ہے اور اکثر نے ہندکو میں شاعری اور نثر بھی تخلیق کی ہے لیکن ان سب کی ملکی اور بین الاقوامی پہچان اردو ہی ہے۔

حالات کا حقیقت پسندانہ تجزیہ کرتے ہوئے یہ محسوس ہوتا ہے کہ اگر حالات اسی ڈگر پہ چلتے رہے تو آج پشاور میں اردو زبان کی قبولیت کے روشن رجحانات اگلی دہائیوں میں ٹھوس اور روشن تر نظر آئیں گے۔ اگلی دہائیوں میں پشاور کی ہندکو بولنے والی آبادی (غالب اکثریت) اور مختلف عوامل کی بنا پر بڑی تعداد میں آج کے پشتون گھرانے بھی اردو کو گھریلو زبان کے طور پر قبول کر کے اردو خواں بن جائیں گے۔ یہی وجوہات ہیں جن کی بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ مستقبل میں پشاور مرکز کی اردو کی ایک الگ پہچان ہوگی۔

اُردو اور سندھی : لسانی و ثقافتی روابط

کریم بخش خالد

اردو اور سندھی کے لسانی و ثقافتی روابط اور ہم آہنگی کے بارے میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور ابھی لکھا جا رہا ہے۔ دراصل عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی۔ اس اقدام اور اہمیت کے بارے میں کچھ عرض کرنے سے گریز کرتے ہوئے ایک قول صادق کا اعادہ کرتا ہوں کہ امر بالمعروف کا اعادہ منفعت بخش عمل ہے۔

تقریباً نصف صدی گزر جانے کے بعد بھی اردو کو متنازع مسئلے کے طور پر بحث و مباحث کا موضوع بنا کر پیش کیا جاتا رہا ہے۔ حالانکہ پاکستان کی سرحدوں اور ملحق علاقوں میں آزادی سے قبل اور قیامِ پاکستان کے بعد فی الواقع ایسا کوئی مسئلہ موجود نہ تھا۔ عوام مسرور و مطمئن تھے اور متمنی تھے کہ آفتاب آزادی کی ضیا پاشیاں غلامی کی باقیات کو پاش کرتے ہوئے ان کے اندوہناک ماضی کا کچھ مداوا کریں گی۔ لیکن الھڑ سیاستدانوں نے آزادی کی فکر کو آزردگی کے عمل سے تبدیل کر دیا۔ ذاتی مفاد کی حاصلات کے لیے بہت سے مسائل پید کیے جن میں ایک لسانی مسئلہ بھی تھا۔ سیاستدانوں اور مہم جو بیورو کریسی کی کوئی قومی زبان نہیں ہوتی۔ بولتے وقت ان کی مادری زبان کے بارے میں بھی شک و شبہ کی گنجایش رہتی ہے۔

نوزائیدہ مملکت پاکستان کے عوام اسلامی ہند اور بعد میں برٹش ہندوستان کے مسلمانوں کی طرح اپنی اپنی علاقائی زبانیں بولتے تھے لیکن وہ ایک مشترکہ زبان اردو سے بخوبی واقف تھے اور اردو میں اپنے احساسات اور جذبات کو نثر و نظم کی صورت میں پیش کرنے کی بھی حسبِ حال صلاحیت رکھتے تھے۔ لیکن سیاست دان اور افسر شاہی طبقہ

سامراجی بندھنوں میں جکڑے ہوئے تھے۔ ان کے قلب و ذہن گوراشاہی کے استکبارانہ بول چال اور رہن سہن سے متاثر تھے۔ انہوں نے بسم اللہ برغلط، فوراً زبان کا مسئلہ اُٹھا کر عوام کو آپس میں اُلجھا دیا۔ قائداعظم (۱۸۷۶ء۔ ۱۹۴۸ء) کے اقوال دہرائے اور بعض علماء نے تو اسلام کو بھی ملوث کرنے کی کوشش کی لیکن انہیں ہزیمت اُٹھانی پڑی۔ بات بالکل واضح اور غیر متنازع تھی۔ قرآن کریم میں ارشاد الٰہی ہے کہ طرح طرح کی بولیاں اور رنگ اللہ کی نشانیوں (آیات) میں سے ہیں (الروم ۲۲) اور رکھیں تمہاری ذاتیں اور قبیلے تاکہ آپس کی پہچان ہو۔ (کیونکہ) تحقیق اللہ کے یہاں وہی معزز و مکرم ہے جو نیک خصلت مؤدب اور پرہیزگار ہو۔ (الحجرات۔ ۱۳)

اس برہان قاطع کے موجب کسی بھی زبان کو کوئی ختم نہیں کرسکتا کیونکہ اللہ کی آیات (نشانیوں) کو مٹایا نہیں جاسکتا۔ ان کی تعظیم و تکریم کرنی چاہیے اور ان کی بحالی اور برقراری کو ایک فریضہ کے طور پر سرانجام دینے کی کوشش کرنی چاہیے۔

وادیٔ سندھ کی زبانوں کا ایک طرف آپس میں لسانی اور معنوی تعلق ہے تو دوسری طرف اردو سے بھی ان کا قریبی رشتہ ہے۔ اردو برج بھاشا سے نکلی ہو یا پنجابی سے۔ ہریانی سے وجود میں آئی ہو یا کھڑی بولی کی بہن ہو۔ سندھ اس کا مولد ہو یا دہلی، دکن میں اس نے پرورش پائی ہو یا شمالی ہند میں۔ بہرحال یہ ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ اردو آریائی زبان ہے اور اس میں دراوڑی زبانوں کی باقیات بھی موجود ہیں۔ وادیٔ سندھ کی زبانوں کی بھی یہی کیفیت ہے۔

سندھ ساگر طاس کی وجہ سے دریائے سندھ کے ذریعے جس کو مولانا ظفر علی خاں مرحوم (۱۸۷۳ء۔ ۱۹۵۶ء) نے بحوالہ نظم مسجد منزل گاہ سکھر نعمت ایزدی اور "رحمت رسول اللہ ﷺ" کہا ہے۔ قدیم زمانہ سے سندھ کے تجارتی روابط عرب افریقہ ہندوستان، جاوا، کوریا، چین اور وسط ایشیائی ممالک سے تھے۔ دوسرے تاجروں کی طرح

سندھی تاجر ایک طرف پنجاب اور کشمیر تک جاتے تو دوسری طرف جنوبی ہند کی بندرگاہوں اور سری لنکا اور جاوا جاتے رہتے تھے۔ شاہ عبد اللطیف بھٹائی (۱۶۹۰ء-۱۷۵۰ء) نے اپنے کلام میں اس کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ سندھ میں سرائیکی زبان کی ایک کہاوت مشہور ہے۔

جو جاوا جائے اوہ مول نہ ول آوے

جو آوے وہ بال بچہ اٹھاوے

یعنی سندھ کا تاجر "جاوا" جاتا ہے تو اتنا خوش حال ہو جاتا ہے کہ جاوا ہی میں سکونت اختیار کرتا ہے۔ اگر واپس آجاتا ہے تو بہت آسودہ حال ہوتا ہے۔ اس طرح شکارپور اور حیدر آباد کے بیوپاری جو "سندھ ورکی" کہلاتے تھے۔ بلخ بخارا، کابل قندھار وسطی ایشیا اور جبرالٹر تک جاتے رہتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وادیٔ سندھ کی مختلف زبانوں کی ایک طرف تو آپس میں گہری مماثلت ہے اور دوسری طرف دکن اور جنوبی ہند کی زبانوں کے ساتھ بھی لسانی رشتہ موجود ہے۔

موجودہ دور میں اگرچہ پاکستان کے مختلف خطوں میں بولی جانے والی زبانیں اپنی اپنی جداگانہ حیثیت رکھتی ہیں پھر بھی تلفظ نحوی ساخت اور الفاظ میں یکسانیت کی وجہ سے ایک دوسرے کے ساتھ کافی مماثلت رکھتی ہیں۔

آثار قدیمہ اور تاریخی ادوار سے متعلق دریافت شدہ مختلف حقائق و شواہد کی روشنی میں معلوم ہوتا ہے کہ باہر سے کئی قبائل مختلف زبانوں کے ساتھ وادیٔ سندھ میں وارد ہوئے بعض نے یہاں سکونت اختیار کی کچھ نقل مکانی کر کے بھارت کے مختلف حصوں میں جا کر آباد ہوئے یہ بھی ہوا کہ فاتح قومیں یہاں آئیں اور پھر واپس چلی گئیں۔ آبادی کی اس طرح نقل و حرکت کے علاوہ ماضی قریب میں وادیٔ سندھ کے لوگوں کا دوسری

کئی قوموں اور زبانوں کے ساتھ تجارتی، ثقافتی اور مذہبی رابطہ بھی رہا۔ مثلاً وی۔ ایف۔ آگیت۔ کی کتاب "سندھ تاریخ کے آئینہ میں" کے پیش لفظ میں گنگوفسکی نے لکھا ہے کہ سترھویں صدی میں دریائے وولگا کے نشیب میں واقع بھاری روسی تجراتی مرکز آستر خان میں وسطی سندھ سے دسیوں سوداگر مستقل طور پر آباد تھے۔ روس اور سندھ کے درمیان سرگرم تجارتی رابطے اٹھارویں صدی کے آخر اور انیسویں صدی کے شروع میں بھی قائم رہے یعنی اس وقت تک جب دریائے سندھ کی وادی کی آزاد ریاستوں پر برطانیہ نے قبضہ نہیں کر لیا تھا۔

اٹھارویں صدی کی آٹھویں دہائی میں شہر اور نبرگ کا باسی گا بائید اللہ امیروف سندھ کے کئی بڑے شہروں مثلاً شکارپور، سکھر، حیدر آباد وغیرہ میں گیا اور اُس نے اپنے سفر کا بہت دلچسپ تذکرہ چھوڑا ہے۔ اس طرح ۱۷۹۸ء میں مفتی محمد امین حسین سندھ گئے۔ انیسویں صدی کی پانچویں دہائی کے شروع میں مشہور روسی ایلکسی سالیتکوف (۱۸۰۶ء- ۱۸۵۹ء) نے سندھ کا سفر کیا۔ ان دونوں حضرات کے سفرنامے نہایت دلچسپ اور معلوماتی ہیں۔

وادیٔ سندھ کے لوگ مدتوں سے عربی زبان سے واقف تھے اور دوسرے ممالک کی زبانوں سے بھی آگاہ تھے یہ چیز ان کی خداداد صلاحیت اور ذہانت پر بھی دلالت کرتی تھی کہ وہ دوسری زبانوں پر ایسے ہی قادر ہوئے جیسے اپنی مادری زبان پر۔

وادیٔ سندھ میں عربوں کے عہد میں سب سے بڑی ترقی یہ ہوئی کہ وادی سندھ کی زبانوں اور محاورات اور روزمرہ میں ایک قسم کی مرکزیت پیدا ہوئی اور ایک جامع "سندھی۔ سرائیکی" زبان (یا جو نام بھی اس وقت اس کا تھا) کی تشکیل ہوئی۔ سندھی، سرائیکی، پنجابی اور اردو میں نہ صرف تاریخی نقطۂ نظر سے اشتراک ہے بلکہ ضرورت کے وہ الفاظ جو روزمرہ کے کاروبار میں شامل ہیں اردو اور سندھی کی طرح سرائیکی اور پنجابی میں

بھی تھوڑی سی ردو بدل کے ساتھ مروج ہیں۔

جناب امیر خسرو (۶۵۱ھ۔ مطابق ۱۲۵۳ء۔ ۱۳۲۵ء) نے مثنوی "نہ سپہر" میں ہندوستان کے مختلف صوبوں کی زبانوں کے نام دیے ہیں مثلاً سندھی، لاہوری، کشمیری، بنگالی، گوڑی گجراتی، تلنگی، معبری، دھور سمندری، اودھی اور دہلوی وغیرہ۔

اسی طرح ابوالفضل (۱۵۵۱ء۔ ۱۶۰۲ء) نے آئینِ اکبری میں مندرجہ ذیل نام دیے ہیں۔

دہلوی، بنگالی، کشمیری، ملتانی، مارواڑی، گجراتی، سندھی، تلنگی، مرہٹی، کرناٹکی، افغانی، شال اور بلوچستانی۔

چوتھی صدی ہجری کے عرب سیاح ابن حوقل نے لکھا ہے کہ منصورہ (سندھ) اور ملتان اور اس کے اطراف میں عربی اور سندھی بولی جاتی ہیں۔ اسی طرح ۳۰۳ھ میں مسعودی (جغرافیہ داں) سندھ اور ہند میں وارد ہوئے۔ اس نے اپنی کتاب "مروج الذہب" میں لکھا ہے کہ سندھ کی زبان ہندوستان کی زبان سے الگ ہے۔ حضرت رومی (۱۲۷۰ء۔ ۱۲۷۳ء) نے بھی اس طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ:

ہر کسے را سیرتے بنادہ ایم
ہر کسے را اصطلاح دادہ ایم
ہندیاں را اصطلاح ہند مدح
سندیاں را اصطلاح سند مدح

(دفتر دوم ص ۱۷۳۔ ۱۷۴)

محمد بن قاسم (۷۵ھ۔ ۹۶ھ/۷۱۵ء) کی فتح سندھ سے قبل سندھ کی زبان

سندھی اور باقی علاقوں کی زبان کو "ہندی" یا "ہندوی" کہا جاتا تھا۔ تاریخ معصومی میں راجہ داہر کے باپ چچ کے بارے میں مذکور ہے کہ وہ "سندھی" اور "ہندوی" زبانوں پر عبور رکھتا تھا اور ان دونوں زبانوں کے رسم الخط سے بھی واقف تھا۔ اس تاریخی حوالے پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر کے ایس بیدی نے اپنی تصنیف "تین ہندوستانی زبانیں" میں لکھا ہے کہ اس بیان سے واضح ہوتا ہے کہ سندھی اور ہندی دو جدا زبانیں تھیں اور ہندی یا ہندوی سے مراد صوبہ پنجاب کی زبان ہے۔

سرائیکی زبان کے لیے بھی "ہندوی" نام رائج ہے۔ بہاولپور کے شاعر لطف علی سیف الملوک والے کہتے ہیں:

لطف علی دے بیت ہندی خم مارن نال نظم دے

(سیفلنامہ: تدوین حکیم محمد صادق رانی پوری ص ۳۴)

سندھ کے سرائیکی شاعر حمل خان لغاری (۱۸۰۲ء۔ ۱۸۷۸ء) کہتے ہیں۔

ہندی بیت حمل دے یارو عالم وچ اظہار تھیے

(کلیات حمل: تدوین ڈاکٹر نبی بخش بلوچ ص ۵۲)

اسی طرح قدیم اردو کو بھی اسی نام سے پکارا جاتا تھا۔ شاہ میراں جی شمس العشاق (متوفی ۹۰۲ھ) اپنے رسالہ "خوش نغز" میں کہتے ہیں:

ہیں عربی بول کیرے اور فارسی بہو تیرے

یہ ہندی بولوں سب اس ارتو کے سبب

(پنجاب میں اردو: حافظ محمود شیرانی ص ۴۰)

قیام پاکستان سے پہلے سندھ کے عوام کے دلوں میں اردو زبان کے سلسلے میں جو نرم گوشہ ملتا ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ اس کی وجہ سندھی اور اردو کے لسانی روابط اور ہم آہنگی ہے۔ شرف الدین اصلاحی نے لکھا ہے کہ اردو اور سندھی برصغیر پاک و ہند کی دو ایسی زبانیں ہیں جن میں بہ ہمہ وجوہ لسانی اشتراک اور ارتباط پایا جاتا ہے۔ اس کا صوتی نظام بڑی حد تک ہم آہنگ ہے۔ ان کے قواعد (صرف و نحو) میں گہری مماثلت ہے۔ ان کا ذخیرہ الفاظ اور ان کا معنوی خزانہ ملتا جلتا ہے۔ ان کا رسم الخط تقریباً ایک ہے۔ ان کی ادبی روایات بھی یک رنگی ہے۔ (اردو سندھی کے لسانی روابط ص ٦١) یہ یگانگت و یک جہتی ان میں اس لیے ہے کہ ان کی تاریخ مشترک ہے۔ ان کی سہ ہزار سالہ بسیط تاریخ نے انہیں اصل مذہب، وطن اور تہذیب و تمدن کے گونا گوں رشتوں میں منسلک کر رکھا ہے۔ آغاز میں وہ ایک تھیں پھر جب وہ الگ ہوئی تو ایک سے تاریخ عوامل نے ان کی صورت گری کی۔ اس کے بعد ارتقاء کے مختلف مراحل میں بھی ان کا دامن ایک دوسرے سے ساتھ بندھا رہا۔ حقیقت یہ ہے کہ سندھی اور اردو ایک ہی خاندان سے تعلق رکھتی ہے جسے ماہرین لسانیات "ہند آریائی خاندان" کہتے ہیں۔ آریاؤں کا جو قبیلہ یا گروہ سندھ میں آباد ہوا اس کی زبان تغیر و تبدل سے دو چار ہوتی ہوئی موجودہ سندھی کی شکل میں ہم تک پہنچی اور جو قبیلہ مدھیہ پردیش (مڈلینڈ) میں سکونت پذیر ہوا ان کی زبان سے اردو (ہندی) نکلی۔ اردو سندھی کے سلسلۂ نسب کی ابتدائی کڑی کو مد نظر رکھیں تو کہا جا سکتا ہے کہ کبھی وہ ایک زبان کی دو بولیاں تھیں۔

سندھی اور اردو کے مابین لسانی رشتے کے بعد دوسرا اہم رشتہ وطنیت کا ہے جو ان دونوں زبان کے مابین لسانی اشتراک و یگانگت کے رشتے استوار رکھنے میں ممد و معاون ثابت ہوا۔ اگر سندھی اور اردو کا وطن ایک نہ ہوتا تو اتحاد ماخذ کے باوجود زبانیں اجنبی ہوتیں اور ان کی ہم رشتگی ممکن نہ ہوتی۔ اردو اور سندھی برصغیر کی زبانیں ہیں۔ دونوں

برصغیر میں پیدا ہوئیں۔ ان کا اشتراک کمیت میں نہ سہی، کیفیت میں اتحاد وطن کا بھی مرہون منت ہے۔ (ایضاً ص ۷۳)

اس پہلو کا دوسرے زاویہ سے جائزہ لیتے ہیں۔ سندھ برصغیر کا ایک دور افتادہ حصہ ہے۔ خصوصاً ہندوستان کے دل دہلی اور مضافات سے جو اردو کا گہوارہ طفلی ہے اس کا فاصلہ بہت زیادہ ہے تاہم اگر ہم تھوڑی سی وسعت نظر سے کام لیں اور اردو سے وہ مراد لیں جو مندرجہ بالا حوالہ جات، خطبات گارساں دتاسی، جارج اے گریئرسن کی "ہندوستان کا لسانی سروے"، اور جان بیمز کی تصنیف Outlines of Indianphilology کے مباحث سے مقصود ہے تو ہم بغیر کسی تاویل کے اسے بمعنی عام اردو کہہ سکتے ہیں۔ گویا انڈور اور جیسلمیر کے پاس اردو سندھی کا جغرافیائی ملاپ ہوتا ہے۔ اس ملاپ کا ایک دوسرا مرکز صوبہ گجرات بھی ہے کیونکہ دونوں ملکوں کی سرحدیں ملتی ہیں اور سمہ دور حکومت میں دونوں ممالک کے حکمران خاندانوں میں رشتہ داریاں بھی تھیں۔ شہرہ آفاق دانشور معلم اور محقق ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ (ولادت ۱۹۱۷ء) نے اپنی تالیف "سندھ میں اردو شاعری" میں لکھا ہے کہ سندھ کے اردو شعرا کا کلام دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کو زبان پر پوری قدرت حاصل ہے اور لسانی اعتبار سے وہ دکن اور شمالی ہند کے ہم عصر اردو شعرا کا تتبع کرتے ہیں۔

صدیاں بیت گئیں۔ تاریخ نے اپنا دائرہ مکمل کیا۔ چشم فلک نے دیکھا، چشم عالم نے نظارہ کیا۔ جب ہندوستان آزاد ہوا تو مسلمان حکمران نہ تھے محکوم تھے۔ آزاد نہیں تھے، مغلوب تھے لیکن قدرت فیاض ہوئی اور مہربان مسلمان سمٹے اور سمٹ کر پھر وہاں آگئے جہاں سے انھوں نے جنوب مشرقی ایشیا کا فاتحانہ سفر اختیار کیا تھا۔ گویا اردو واپس اپنے وطن میں لوٹ آئی۔

قومیں بھانت بھانت کی ہوتی ہیں اور اپنی قومی زبان سے پہچانی جاتی ہیں۔ ایک

قوم نسل سے بنتی ہے جیسے آریا، دراوڑ ترک، منگول وغیرہ۔ ان سب کی زبانیں بھی الگ الگ ہوتی ہیں۔ پرانی یونانی، لاطینی، اوستائی، ویدک اور سنسکرت زبانیں آریائی اور برصغیر پاک و ہند کی زبانیں دراوڑی ہیں۔ ایک قوم دھندے والوں کی ہوتی ہے۔ مثلاً جولاہے، دھوبی، بڑھئی، راج، نائی، میراثی وغیرہ ان کی زبانیں، لہجے، اصطلاحیں، بات چیت کے ڈھنگ، سب کچھ دوسروں سے الگ ہوتا ہے۔ ایک قوم مذہب والوں کی ہوتی ہے جیسے عیسائی، یہودی اور مسلمان۔ ہندوستانی کرشن بھگتوں کی مذہبی زبان اودھی (پوربی) اور سکھوں کی مذہبی زبان پنجابی ہے۔ ایک قوم ملک سے بنتی ہے جیسے روسی، چینی، جرمن، فرنگی، امریکی، فرانسیسی وغیرہ اور ان کی زبانیں بھی الگ ہیں۔

اسی طرح پاکستانی قوم کی زبان بھی دوسری اقوام سے الگ ہونی چاہیے۔ وہ اردو زبان ہے جو عوام کی بھاری اکثریت بولتی اور سمجھتی ہے۔ یونیسکو (UNESCO) کی رپورٹ کے مطابق اردو دنیا کی تیسری بڑی زبان ہے۔ اس کے دو روپ نمایاں ہیں ایک ادبی اور دوسرا عوامی۔ ادبی روپ سارے برصغیر میں قریب قریب یکساں ہے البتہ عوامی روپ ہر خطہ میں قدر مشترک کے ساتھ ساتھ کچھ جداگانہ خصوصیات لیے ہوئے ہے۔ جب ہم اردو کے قدیم سرمایہ پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں ایسے آثار بھی ملتے ہیں جن میں علاقائی اثرات نمایاں ہیں۔ اس سلسلے میں ہم بہ آسانی دکن اور لکھنؤ کا نام لے سکتے ہیں۔ یہاں کے ادب میں ان علاقوں کی تہذیب کا رنگ بہت نمایاں ہے۔ زبان بھی متاثر ہے۔ یعنی زبان کا مزاج بھی تہذیب سے ہم آہنگ ہوگیا ہے۔ دکن کی شاعری سے اس قسم کی سینکڑوں مثالیں دی جا سکتی ہیں۔ میر امن کی "باغ و بہار" میں دہلی اور رجب علی سرور کی "فسانہ عجائب" میں لکھنؤ کی تہذیب و تمدن کی جھلک صاف ظاہر ہے۔

آزادی کے بعد پاکستان کے تقریباً تمام علاقوں سے اور مکاتب فکر کی جانب سے

یہ مطالبہ کیا جانے لگا کہ اردو میں پاکستان کی سرحدوں میں بسنے والوں کی تہذیب و تمدن اور زبانوں کی چاشنی ہونی چاہیے کیونکہ زبان اظہار کا ذریعہ ہونے کے ساتھ ساتھ کسی قوم کی روایات اخلاقی اقدار اور تہذیب و ثقافت کی آئینہ دار بھی ہوتی ہے۔ اس لیے کسی قومی زبان کے لیے ضروری ہے کہ وہ قوم کے تمام طبقوں کا مشترکہ ذریعۂ اظہار ہونے کے علاوہ قوم کی روایات کی امانت دار بھی ہو۔

یہ ایک بروقت اہم مطالبہ تھا لیکن بعض متعصب اور کوتاہ اندیش لوگوں نے اس کو غلط رنگ دے کر اردو جیسی محبوب دل پذیر اور ہمہ گیر زبان کو محض دہلی اور لکھنؤ کے رنگ و آہنگ تک محدود رکھنا پسند کیا جس کی وجہ سے بہت سی مشکلات رنجشوں اور تعصبات نے جنم لیا جس کا خمیازہ ہم اب تک بھگت رہے ہیں۔ بہرحال اردو کے عوامی مزاج کی فتح ہوئی تعصب کی زنجیریں ٹوٹنے لگیں اور مصنوعی حجتیں اور مفروضے بھی ختم ہونے لگے۔ شیر افضل (مرحوم) ایسے جیالے اور ملنگ شاعر تھے۔ جھنگ سیال کے رہنے والے جنھوں نے اس دیس کے باسیوں اور ان کے رہنے سہنے اور زندگی بسر کرنے کے طور طریقوں کو اپنی شاعری میں استعارے اور علامت کا روپ دے کر استعمال کیا اور حب الوطنی کا حق ادا کیا۔ بزرگ شاعر ادیب اور دانشور سید ضمیر جعفری اور معروف صحافی شفیع عقیل نے بھی اس ضمن میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔

پاکستان میں گزشتہ نصف صدی میں دیکھتے ہی دیکھتے اردو کے چمن میں بڑے خوبصورت پاکستانی زبانوں کے نہال پیوند کر لیے گئے ہیں اور ان کی پھبن دیدنی ہے۔ اردو کے خمیر میں صلح کل اخذ و اکتساب ہے۔ اس کی پذیرائی ہونی چاہیے۔ ترقیٔ اردو کے لیے بہت سی انجمنیں، مجلسیں اور ادارے قائم ہیں مگر ان پر بعض وجوہات کے سبب قیلولہ سوار رہا اور اب تک یہ احساس عام تھا کہ بہت سن رسیدہ لوگوں کی طرح ان کے ہاتھ پیر ان کی فکر کا ساتھ نہیں دیتے۔ وہ نیم دلی اور تذبذب میں پڑے شرماتے

رہتے ہیں۔ یہی حال پشتو، پنجابی، بلوچی اور سندھی ادبی بورڈوں کا ہے لیکن مقتدرہ قومی زبان اور اکادمی ادبیات پاکستان اور مجلس زبان دفتری پنجاب چند اسباب کی بناء پر بڑی سرگرمی سے مصروف عمل ہیں اور یہ ان ہی کی کوششوں کا ثمر ہے کہ اب اردو اور پاکستان کی دوسری زبانوں کے معاملے میں ہمارے ذہن احساس کمتری سے پاک ہو رہے ہیں اب شاید ہم اپنے دانشوروں، علما اور فلسفیوں سے رجوع کریں اور اگر ان کے توشہ میں ہماری سیرابی کے لیے کوئی بہتر چیز موجود ہے تو ان کی طرف بھی توجہ دیں اور اس قسم کے کام کے لیے ان ادیبوں اور دانشوروں کی خدمات سے استفادہ کرنا چاہیے جو ان مشاہیر کے فکر و نظر اور لسانی معیار سے کماحقہ، واقفیت رکھتے ہوں اور ساتھ ساتھ اردو سے بھی رشتۂ محبت و التفات میں منسلک ہوں۔

اس ضمن میں ممتاز محقق و نقاد شاعر و دانشور ڈاکٹر شان الحق حقی (ولادت : دہلی ۱۹۰۷ء) کی خدمات قابل ستایش ہیں۔ انہوں نے شکیسپیئر کے شہرۂ آفاق ڈرامے "کلوپیٹرا" کو اردو میں "تہر عشق" کے نام سے منظوم کیا ہے۔ بقول پروفیسر کرار حسین "حقی صاحب نے جس جس مقام اور جس جس طرح اردو کا روزمرہ اور محاورہ استعمال کیا ہے اور اس کو اپنی نظم میں پیوند نہیں بلکہ پیوستہ کیا اور انگریزی ترکیبات کا ترجمہ کرنے کے لیے اردو ترکیبیں ایجاد کی ہیں اور وہ اردو کی فطرت اور مزاج سے ان کی پرانی اور گہری اشنائی کا ثبوت ہے"۔ اور جناب ظ۔ انصاری نے لکھا ہے کہ "شاید مترجم کو خود بھی پتہ نہ چلا ہو کہ جو نازک کٹیلے اور ہلادینے والے موڑ یا جوڑ اس ڈرامے میں آئے ہیں وہاں کتنا لہو پانی ہوا ہوگا"۔

اس طرح آچاریہ کوتلیہ چانکیہ کی رموز سیاست و حکمرانی پر عالمی شہرت یافتہ کتاب "ارتھ شاستر" کا اردو ترجمہ بھی قابل تعریف ہے۔ حقی صاحب کا ایک کارنامہ یہ بھی ہے کہ انھوں نے مشرقی و مغربی زبانوں کے ساتھ ساتھ پاکستان کی مختلف زبانوں

کی تخلیقات کو بھی اردو میں اس خوبصورتی سے منتقل کیا ہے کہ ہر ترجمہ پر تخلیق کا گمان گزرتا ہے۔ ایک سو پچیس منتخب منظومات کے تراجم پر مشتمل یہ بیاض بعنوان "درپن درپن" اردو ادب کو باثروت بنانے کا باعث ہے۔

انھوں نے حال ہی میں ہندوؤں کی مذہبی کتاب "بھگود گیتا" کا منظوم اردو ترجمہ کیا ہے جو اپنی ہیئت ترکیبی، روانی اور مقصدیت کے لحاظ سے اب تک کیے گئے تراجم میں ممتاز حیثیت رکھتا ہے۔ اسے انجمن ترقی اردو (ہند) دلی نے شائع کیا ہے۔

اسی طرح سندھ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے سابق صدر پروفیسر ڈاکٹر نجم الاسلام کئی زبانوں سے بخوبی واقف ہیں ان کے منظوم تراجم کی کیفیت عموماً آورد کی نہیں آمد کی ہوتی ہے۔ سندھ کے عظیم دانشور مفکر اور جامعہ سندھ کے سابق وائس چانسلر علامہ آئی آئی قاضی (۱۸۸٦ء - ۱۹٦۸ء) کی بیگم ایلسا قاضی کی ایک طویل انگریزی نعتیہ نظم کا اردو ترجمہ۔ شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ کے ایک صغیر سن ہمعصر حضرت سلطان الاولیا خواجہ محمد زمانؒ (۱۱۲۵ھ - ۱۱۸۸ھ) لنواری شریف والے کے افکار و معارف ملفوظات ارشادات اور مقولات ابیات کی شکل میں محفوظ ہیں۔ ڈاکٹر نجم الاسلام نے ان ابیات کا اردو میں منظوم ترجمہ کیا۔ علاوہ ازیں سندھ کے دو قدیم صوفیا، قاضی قاضن (م ۹۵۸ھ) اور شاہ عبدالکریم بلڑی والے (م ۱۰۳۲ھ) کے ابیات کو بھی اردو نظم و نثر میں منتقل کیا۔ ان ابیات کے ترجمے پابند شاعری میں بھی ہیں تو معرا اور آزاد نظم میں بھی۔ یہ ترجمہ کہیں دو مصرعوں پر اور کہیں تین مصرعوں پر مشتمل ہے۔ متعدد ترجمے مثلثات کی صورت میں ہیں جنھیں آج کل کہیں "ہائیکو" کہا جاتا ہے اور کہیں نو ایجاد "ثلاثی" کہا جا رہا ہے۔ حالانکہ یہ ایک قدیم صنفِ سخن ہے جو متعدد فارسی شعراء کے کلیات میں موجود ہے۔

ڈاکٹر نجم الاسلام نے انگریزی اور سندھی کے علاوہ عربی، ترکی اور فارسی سے بھی

ترجمے کیے ہیں۔ انھوں نے ایران، ہندوستان اور پاکستان کے منتخب شاعروں کی تخلیقات کا اردو ترجمہ "دو آہنگ" میں پیش کیا ہے۔ اس بیاض (Anthology) میں قدیم و جدید معروف اور غیر معروف شعراء کا منتخب کلام دیا ہوا ہے۔

ایک اور اہم مسئلہ کی جانب بھی توجہ کرنا ضروری ہے۔ رسم الخط کی بعض پیچیدگیوں کے سوا پاکستانی زبان میں مشترک الفاظ کا بڑا ذخیرہ پایا جاتا ہے جسے سلیقہ سے ہنر مندی سے اور قومی فرض کے طور پر اردو میں مروج اور مستعمل کرنے کے عملی اقدام کرنے چاہیئیں اگر پیوند کے ذریعے سندھڑی آم جیسا لذیذ لطیف اور مرغوب طبع پھل حاصل ہو سکتا ہے تو بین اللسانی ارتباط سے پاکستان میں لسانی منظر بھی خوبصورت معطر اور دل لبھانے والا بن سکتا ہے۔

مملکت خداداد پاکستان کو رب رحیم و کریم نے جہاں بہت سی نعمتوں سے نوازا ہے وہاں لسانی منظر بھی "گل سرسبد" کی مانند ذہن و قلب کی طراوت اور طمانیت کا سامان مہیا کرتا ہے کیونکہ اسلام کی تہذیبی اقدار نے جن تمدنی روایات کو جنم دیا اس کے نتیجے میں پاکستان کی مختلف زبانوں میں بہت سی مشترکہ قدریں ابھریں۔ یہ برصغیر کی دیگر زبانوں اور ادبیات سے کسی طرح کم نہیں بلکہ تنوع اور توانائی اور گہرائی اور صداقت اظہار میں بہت سے ادبیات سے اعلیٰ اور ارفع ہیں۔

پاکستان میں قومی زبان اردو کے علاوہ براہوی، بلوچی، پنجابی، سرائیکی، سندھی، کشمیری، گجراتی، مکرانی، ہندکو اور دوسری زبانیں بولی جاتی ہیں جو قدامت کے علاوہ اپنے تحریری، فکری و علمی سرمایہ کے لحاظ سے اہمیت رکھتی ہیں۔ پنجابی اور گجراتی کے سوا جو بائیں سے دائیں علی الترتیب گرمکھی اور دیوناگری خط میں لکھی جاتی ہیں اور باقی زبانوں کا رسم الخط عربی ہے۔ عربی ابجد کے ۲۸ حروف بھی سب میں مشترک ہیں۔ موہن جوداڑو سے دریافت کی ہوئی مہروں سے یہ انکشاف ہوا ہے کہ سندھ کے باشندے

لکھنے پڑھنے کے فن سے نابلد نہیں تھے۔ ان کی زبان موجودہ سندھی سے مماثلت رکھتی تھی اور عبرانی کی طرح دائیں سے بائیں جانب لکھی جاتی تھی۔

پاکستان کی مملکتی انتظامی، کاروباری زبان اردو قرار پائے جانے کے یہ معنی نہیں کہ پاکستان کی دوسری زبانیں ملک سے غائب ہو جائیں۔ وفاقی حکومت میں صوبوں کو اپنے ہاں کے معاملات میں بہت کچھ آزاد رہنے کے باعث صوبائی زبانوں کو بھی ترقی نصیب ہوئی ہے اردو کی ترقی اور ترویج کے سلسلے میں لسانی اعتبار سے مناسب اور موزوں اقدام کے فقدان کے پیش نظر "پاکستانی زبانوں کا رسم الخطی وفاق" ضروری ہے اور رسم الخط اور رسم الخط اور اعراب کی موجودہ نزاع کو ختم کرنے کے لیے جلد از جلد ایک "کل پاکستان موتمر رسم الخط و اعراب" منعقد ہوتا کہ پاکستانی زبانوں میں مشترک آواز کے لیے مشترک حروف رائج کیے جا سکیں۔ بعض چیزیں پشتو میں بڑی عمدہ ہیں بعض آوازیں پنجابی اور سندھی میں مشترک ہیں اردو میں اگر چند نئے حروف تہجی اختیار کیے جائیں جس طرح خود عربوں کو یہ ضرورت پیش آئی تھی تو صوتیات کے سلسلے میں بہت سی ناچاقیاں بھی دم توڑ دیں گی۔ اس معاملے میں کمپیوٹر کا سہارا لیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح تجنیس حرفی اور تذکیر و تانیث کا اُلجھاؤ بھی دور کیا جا سکتا ہے۔

حصہ چہارم

شعری و ادبی تجربات

نئی زبان یا زبان کے نئے شعری استعمال کا مسئلہ: کچھ منتشر خیالات

ظفر اقبال

زبان کے بارے میں میرے ہاں جس تشویش اور فکر مندی کا رجحان موجود ہے وہ اس کے درسی اور تدریسی حوالے سے کم اور شعری مواد کے حوالے سے زیادہ ہے کیونکہ میری دانست اور تجربے میں چار دہائیاں پہلے کی مروج اردو زبان شعری سامان رسانی کے ضمن میں اپنے جملہ امکانات پورے کر چکی تھی اور شعری تجربے کی راہ میں مشکلات کا سبب بھی بن رہی تھی۔ اس کی ایک وجہ اس کی ہیئت کذائی بھی ہو سکتی ہے یعنی یہ زبان اپنی تشکیل کے دوران میں جن مرحلوں سے گزرتی چلی آئی ہے، بعض لاحقے اس کا جزو بدن بھی بنتے رہے جن میں اس کی "لشکریت" ایک بنیادی عنصر کی حیثیت سے شامل ہے، اور جس سے بوجوہ اسے پاک صاف کرنے کی کوشش کی گئی اور یہ نہ سوچا گیا کہ یہی رویہ اسے بیخ و بن سے اکھاڑنے کا بھی سبب بن سکتا ہے۔

چنانچہ قیام پاکستان سے لے کر اب تک یعنی نصف صدی کے دوران میں زبان اور اس کے مزاج میں جو تبدیلیاں خود عوامی سطح پر رونما ہو چکی ہیں وہ اس کی فطرت اور جبلت کا تقاضا بھی تھیں۔ یہ تو تھی ابتدائی بات، اب اصل مسئلہ کم از کم میرے نزدیک وہاں سے شروع ہوتا ہے جہاں زبان شاعری کی قلمرو میں داخل ہوتی ہے۔ اس سلسلے میں پہلی گزارش یہ ہے کہ زبان شاعری میں اس طور استعمال نہیں ہوگی جس طرح سے کہ نثر میں بروئے کار آتی ہے، بلکہ اگر یہ کہا جائے تو کچھ ایسا غلط نہ ہوگا کہ زبان کا

استعمال ہی شاعری کو نثر سے ممیز کرتا ہے۔ نثری نظم اس کی بہتر اور جلد سمجھ میں آنے والی صورت کو ظاہر کرتی ہے اور نثری نظم کو اسی لیے نثر نہیں کہا جا سکتا کہ اس میں زبان کا استعمال بجائے خود شاعرانہ ہوتا ہے۔

یہ بات زیادہ درست نہیں ہے کہ میں نے زبان کا رُخ موڑنے کی کوشش کی ہے بلکہ یہ کہنا نسبتاً زیادہ قرین حقیقت ہوگا کہ میں نے شاعری کا رخ موڑنے کی کوشش نہ بھی کی ہو تو کم از کم اس کا احساس ضرور کیا ہے۔ یہ کام کچھ ایسا نیا بھی نہیں اور پہلے بھی بلکہ ہر دور میں ہوتا رہا ہے۔ ہم لوگ عام طور سے اپنی (باطنی) ضرورت کے تحت شاعری کرتے ہیں اور اس بات کا زیادہ خیال نہیں رکھتے کہ شاعری کی کچھ اپنی ضروریات بھی ہیں یا ہو سکتی ہیں۔ چنانچہ دیکھا یہی گیا ہے کہ زیادہ تر شعراء کا مسئلہ شعر کہنا تو ہے لیکن شاعری نہیں۔ میں اس بات کے لیے معذرت خواہ ہوں لیکن بہتر ہوگا کہ میں ابھی سے وضاحت کر دوں کہ جب میں شاعری کی بات کرتا ہوں تو میرے سامنے زیادہ تر غزل ہی ہوتی ہے جس تک میں نے بوجوہ اپنے آپ کو محدود کر رکھا ہے۔

ہو سکتا ہے کہ میرے ہاں شاعری کے ضمن میں زبان کا حوالہ یا اس پر زور، میری ہی کسی کمی کی وجہ سے آیا یا آتا ہو کیونکہ اس بات میں اپنے طور پر کافی وزن موجود ہے کہ زبان کے ساتھ آزادیاں لیے بغیر بھی عمدہ شاعری کی جا سکتی ہے بلکہ کی بھی جا رہی ہے۔ مجھے اس سے انکار نہیں ہے لیکن اس ضمن میں بھی دو باتیں قابل غور ہیں۔ ایک تو یہ کہ زبان از خود بھی تبدیلی کے عمل سے مسلسل گزرتی رہتی ہے جس کا حوالہ اُوپر آ چکا ہے۔ اور دوسرے یہ مسئلہ انفرادی بھی ہو سکتا ہے۔ نیز اس بات کا امکان بھی رد نہیں کیا جا سکتا کہ اس ضمن میں میرے خدشات ہی درست ہوں۔ کیونکہ زبان کو جہاں تک شاعری کا تعلق ہے محض ذریعۂ اظہار نہیں گردانا جا سکتا۔ نہ ہی یہ کہہ کر اسے اور اس کی کارگزاری کو محدود کیا جا سکتا ہے۔

نظریۂ ارتقاء سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا لیکن سائنسی ایجادات اور فتوحات کے اس زمانے میں محض نظریۂ ارتقاء پر تکیہ کر کے اور ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھا بھی نہیں جا سکتا ورنہ ایجاد و تازہ کاری کا سارا سلسلہ ٹھپ ہو کر رہ جائے۔ نظم گو شعراء کے نزدیک غزل جتنی بھی فرسودہ اور ناپسندیدہ صنف سخن کیوں نہ ہو، اس کی منہ زور جوانی اور حسن و جمال کسی ایسی ڈھیٹ مٹی کے بنے ہوئے ہیں کہ اس پر زوال آتا ہی نہیں یعنی

حسن اس کا اُسی مقام پہ ہے
یہ مسافر سفر نہیں کرتا

اور اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس کے نین نقش کے مسلسل نکھار میں، اس میں استعمال ہونے والی زبان کے تبدیل ہوتے ہوئے استعمال کا بنیادی اور زبردست حصہ ہے۔ یقین نہ آئے تو نصف صدی سے پہلے کی غزل سے آج کی غزل کا تقابل کر کے دیکھ لیجیے۔ عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ زبان میں جو غیر محسوس تبدیلی عامتہ الناس کی سطح پر آئی ہے وہ شاعری میں کیوں کر نہ آتی جبکہ شاعری تو ہمیشہ ہی سے پیش پا افتادہ صنف سخن چلی آ رہی ہے کہ دنیا کی ہر زبان میں شاعری پہلے ہوئی اور فکشن بعد میں لکھی گئی۔

شاعری میں زبان ایک سطح پر خام مواد بھی ہے اور لفظوں کا کھیل بھی کہ اہل نظر جانتے ہیں کہ بات لفظوں کے کھیل سے بہت آگے جا سکتی ہے اور یہی وہ لمحات اور کیفیات ہوتی ہیں جہاں زبان اور اس کے اصولوں کی پابندی کے ساتھ ساتھ اس کے ہمراہ کھل کھیلنے کا عمل بھی جاری رہتا ہے۔ ہمارے ہاں ایک بد قسمتی یہ بھی ہے کہ زبان پر عبور حاصل کرنا بھی ضروری نہیں سمجھا جاتا اس سلسلے میں کوئی اجتہاد کرنا یا اس کی کوشش تو بہت دور کی بات ہے۔ لیکن شاعری میں محض زبان ہی سے آشنائی کافی

نہیں ہوتی بلکہ زبان کے ساتھ بیان پر بھی قدرت حاصل ہونا ضروری ہوتی ہے جو اس عمل کے دوران میں رو براہ ہونے والے کرافٹ کے جملہ تقاضے پورے کر سکے۔

شاعری، بالخصوص غزل میں نیا خیال یا نیا مضمون ایک قول محال کی حیثیت رکھتا ہے اور کسی خیال کو صرف تازہ کیا جا سکتا ہے جس کے لیے متعدد طریقہ ہائے واردات موجود ہیں بشرطیکہ ذہن رسا ہونے کے ساتھ ساتھ آپ کو اس پیچیدہ ترین عمل کے اسرار و رموز سے بھی آگاہی حاصل ہو اور یہ سارے طریقے دیکھے بھالے بھی ہیں لیکن میں نے محسوس کیا ہے کہ شعر میں زبان کے نئے تر طریق استعمال سے بھی یہ مقصد خاصی حد تک حاصل کیا جا سکتا ہے کیونکہ جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں، شعر کے قالب میں ڈھل کر زبان محض زبان نہیں رہتی بلکہ شعر کا باقاعدہ حصہ بن جاتی ہے بلکہ زبان ہی شعری ہوتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ میں اس بات کو کافی حد تک واضح نہ کر سکا ہوں اور اس کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ میں خود بھی اس معاملے میں واضح نہیں ہو پایا ہوں لیکن میں اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ شاعری میں زبان کا مختلف استعمال ہی ایک ایسا اسم اعظم ہے جس سے تازہ تر شاعری کا طلسمی دروازہ کھل سکتا ہے۔ یقیناً یہ طریق کار نہ صرف شعر یا مضمون و خیال کو ایک نیا موڑ عطا کرتا ہے بلکہ اسے ایک گونہ تازگی سے بھی فیض یاب کرتا ہے۔

مروج زبان میں یقیناً شاعری کی جا سکتی ہے لیکن جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں، اس شاعری کے امکانات محدود ہوں گے اور نتائج غیر حوصلہ افزا۔ اس لیے بھی کہ شعر و ادب میں زبان کا کردار پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ چکا ہے اور خود زبان کے اندر اس قدر امکانات موجود ہیں کہ انھیں دریافت اور رو براہ نہ کرنا ایک طرح کے کفران نعمت کے برابر ہوگا۔ چنانچہ شاعری جن لوگوں کا مسئلہ ہے زبان اور اس کا طریق استعمال بھی لازمی طور پر اُن کا مسئلہ ہونا چاہیے۔ میں اس معاملے پر ماہنامہ "ادب دوست"، سہ ماہی

"بادبان" اور ماہنامہ "شب خون" میں یکے بعد دیگرے شائع ہونے اپنے مضمون بعنوان "جدید اردو غزل اور نئی شعریات کی ضرورت" میں کھل کر بحث کر چکا ہوں اور اس سلسلے میں زبان اور اس کے مختلف یا نئے استعمال کے بارے میں چند اشارے بھی دے چکا ہوں۔

علاوہ ازیں جس طرح باہر کی بجائے غزل کو اندر سے تبدیل کرنے کی نہ صرف ضرورت ہے بلکہ اس کی بے پناہ گنجایش بھی موجود ہے کیونکہ غزل کی ہیئت میں کوئی بھی تبدیلی اس کو غزل ہی نہیں رہنے دے گی، اسی طرح زبان کو بھی میں اندر سے تبدیل کرنے کے حق میں ہوں۔ بے شک میں نے اس کی شروعات اس طور کی تھیں کہ بظاہر یہ تبدیلی بیرونی طور پر دکھائی دیتی تھی، لیکن میرا اصل مقصد و مدعا اس کے باطن ہی میں تبدیلی لانے کی کوشش کرنا تھا، البتہ ابتدائی طور پر یہ تبدیلی لانا اسی طرح ممکن تھا ویسے بھی بیرونی تبدیلی، وہ کوئی بھی ہو، ناپائیدار بھی ہوتی ہے اور غیر نتیجہ خیز بھی۔ علاوہ ازیں یہ تبدیلی شاعری کے اندر اور اس کے حوالے ہی سے وجود میں لائی جا سکتی ہے جبکہ نثر میں اگر ایسی تبدیلی لانا مطلوب ہو تو اس کا طریقہ اور ہو گا۔ کم از کم میرا خیال یہی ہے۔

واضح رہے کہ میں یہ تبدیلی یا اس کی کوشش اپنے لیے کرتا ہوں اور اس کے ذریعے مجھے مطلوبہ سہولتیں بھی حاصل رہتی ہیں۔ دوسرے لکھنے والوں کو اور کچھ نہیں تو ایک طرح کی کشادگی کا احساس ہونا ممکن ہو سکتا ہے اور اس سے فائدہ بھی اٹھایا جا سکتا ہے اور اب جبکہ زبان کی حرمت بجائے خود مسئلہ نہیں رہی ہے، اس لیے اس کے بارے میں عمومی انداز نظر بھی پہلے جیسا محدود اور متعصبانہ نہیں ہے اور زبان کی مسلسل تبدیلی کے قدرتی عمل کی حقیقت کو تسلیم کر لیا گیا ہے اس لیے بھی اب اسے زبان کے خلاف کوئی بغاوت وغیرہ نہیں سمجھا جاتا بلکہ بقول مشتاق احمد یوسفی یہ اردو ہی کی

خدمت ہورہی ہے اور ہوتی رہنی چاہیے۔

زبان کے ساتھ یہ عمل روا رکھنے کے لیے نہ صرف زبان کے باطن میں داخل ضروری ہے بلکہ خود اسے اپنے باطن میں داخل کرنا بھی اُتنا ہی لازمی ہے اور میں نے ذاتی طور پر محسوس کیا ہے کہ اس عمل سے گزرتے، یعنی مختلف طریقوں سے زبان کے مخفی امکانات کا جائزہ لیتے اور حسب توفیق انہیں بروئے کار لاتے ہوئے آدمی خود کو زبان کے قریب تر محسوس کرتا ہے۔ اشیاء اور خاص طور پر دور افتادہ چیزوں کے درمیان رشتے تلاش کرنے، یا انھیں ناموجود رشتوں میں جوڑنے کے ساتھ ساتھ غیر معمولی، اجنبی اور انمل بے جوڑ الفاظ کو آپس میں جوڑنے سے بھی الفاظ و معانی کے لیے تازہ اور بھرپور امکانات دریافت اور برآمد کیے جاسکتے ہیں۔ یاد رہے کہ جسمانی طور پر کسی لفظ کو تبدیل کرنے کی نسبت اسے مختلف اور غیر معمولی سیاق سباق میں استعمال کرکے زیادہ موثر طریقے سے یہ مقصد براری کی جاسکتی ہے۔ اسی طرح قواعد کے اصولوں کے ساتھ بھی آزادیاں حاصل کرکے یہ نتائج حاصل کرنا ممکن ہے کیونکہ لفظوں کے نئے جوڑ توڑ کی طرح قواعد کے بعض اصولوں کے نئے جوڑ توڑ سے بھی یہ جادو جگایا جاسکتا ہے بشرطیکہ آپ میں اس کا حوصلہ بھی ہو اور شوق فضول بھی۔

میں جب شاعری کے مزاج اور ماحول کو تبدیل کرنے کی ضرورت پر زور دیتا ہوں تو اس سے میری مراد دوگونہ ہے یعنی ایک تو اس پر چھائی ہوئی یبوست کا قلع قمع کیا جائے۔ اس میں تازہ خیالی کا عنصر زیادہ سے زیادہ اور زندگی کے سارے رنگ اور رویے اس میں منعکس ہونا چاہئیں تاکہ یہ زیادہ سے زیادہ صاحبان ذوق کی ضروریات کو پورا کرسکے۔ دوسرے اس سے میرا مطلب یہ بھی ہوتا ہے کہ اس بات کا بھی احساس و ادراک کیا جائے کہ روایتی زبان پر اس کا روایتی استعمال یہ مقاصد حاصل کرنے میں ایک بڑی رکاوٹ بھی ہے، جس طرف توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ آخر جب ہم شعر میں

ایک تازگی اور عمدگی کے طلب گار ہوتے ہیں تو اس میں زبان کی تازگی اور ایک نئی نفاست کے امکانات کو کیوں نظر انداز کیا جاتا ہے۔

تاہم خود شاعری کی طرح یہ کام بھی کچھ ایسا آسان نہیں ہے اور نہ ہی اس سلسلے میں زیادہ خوش گمانی میں مبتلا ہوا جا سکتا ہے۔ اصول تو یہ ہے کہ جہاں شاعری آپ کا اوڑھنا بچھونا ہونا چاہیے وہاں زبان اور اس کا نیا استعمال بھی آپ کو اسی بھرپور طریقے سے بسر کرنا چاہیے۔ لیکن بد قسمتی یہ ہے کہ شاعری ہی کو ہم کون سا اوڑھنا بچھونا بنائے ہوئے ہیں جو زبان کے بارے میں ہم سے اس طرز عمل کی توقع کی جا سکے۔ اکثر اوقات شاعری ہم فیشن کے طور پر کرتے ہیں، حالانکہ ہم اس طرح بھی شاعری سے انصاف نہیں کر رہے ہوتے کیونکہ فیشن نت نئے رنگ بدلتا رہتا ہے اور اس کا تو تقاضا ہی یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ پیش پا افتادہ اور اپ ٹوڈیٹ ہو، لیکن ہم جدید تر بلکہ جدید ترین شاعری کے تقاضوں کے بارے میں کبھی فکرمند نہیں ہوتے۔

یہ بھی نہیں کہ ہمارے ہاں لفظ اور زبان کے بارے میں تردد نہیں کیا جاتا۔ الفاظ کا انتخاب ہی وہ مشکل مرحلہ ہے جس سے ہر شاعر تخلیقی کیفیت میں دو چار ہوتا ہے۔ بعض خواتین و حضرات تو الفاظ کو باقاعدہ صیقل کر کے اپنے مصرعوں میں نگینوں کی طرح جڑتے ہیں اور اس طرح سے بھی معانی کے گل و گلزار کھلانے کا تردد کرتے ہیں۔ لیکن اصل سوال یہی ہے کہ یہ فیشن اتنا پرانا ہو چکا ہے کہ اب اسے متروک ہونا چاہیے، تاہم اس کے لیے جس حوصلے کی ضرورت ہوتی ہے وہ جہاں تہاں دستیاب نہیں ہوتا اور وضعداری اور روایت کے ساتھ وابستگی کے نام پر لوگ اس دائرے سے باہر نہیں نکل سکتے چہ جائیکہ نئی زبان یا نئے لفظ کی جستجو کی جائے۔ میں نے جو کام گلافتاب میں کیا ہے اس کا ایک مقصد زبان سے متعلقہ بعض بندشوں کو ایک جھٹکے سے توڑ دینا بھی تھا۔ ظاہر ہے کہ وہ رویہ انتہا پسندانہ بھی تھا اور جس کی ایک وجہ تھی کہ موت دکھاؤ، تاکہ

زحمت قبول کی جا سکے۔ چنانچہ اس کے بعد اسی سلسلے کا میرا کام مختلف سطحوں اور طریقوں میں تقسیم ہے اور مجھے تسلیم ہے کہ اس کام کو میں کچھ ضرورت سے زیادہ پھیلا بھی چکا ہوں، اور، سمجھتا ہوں کہ ابھی اسے سمیٹنے کا دور نہیں آیا۔ بے شک سمٹاؤ کی مختلف صورتیں جابجا نظر بھی آتی ہوں لیکن یہ کام ایسا ہے کہ اسے سمیٹنا شاید ممکن ہی نہ ہو کیونکہ اس کا پھیلاؤ اور امکانات اس قدر زیادہ ہیں کہ پیچھے مڑ کر دیکھنا ناممکنات میں سے لگتا ہے۔

میری نام نہاد شاعری کی جتنی بھی (مختلف) آوازیں ہیں یا جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ سبھی زبان و بیان کے بارے میں اسی رویے کی مرہون منت ہیں۔ چنانچہ اب حالت یہ ہے کہ مجھے روایتی زبان و اسلوب میں عمدہ شعر کہنے کی نسبت خراب شعر کہنا زیادہ مرغوب ہے جس میں زبان کے اصول و قواعد میری گردن پر سوار نہ ہوں۔ چنانچہ اکثر اوقات میرا معاملہ یہ ہوتا ہے کہ میں جو زبان و قواعد کا لحاظ کرتا ہوں تو زبان و قواعد کو کبھی میرا بھی تو لحاظ کرنا چاہیے۔ لہذا یہ دو طرفہ لحاظ داری ایک طرح سے وجود میں آچکی ہے۔ اور ہم دونوں نے ایک دوسرے کے ساتھ سمجھوتہ سا کر لیا ہے۔ تاہم یہ میرا خیال ہے کیونکہ زبان تو اتنی زبردست چیز ہے کہ اس کے ساتھ آپ ٹکر لے ہی نہیں سکتے، ورنہ پاش پاش آپ نے ہونا ہے، زبان نے نہیں۔ چنانچہ اگر یہ سمجھا جاتا ہے کہ اس عمل کے دوران میں میں پاش پاش ہونے سے ہمیشہ ہی بچتا رہا ہوں تو یہ درست نہیں ہے۔

یہاں ایک بات خاص طور پر نوٹ کرنے کے قابل ہے کہ زبان کے ساتھ اتنی زور آزمائی کے باوجود میں نے اپنے آپ کو اپنے لسانی تجربات کا اسیر ہونے سے بچانے کی ہمیشہ ہی کوشش کی ہے۔ عرض کرنے کا مقصد یہ ہے جہاں یہ سراسر بدلا ہوا ذائقہ میرے رگ و ریشہ میں مکمل طور پر سرایت کر چکا ہے، وہاں میں اکثر اوقات اپنے

آپ کو اس سے ایک باعزت فاصلے پر بھی رکھتا ہوں اور زبان کے بارے میں اپنے اس خصوصی رویے کی یکسانیت بھی مجھے قبول نہیں ہوتی۔ اور میں ساتھ ساتھ ایسی زبان سے بھی اپنا کام نکالتا نظر آتا ہوں جس میں تجربے کی یا تو کچھ ایسی شدت نہیں ہوتی، یا سرے سے اس میں کوئی ایسا تردد دکھائی ہی نہیں دیتا۔ چنانچہ میری سعی سخن میں زبان کے یہ دونوں طرح کے دھارے متوازی صورت میں چلتے ہیں اور اس طرح سے میں کسی یکرنگی کا شکار نہیں ہوتا۔ لیکن اس ضمن میں یہ بات بھی نظر انداز نہیں کرنی چاہیے کہ میرے دوسرے ذائقے میں زبان یا اس کا استعمال چاہے کتنا ہی روایتی کیوں نہ ہو، یہ اس طرح سے روایتی کبھی نہیں ہوتی جیسی کہ ٹھیٹھ روایتی زبان ہونی چاہیے کیونکہ میرے ہاں زبان کا ڈھانچا بنیادی طور پر کچھ ایسے دھچکے برداشت کیے ہوئے ہے کہ اس کا مکمل طور پر روایتی ہونا ممکن ہی نہیں رہ گیا۔ چنانچہ میری بظاہر روایتی زبان میں لکھی ہوئی غزلیں ان جراثیم سے مکمل طور پر پاک نہیں ہوتیں جو لسانی تشکیلات کے مرکب سے پیدا ہو کر جہاں تہاں پھیل چکے ہیں۔

میری کبھی یہ کوشش اور خواہش نہیں ہوئی کہ میری ان مساعی کی پیروی کی جائے یا انہیں حلقہ شعر و ادب میں مقبولیت حاصل ہو۔ اس کے مختلف اسباب ہو سکتے ہیں مثلاً میں نے اپنے لسانی تجربات سے ماورا بھی کبھی یہ آرزو نہیں کی کہ میرے اسلوب اور لہجے یا مختلف لہجوں کو (اگر وہ کوئی ہیں) کسی بھی طرح کا قبول عام حاصل ہو، یا دوسرے جونیئر شعراء اس کی پیروی کریں۔ شاید اس کی وجہ یہ رہی ہو کہ میرے اسلوب کی پیروی سے پھر وہ اسلوب نہ تو میرا رہ جائے گا اور نہ ہی اس میں وہ بات رہ جائے گی۔ ہو سکتا ہے کہ اس میں یہ خود غرضی بھی شامل ہو کہ میرا اسلوب مجھی تک محدود اور مخصوص رہے یا یہ عام نہ ہونے پائے کہ اس طرح یہ اپنی قدر کھو بیٹھے گا۔

اسی طرح کا میرے لسانی تجربات کا معاملہ بھی ہے۔ اس سلسلے میں ایک لطیفہ بھی

ہے کہ جوں جوں آہستہ آہستہ اس تجربے کی افادیت اور اس کی صحت کو بنیادی طور پر تسلیم کیا جانے لگا، توں توں یہ میرے لیے ایک طرح کے عدم اطمینان اور ناخوشی کا باعث بھی بنتا گیا کہ اگر یہ رفتہ رفتہ اپنے متنازع ہونے کی کیفیت کو زائل کر بیٹھتی تو پھر میرے پاس کیا باقی رہ جائے گا۔ بہرحال میری اس سوچ کے بارے میں بھی دو رائیں ہو سکتی ہیں۔

شاید یہی وجہ ہے کہ زبان اور اس کے استعمال اور اپنے جملہ لسانی تجربات کے حوالے سے میں نے کوئی خاص مقصد اپنے سامنے نہیں رکھا کیونکہ ایسی صورت میں اس کے حصول کے بعد میں بالکل فارغ اور خالی ہو کر رہ جاتا۔ چنانچہ شاید یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ میں نے اپنا یہ سفر ایک تسلسل کے ساتھ جاری رکھا ہوا ہے اور بجائے خود اس کی اتنی جہتیں اور راستے ہیں کہ یہ سفر ہی میری منزل ہو کر رہ گیا ہے اور جس کا ایک فائدہ مجھے یہ بھی ہوا ہے کہ نہ مجھے کسی منزل پر پہنچنے کی جلدی ہے اور نہ ہی اس سلسلے نیں میں کسی پریشانی سے دوچار ہوں اور غالباً جس کی سب سے بڑی افادیت یہ ہے کہ اس کی بدولت میرا یہ کام میری شعری زندگی کے آخری لمحے تک جاری رہنے کا امکان ہے اور شاید اس سے بڑا انعام کوئی ہو بھی نہیں سکتا۔

دوسرے لفظوں میں یہ طریقہ کار میری شاعری کے ساتھ اس حد تک پیوست ہو کر رہ گیا ہے کہ علاقوں کو ایک دوسرے سے الگ کیا ہی نہیں جا سکتا۔ میں سمجھتا ہوں کہ جس طرح خدا اور اس کے بندے کا آپس میں انتہائی ذاتی اور انفرادی تعلق ہوتا ہے ہر شاعر کا اس کی زبان کے حوالے سے بھی ایسا ہی ایک خصوصی تعلق ہوتا ہے کیونکہ ہر شاعر اپنی زبان ساتھ لاتا ہے اور اس سیاق و سباق میں زبان کوئی علیحدہ، مجرد، انفرادی اور ملکی یا عالمی شخصیت نہیں ہوتی بلکہ شاعر اپنی زبان کو وجود میں لاتا ہے کیونکہ ہر شاعر بلکہ ہر شخص اپنی ہی زبان بولتا ہے اور اس طرح زبان اپنے بولنے والے کی ذاتی ملکیت

بھی ہوتی ہے اور یہیں سے اس کے ساتھ آزادیاں لینے اور من مانی کے اسلوب کا آغاز ہوتا ہے۔

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ جب دو افراد آپس میں مکالمہ کر رہے ہوتے ہیں تو وہ اپنی اپنی بولی بول رہے ہوتے ہیں جو بہت سی سمتوں سے ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہے لیکن دونوں ایک دوسرے کی زبان کو نہ صرف برداشت کر رہے ہوتے ہیں بلکہ ایک دوسرے کا مطلب بھی سمجھ رہے ہوتے ہیں اور یہ سب کچھ اس خفیہ اور طے شدہ معاہدے کے تحت ہوتا ہے جو دونوں فریق فرض کر لیتے ہیں کہ ان کے درمیان پہلے سے موجود ہے۔ یہی معاملہ شاعری کا بھی ہے جن کی شاعری نفس مضمون، طرز و اسلوب اور زبان کے لحاظ سے بھی ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہے، اور دونوں ایک دوسرے کو اتنی آزادی دے رہے ہوتے ہیں کہ اس باہمی اختلاف کو تسلیم کرتے ہوئے ایک دوسرے کے ساتھ ابلاغ کریں یا اس کی کوشش کریں۔

سو زبان کا مسئلہ خود شاعری ہی کی طرح پیچیدہ اور گنجلک ہو جاتا ہے کیونکہ جہاں شاعری کا گنجلک ہونا ضروری ہے وہاں زبان بھی اس پیچیدگی کا حصہ بن جاتی ہے کہ نہ صرف زبان کو شاعری سے الگ نہیں کیا جا سکتا بلکہ زبان ہی شاعری کے ایک رخ کی حیثیت اختیار کر لیتی ہے۔ چنانچہ اس بحث میں جہاں تک ہم پہنچ چکے ہیں، اس میں ایک بات یہ بھی نکلتی ہے کہ شاعری کے مقابلے میں موضوع یا مضمون کو ثانوی حیثیت ہی پر گزارا کرنا پڑتا ہے کہ طرز پیش کش ہی اصل شاعری ہے، اور طرز پیش کش میں اس وقت تک کوئی جادوگری پیدا نہیں کی جا سکتی جو تک اسے زبان کی تازگی سے استوار نہ کیا جائے اور زبان کی تازگی سے میری مراد جو کچھ ہے اس کی وضاحت اوپر ہو چکی ہے۔ اس لیے جہاں تک انداز و اسلوب پیش کش کا تعلق ہے تو یہ اصول شاعری کے علاوہ نثر اور فکشن پر بھی صادق آتا ہے اور ٹھیٹھ موضوعیت پسندی کے خلاف ایک

رد عمل کے طور پر آ موجود ہوا ہے۔ یہاں پر یہ دلچسپ نکتہ بجائے خود قابل غور ہے کہ ہر انحراف اور رد عمل کسی عمل اور اس کے تسلسل کے خلاف ہی پیدا ہوتا ہے، بالکل اسی طرح جیسے مصوری میں شکلوں کو سنوارنے، بنانے کے عمل میں اشکال کو بگاڑنے یا ڈسٹورٹ کرنے کا عمل یا فیشن چل نکلا جس کا ایک مقصد بگڑی ہوئی شکل کے پس منظر میں پوشیدہ اس بنی سنوری شکل کو دکھانا بھی مقصود ہوتا ہے جو اس طرح سے بالواسطہ طور پر دکھائی جاتی ہے چنانچہ اشکال اور اشیاء کو توڑ مروڑ کو پیش کرنا مصوری کی طرح شاعری میں بھی در آیا۔

اس تناظر میں لفظ چونکہ ایک شے ہوتا ہے بلکہ معنی کسی شے ہی کے حوالے سے ذہن کو موصول ہوتے ہیں اس لیے اس کا بگڑنا، ٹوٹنا پھوٹنا یا بدہیئت ہونا یا کر دیا جانا شاعر کی ایک ضرورت کے تحت بھی سامنے آتا ہے جبکہ اصل لفظ کا تسلسل بھی اپنا ایک رد عمل پیدا کرتا ہے۔ اگرچہ لفظ اپنی جڑ اور بنیاد کے لحاظ سے وہی کا وہی رہتا ہے، صرف اس میں (بعض اوقات) ایک آدھ ڈینٹ ڈال دینے ہی سے ایسا مقصد حاصل کر لیا جاتا ہے، تاہم بعض اوقات لفظ کو الٹا دینے یا اس کی ہیئت یکسر تبدیل کر دینے کی نوبت بھی آتی ہے لیکن یہ ایک عجیب بات ہے کہ نئے لفظ کا، آپ اسے جس حد تک بھی تبدیل کر دیں، اپنے اصل سے کوئی نہ کوئی رشتہ پھر بھی باقی رہتا ہے۔ اسی سے ثابت ہوتا ہے کہ زبان اور لفظ کس قدر طاقتور اور سخت جان چیز ہیں۔

چنانچہ ان معروضات سے یہ ظاہر ہو جاتا ہے کہ لفظ کو تبدیل کرنا، اسے بگاڑنا، مروڑنا، الٹانا اس میں کوئی ڈینٹ وغیرہ ڈالنا کیوں ضروری ہوتا ہے۔ اور شاعر کو اس کی ضرورت کیوں لاحق ہوتی ہے۔ میں جانتا ہوں کہ اکثر قارئین کے لیے باتیں خاصی اشتعال انگیز ہو سکتی ہیں لیکن یوں تو بہت سے افراد کے لیے خود شاعری بھی اشتعال انگیز ہو سکتی ہے۔ اس لیے یہ وضاحت یہاں پر کر دینی چاہیے کہ جہاں خود فنون لطیفہ

بشمول شاعری ہر کہ ومہ کے لیے نہیں ہوتے۔ اس لیے زبان و شعر کے مسائل بھی سب کے لیے معنی خیز نہیں ہو سکتے کیونکہ اکثریت کا نہ صرف شاعری مسئلہ نہیں ہوتا بلکہ اس کے پیچیدہ معاملات تو اس کا دردِ سر ہوتے ہی نہیں چہ جائیکہ ان سے بحث کی جائے یا اس ضمن میں انہیں قائل کرنے کی کوشش کی جائے۔

میں اس بات کو تسلیم کرتا ہوں کہ ضروری نہیں کہ زبان و بیان کی پیچیدگیاں اور مشکلات ہر جینوئن شاعر کے مسائل میں شامل ہوں کیونکہ اصل شاعر مروج اور روایتی زبان میں بھی اپنا کردار کامیابی سے ادا کر سکتا ہے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ بھی عرض کرنے کی اجازت چاہوں گا کہ ان مشکلات کو اپنائے اور ان میں الجھے بغیر ایسے شعراء کا کردار بہت محدود ہو کر رہ جائے گا کیونکہ اگر کامیابی ہی کو معیار بنایا جائے تو محدود کامیابی اور لامحدود کامیابی اس کے لیے کوشش میں بہر حال ایک فرق ہے جو اس سارے معاملے کی اصل بنیاد کی حیثیت رکھتا ہے کیونکہ اگر یہ مسئلہ جینوئن نہ ہو تو کسی شاعر کا دماغ خراب نہیں کہ وہ ایک بے سود روگ پال کر بیٹھ جائے جبکہ وہ مروج اور روایتی زبان و اسلوب میں بھی سامان رسانی کی اہلیت اور توفیق رکھتا ہو۔

تاہم اس کی دوسری سطح یہ ہے کہ بعض شعراء اس کی اہمیت و افادیت کو سمجھتے ہوئے بھی اسے بھاری پتھر جان کر اور چوم کر چھوڑ دیں۔ اس کی دوسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ ممکن ہے کہ وہ اس کے جواز کے قائل ہوں لیکن اپنے محدودات کی وجہ سے وہ اسے اتنی شدت کے ساتھ ضروری اور ناگزیر نہ سمجھتے ہوں اور اس طرح سے اس پر سر کھپانے اور اتنا بڑا قدم اٹھانے سے احتراز کر رہے ہوں کیونکہ کسی بھی ایسے کام پر ہاتھ ڈالنے سے پہلے آپ کا اس کے بارے میں مکمل طور پر قائل ہونا بے حد ضروری ہے جبکہ جس چیز پر آپ کا ایمان ہی راسخ نہ ہو آپ اس کی پیش رفت کے بارے میں زیادہ سے زیادہ کتنی دلچسپی لے سکتے ہیں اور اس کا کیا نتیجہ برآمد ہو سکتا ہے؟

چنانچہ زبان و بیان کے بارے میں جب تک یہ رویہ آپ کی فطرت ثانیہ بن جائے، اس وقت تک اس ضمن میں آپ کی سنجیدگی مشکوک ہی رہے گی۔ علاوہ ازیں اس ضمن میں آپ کی طبیعت میں اس احساس کا راسخ ہونا ضروری ہے کہ زبان جس مقام تک پہنچ چکی ہے اس کی آخری منزل نہیں بلکہ کچھ نئے مقامات بھی اس کے انتظار میں ہیں اور ان کی طرف روبراہی اسی وقت ممکن ہو سکتی ہے جب کسی ایسے نئے پیچ و تاب کی آپ ضرورت بھی محسوس کریں۔ گویا جب یہ دو احساس یکجا ہوں گے تو ہی کوئی معقول پیش رفت اس سلسلے میں ہو سکتی ہے جبکہ یہاں مشکل یہ ہے کہ پہلا احساس ہی پیدا ہونا بڑا کام رکھتا ہے، دوسرا احساس بھی ہو جانا تو بہت دور کی بات ہے۔ اس لیے اس حوالے سے زیادہ خوش گمانی کی کوئی گنجایش نہیں ہے۔

بہرحال میں خود بھی اسی نتیجے پر پہنچا ہوں کہ چونکہ یہ ایک انتہائی تخلیقی نوعیت کا کام ہے اس لیے اس کا شخصی اور انفرادی ہونا اس کی ضرورت اور مجبوری ہے کیونکہ اس سلسلے میں کوئی تحریک نہیں چلائی جا سکتی اور شاعر لوگ تحریک چلایا بھی نہیں کرتے کہ ایسی کوئی کوشش کسی سازش کا شکار ہو کر بھی ناکام ہو سکتی ہے۔ بے شک یہ کام کسی ابتدائی سطح پر عامۃ الناس کی سطح پر غیر شعوری طور پر ہو بھی رہا ہو، لیکن اس کی رفتار کے بارے میں اندازہ لگانا کوئی مشکل کام نہیں ہے جبکہ شاعر کا معاملہ اور ہے کہ وہ تو طبعاً فیوچرسٹ ہوتا ہے، اس لیے بھی ضروری ہے کہ وہ ماضی اور حال میں بسر ہوتے ہوئے بھی مستقبل کے موسموں اور تقاضوں کو پیش نظر رکھے۔ بے شک شعر گوئی کے لیے بجائے خود یہ تردد روا رکھنا لازمی نہ بھی ہو لیکن یہ بہرحال نہ صرف شاعری کی توفیق پر منحصر ہوتا ہے کہ وہ زمانے کو ساتھ لے کر چلے بلکہ آنے والے زمانوں کی خبر بھی دینے کا اہتمام کرے۔ زبان کے ارتقاء اور تغیر و تبدل کے حوالے سے یہ اس لیے بھی ضروری ہے کہ اس کی شاعری زبان کی تیز رفتار تبدیلیوں کا نہ صرف ساتھ دے سکے بلکہ

مستقبل کے کسی بھی لمحے میں ماضی کی چیز نہ لگے یعنی اس کے طرزِ احساس کا کوئی بھی حصہ متروک ہو کر نہ رہ جائے۔

میں سمجھتا ہوں کہ زبان و بیان کے بارے میں اس مخصوص طرزِ فکر نے جو ایک اور تبدیلی روبراہ کر دی ہے۔ اس نے بنیادی طور پر ایک بہت بڑے تنازعے کو تقریباً ختم کر دیا ہے اور وہ ہے جدید نظم کی پیش پا افتادگی اور غزل کی پسماندگی کا تصور حتیٰ کہ نظم کے مقابلے میں غزل کے اندر موجود مضامین و موضوعات کو باہم متضاد اور متناقض کہہ کر بھی رد کرنے کی کوشش کی گئی اور اس کی ریزہ خیالی کو ایک ایسا عیب قرار دیا گیا جس سے نظم واضح طور پر مبرا تھی۔ چنانچہ کم و بیش نصف صدی تک اعتراضات کی بوچھاڑ اور تنقید اور تشنیع کی مار کھانے کے بعد نتیجہ یہ ہے تمام ترفنی، فکری اور ہیئتی سہولتیں میسر ہونے کے باوجود نظم غزل کے تناظر میں وہ پیش رفت نہیں کر سکی جس کی اس سے توقع کی جاتی تھی یا جس حد تک اس کے دعوے باندھے جاتے تھے جبکہ غزل نے خاموشی سے اپنا کام جاری رکھا اور اپنے اندر ہی اندر نت نئے پیرہن بدلتی رہی۔

اس کی بڑی وجہ غالباً یہ رہی کہ غزل کے مقابلے میں نظم ہمارے ادبی کلچر کا حصہ نہیں بن پائی جبکہ اقبال کی نظم اپنے فنی تار و پود کی نسبت اپنے پیغام اور تاریخی حوالے سے زیادہ معتبر قرار پاتی ہے۔ علاوہ ازیں نظم یا اس کا کوئی ٹکڑا اتنی سہولت سے گفتگو اور حوالے کا حصہ نہیں بنتا جتنی آسانی اور رسان کے ساتھ غزل کا انفرادی شعر بن سکتا ہے کہ اس ضمن میں غزل کی اپنی آسانیاں اور نظم کی اپنی مشکلات ہیں۔ علاوہ ازیں ذوقِ شعر کو عام کرنے کے سلسلے میں جو کام غزل نے کیا ہے اور کر رہی ہے، نظم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔ نہ ہی اس کے لیے بوجوہ ممکن ہے۔ اس کے ساتھ بالآخر بنیادی سبب یہی ٹھہرتا ہے کہ غزل کے انفرادی شعر نے غیر محسوس طور پر ایک مکمل نظم کی

جگہ لے لی ہے اور اس طرح سے یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ غزل فی الاصل جتنے اشعار کا مجموعہ ہے وہ اتنی ہی "نظموں" پر مشتمل ہوتی ہے۔

یہاں پر یہ اعتراض وارد ہو سکتا ہے کہ اگر یہ بات تسلیم کر لی جائے تو پھر دو مصرعی نظمیں ہی کیوں نہ تخلیق کی جائیں۔ پانچ سات یا نو شعر کی غزل کیوں کہی جائے جس میں اتنی ہی تعداد میں نظمیں مہیا کرنے کا تردد کیا گیا ہو۔ اس کا جواب یہ ہے کہ غزل اس نیت سے تخلیق نہیں کی جاتی کہ اس کے اشعار کی تعداد کے حوالے سے اتنی ہی نظمیں تخلیق کرنا درکار ہوتی ہیں بلکہ زمانی سفر اور تبدیلیوں کی وجہ سے اور نظم کے مسلسل اور صحتمندانہ تقابل کی وجہ سے اسے یہ سہولت از خود ہی حاصل ہو گئی ہے کہ اس میں موجود اشعار کو فرداً فرداً بھی نظم شمار کیا جائے۔ چنانچہ اس اکائی یعنی غزل کے انفرادی شعر کو یہ سہولت اور نئی شناخت اپنے ایجاز و اختصار کی بنیاد پر بھی ارزانی ہوئی ہے جس کا یہ شاہکار بالعموم ہوتا ہے جبکہ پچاس اشعار یا مصرعوں کی ایک نظم اور دو مصرعوں کے شعر کا حوالہ جس فرق اور امتیاز کا حامل ہو سکتا ہے اور سو پچاس مصرعوں کی نظم کے مقابلے میں اسے جو سہولت اور برتری حاصل ہو سکتی ہے اس کا اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔ اسی دلیل کی ایک شاخ یہ بھی ہے کہ نظم کے معاملے میں بھی روز بروز مختصر سے مختصر تر نظم کا رواج بڑھتا جا رہا ہے اور اس کی مقبولیت بھی۔ اس کی مثال اگر مثنوی سے دی جائے تو زیادہ جلد سمجھ میں آسکتی ہے کہ آج مثنوی نہیں لکھی جا رہی جبکہ ہمارا کلاسیکل ادب اس صنف کے حوالے سے کافی مالدار چلا آ رہا ہے۔ حتیٰ کہ اب طویل نظم بھی کہیں کہیں ہی نظر آتی ہے اور جس کا مطلب بھی یہی نکلتا ہے کہ طویل نظم کی افادیت ناپید ہو چکی ہے۔ چنانچہ ہوتے ہوتے ہم اس مقام تک آ پہنچے ہیں کہ پانچ سات مصرعوں کی نظم زیادہ مقدار میں لکھی جا رہی ہے بلکہ کہیں یہ اختصار دو تین مصرعوں تک بھی آ جاتا ہے حتیٰ کہ ایک مصرعی نظموں کا چلن بھی عام ہونا شروع ہو گیا

ہے اور یہ کہا جاسکتا ہے کہ منیر نیازی کی نظموں کی عمدگی اور خوبصورتی کی ایک وجہ ان کا اختصار بھی ہے۔

چنانچہ مختصر نویسی کے پس منظر میں یہ بات خاصا وزن رکھتی ہے کہ جہاں قاری کے پاس طویل نظم کے مطالعہ کا وقت اور دلچسپی موجود نہیں رہی، وہاں شاعر بھی کسی حد تک تساہل کا شکار ہو گیا ہے۔ چنانچہ یہ دونوں عناصر مل کر بھی مختصر نظم کی ترویج میں بنیادی کردار اد کرتے ہیں۔ گذشتہ دو چار دہائیوں سے ہمارے ہاں جاپانی صنف سخن ہائیکو نے بھی خاصی حد تک رواج پانے کی کوشش کی ہے۔ پہلے اس کے تراجم ہوا کیے، اور، اب طبع زاد ہائیکو نہ صرف لکھے جارہے ہیں بلکہ تواتر کے ساتھ اس پر مشتمل مجموعے بھی منظر عام پر آنے لگے ہیں۔ حتیٰ کہ جاپانی حکومت اور سفارت خانہ بھی اس سلسلے میں حوصلہ افزائی کے چند مراحل طے کرتے نظر آتے ہیں اور ان میں سے بعض کتابوں کا جاپانی میں ترجمہ کروانے کا اہتمام بھی کرانے کی خبریں موصول ہوتی رہتی ہیں کہ اس طرح جاپانی کلچر کے ہمارے ملک میں فروغ کی راہ بھی کسی حد تک نمودار ہوتی ہے۔

میں ہائیکو کے ضمن میں برسہا برس پہلے اپنی رائے رجسٹر کرا چکا ہوں کہ یہ صنف سخن ہمارے شعری کلچر کے ساتھ ہم آہنگ نہیں ہو سکتی کیونکہ اس میں ہماری مٹی کی بو باس نہ ہونے کے برابر ہے جبکہ اس کا مزاج بھی مختلف ہے۔ چنانچہ اگر سہ مصرعی نظم ہی کہنا ہے تو ہمارے ہاں ماہیا کی صورت میں وہ پہلے ہی موجود ہے۔ تو اسی پر ہی کیوں نہ طبع آزمائی کی جائے بلکہ اب تو کچھ عرصے سے ماہیا اردو میں بھی لکھا جارہا ہے۔ نہ صرف ماہیا بلکہ "ثلاثی" وغیرہ کے نام سے بھی سہ مصرعی نظمیں نہ صرف کہی جارہی ہیں بلکہ اس کے مجموعے تک شائع ہو رہے ہیں۔ تاہم ہائیکو کے سلسلے میں یا لوگوں کو جاپانی حکومت اور سفارت خانے کی جو حوصلہ افزائی میسر ہو سکتی ہے وہ ایک اضافی سہولت ہے۔ جبکہ یہ معروضات اور مثالیں پیش کرنے کا مقصد محض یہ ظاہر کرنا

تھا کہ طویل نویسی سے مختصر نویسی تک کا سفر اب کہاں آ کر رکتا نظر آتا ہے اور یہ کہ غزل کو بطور صنف سخن کے اس سلسلے میں پہلے کیا کیا سہولتیں حاصل ہیں۔

اب سوال یہ بھی پیدا ہوگا کہ ادھر ادھر منہ مارنے کی بجائے ان سہولتوں سے مستفید ہوتے ہوئے غزل پر طبع آزمائی کیوں نہیں کی جاتی؟ اس کا ایک جواب تو یہ ہو سکتا ہے کہ غزل کے موضوعات پر اس حد تک طبع آزمائی ہو چکی ہے کہ اس میدان میں مزید گنجائش پیدا کرنے کے لیے جو خصوصی توفیق درکار ہے وہ ہر کسی کو ارزانی نہیں ہے۔ دوسرے غزل کہنے کے لیے بھی ایک خاص ذوق کی ضرورت ہوتی ہے جس کے بغیر اس ضمن میں کامیاب کوششیں نہیں کی جا سکتیں۔ چنانچہ غزل کو بھاری پتھر سمجھ کر اور چوم کر چھوڑ دینے والے شعراء اگر مختصر ترین نظم مثلاً ہائیکو وغیرہ کی طرف نکل جاتے ہیں تو بھی انہیں خوش آمدید ہی کہنا چاہیے۔ بے شک ان میں سے بعض غزل کو از کار رفتہ ہی کیوں نہ خیال کرتے ہوں۔

بہر حال اس میں کوئی شک ہی نہیں کہ وہ ہائیکو، ثلاثی، رباعی، قطعہ ہو یا مختصر ترین نظم کی کوئی بھی شکل اس کا لازمی رجحان غزل ہی کی طرف ہے، یعنی غزل میں جو بات دو مصرعوں کے اندر کہی جا سکتی ہے، وہی بات تھوڑے سے فرق کے ساتھ ان اصناف سخن میں بھی کہنے کی کوشش کی جاتی ہے کیونکہ جدید غزل بھی اب محض عورتوں کے ساتھ باتیں کرنے تک ہی محدود نہیں رہ گئی ہے۔ اس کا کینوس اب اس حد تک پھیل چکا ہے کہ اس کی بعض حدیں چہ بلحاظ مضمون و معنی، اور چہ بلحاظ لفظیات و طرز ادا، نظم کے ساتھ ملتی نظر آتی ہیں۔ علاوہ ازیں جدید اردو غزل میں ایک مستور اور نامحسوس تسلسل بھی راہ پاتا جا رہا ہے اور جس کا مطلب بھی یہ ہے کہ غزل اور نظم کے فاصلے روز بروز کم ہوتے جا رہے ہیں اور یہ بجائے خود ایک بےحد خوش آئند بات ہے اور اس کا نوٹس لیا جانا چاہیے۔

چنانچہ نظم اور غزل کے فاصلے جوں جوں کم ہوں گے، غزل کے انفرادی شعر کی اہمیت اور افادیت میں توں توں اضافہ ہوگا اور اس میں دلچسپی کی سب سے بڑی بات یہ رہے گی کہ غزل اپنی ظاہری ہیئت میں کوئی تبدیلی لائے بغیر یہ امتیاز حاصل کر رہی ہوگی۔ میری ناقص رائے میں ان فاصلوں کو کم کرنے اور اس بے سود اور غیر ضروری تنازعے کو ختم کرنے میں غزل کی ایجاز و اختصار کے علاوہ زبان و بیان کے اس مزاج کا دخل بنیادی حیثیت رکھتا ہے جو غیر محسوس طور پر خود بھی تبدیل ہو رہا ہے اور جسے شعری اور تخلیقی سطح پر شعوری طور سے بھی تبدیل کرنے کی کوششیں کی جا رہی ہیں کیونکہ اگر بغور دیکھا جائے تو غزل کے اشعار میں موجود ایجاز و اختصار بجائے خود زبان و بیان کی نت نئی اور بدلتی ہوئی صورتوں کی عکاسی کرتا ہے جبکہ غزل کی اپنی استقامت اور بقاء کا زبان و بیان کی اس کایا کلپ کے بغیر تصور نہیں کیا جا سکتا کہ زبان اور اس کا نیا تازہ تر، منفرد، اور غیر معمولی استعمال ہی جدید غزل کی صورت میں اپنے آپ کو تسلیم کروا رہا ہے ورنہ مضمون و معنی کے حوالے سے تو غزل اپنے جملہ امکانات کوئی صدی بھر پہلے بروئے کار لا چکی ہے بلکہ انہیں بار بار دہرا بھی چکی ہے۔ اس سلسلے میں اسلوب اور لہجے کا اپنا کردار ضرور ہے لیکن اس کے اپنے حدود ہیں اور یہی اسلوب خود شاعر کی حد تک بھی ایک کلیشے بننے کی خاصیت رکھتا ہے اور اس کی پیروی یا نقالی کرنے والوں کی حد تک بھی۔ چنانچہ سوائے اس کے کوئی چارہ نہیں کہ اس بات کو تسلیم کر لیا جائے کہ زبان اور اس کا طریق استعمال نہ صرف خود تبدیل ہو رہا ہے بلکہ یہ اپنے ساتھ ساتھ شاعری اور اس کے مزاج اور ماحول کو بھی یکسر تبدیل کیے جا رہا ہے کیونکہ کوئی بھی اور عنصر اس کارنامے کا اہل نہیں ہے۔

مجھ سے یہ کہا گیا ہے کہ میں نے اس سلسلے میں جو کچھ کہا ہے، وہ کیا ہے اور ایسا کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ اس سوال کے دو حصے ہیں اور میں نے صرف ایک

حصے کا جواب دینے کی کوشش کی ہے کہ مجھے ایسا کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی۔
البتہ جو نام نہاد کام میں نے اس سلسلے میں کیا ہے، بلکہ کرنے کی ایک مسلسل لیکن غیر مربوط کوشش کی ہے وہ "گلافتاب" سے لے کر "رطب و یابس"، "عیب و ہُنر" اور "اطراف" وغیرہ میرے مجموعہ ہائے کلام میں پھیلا ہوا اور دستیاب ہے، اس لیے میں ضروری نہیں سمجھتا کہ اب نثر میں بھی اُسے بیان کروں۔ شاید میں چاہوں بھی تو ایسا نہیں کر سکوں گا۔ اول تو میرا چاہنا ہی ممکن نہیں ہے، کیونکہ یہ میرا کام ہے ہی نہیں کیونکہ میرا کام جو کام تھا وہ میں نے کر دیا بلکہ اب بھی کر رہا ہوں باقی کام اہلِ نظر کا ہے میرا نہیں۔ یہ ناکام ہے یا کامیاب، یہ بتانا میرا منصب نہیں۔ البتہ میں اس ضمن میں شک و شبہ میں ضرور مبتلا ہوں اور یہی بات مجھے اس سفر کو جاری رکھنے پر اُکساتی رہتی ہے۔ جیسا کہ میں اوپر کہیں عرض کر چکا ہوں، یہ سب کچھ ایک سعیِ نامشکور بھی ہو سکتا ہے اور جو اصول میں نے وضع یا تبدیل کرنے کی سعی کی ہے وہ نادرست بھی ہو سکتے ہیں، یا ان کے نتائج مشکوک بھی قرار دیے جا سکتے ہیں لیکن جس بات پر میرا غیر متزلزل ایمان ہے وہ یہ ہے کہ کام مجھے ہی کرنا چاہیے تھا، اور اسی لیے میں نے اسے کامیابی یا ناکامی کے احساس سے ماوراء ہو کر کیا ہے۔ اس میں اگر مجھے نقصان اُٹھانا پڑا ہے تو یقیناً کسی حد تک فائدہ بھی ہوا ہے جس کا ذکر میں اوپر کہیں کر چکا ہوں۔

چنانچہ میں نے اس بے ربط تحریر میں سوال کے دوسرے حصے ہی کا جواب دینے کی کوشش کی ہے جس میں یہ اضافہ بھی مسلسل موجود نظر آئے گا کہ یہ صرف میری ہی نہیں بلکہ جدید شاعری کی اپنی ضرورت بھی تھی، اور ہے۔ میں کوئی مضمون نگار، نقاد یا ماہرِ لسانیات بھی نہیں ہوں اور یہی وجہ ہے کہ میری تحریروں میں زیادہ ربط اور منطق بھی نہیں ہوتے اور میں اپنی تحریروں کو زیادہ مربوط بنانے کی کوشش نہیں کرتا کیونکہ میرے حساب سے بے ربطی بجائے خود ایک ربط کی حامل ہوتی ہے جسے تلاش کرنا

ناممکن نہیں ہوتا۔ علاوہ ازیں میرا یہ موضوع نہیں، زیادہ سے زیادہ اسے میرا مسئلہ کہا جا سکتا ہے۔ میری بیک وقت آسانی اور مشکل یہ بھی ہے کہ ان معاملات پر میرا زاویۂ نگاہ سراسر شاعرانہ ہے چنانچہ اس کے بعض پہلو دلیل و منطق سے ماوراء بھی ہو سکتے ہیں کہ تخلیقی عمل کے دوران دلیل و منطق ایک حد تک ہی آپ کا ساتھ دے سکتے ہیں۔

اس ضمن میں کہ میں نے اس موضوع پر اب تک کیا کچھ کیا ہے، تفصیل کے ساتھ بیان کرنا میرے لیے زیادہ مشکل نہیں ہو سکتا کیونکہ میں نے محض مثالیں دینا ہوں گی اور بس، لیکن میں اسے بھی مناسب نہیں سمجھتا کیونکہ یہ کام بھی میں ہی کیوں کروں۔ اگر یہ کسی اور کا بھی مسئلہ ہے، یا وہ اس سارے کام کو مسترد بھی کرنا چاہتا ہے تو تھوڑا تردد وہ آپ کیوں نہ کرے۔ علاوہ ازیں میرے دیباچہ نگاروں افتخار جالب (گلافتاب) اور عبدالرشید (اطراف) نے اسے کافی حد تک بیان کر دیا ہے اور اس میں کوئی اضافہ کرنے کی میں فی الحال ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ مزید بر آں میرے اس رویئے سے ہمعصر اور نوجوان شعراء نے جس حد تک مثبت تاثر قبول کیا ہے، یا اس پر ناگواری کا اظہار کیا ہے، دونوں صورتوں کا جائزہ لیا جا سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ میں نے اگر اپنے لیے کوئی سہولت پیدا یا دریافت کی ہے تو وہ دوسروں کے لیے بھی ہے۔ چنانچہ اگر نئی نسل نے اس سے کوئی اچھا اور مفید اثر قبول کیا ہے تو اس کا اعلان و اعتراف کرنے کی ضرورت نہیں ہے اور نہ ہی میری حد تک اس پر کوئی دعویٰ باندھنا مناسب ہوگا۔ ظاہر ہے کہ کچھ چیزوں کی پیش بینی کی جاتی ہے اور پھر اس پر عمل بھی کیا جا سکتا ہے جبکہ پیش بینی عموماً انفرادی طور پر کی جاتی ہے اور اس پر عمل اجتماعی صورت میں۔ چنانچہ اگر یہ پیش بینی غلط اور محض وقت کا ضیاع تھا تو میں اس کے نتائج بھگتنے کے لیے آج بھی تیار ہوں اور کل بھی۔ اور اگر یہ ٹھیک، درست اور بروقت تھی تو میں اس کے انعام کا طلبگار نہیں ہوں کہ بعض کام، بلکہ ہر کام اپنا انعام خود ہوتا ہے۔

ایک بات شروع ہی سے رہی جا رہی ہے، اور وہ ہے شعر کہنے کی آزادی۔ واقعتاً ہمارے ہاں جہاں دیگر پابندیاں قدم قدم پر ہمارا راستہ روکتی ہیں، وہاں میں سمجھتا ہوں کہ ہمارے ہاں شعر کہنے کی آزادی بھی مکمل طور پر دستیاب نہیں ہے۔ چنانچہ معاشرے کی پابندیوں کے ساتھ ساتھ زبان و بیان کی پابندیاں بھی جہاں ہمیں اکثر سہولتیں فراہم کرتی ہیں، وہیں بعض رکاوٹوں کا باعث بھی ہیں۔ بے شک ہر آزادی کے ساتھ کچھ پابندیاں بھی ہوتی ہیں جنھیں ملحوظِ خاطر رکھے بغیر اُن آزادیوں سے بہرہ ور ہونے کا کوئی جواز نہیں ہوتا، لیکن کچھ پابندیاں ایسی بھی ہوتی ہیں جنھیں توڑنے یا تبدیل کرنے کی گنجایش ان کے اپنے اندر ہی موجود ہوتی ہے۔ چنانچہ بعض چھوٹی موٹی پابندیاں تو آپ کے تخلیقی وفور کے سامنے ویسے ہی ٹھہر نہیں سکتیں، البتہ کچھ رکاوٹوں کو آپ نے خود دور کرنا ہوتا ہے اور ظاہر ہے کہ چونکہ ایسی رکاوٹیں دوسروں کے نزدیک رکاوٹیں نہیں ہوتیں اور وہ اُنھوں نے بصد قابل قبول کر رکھی ہوتی ہیں، اس لیے وہ ان کے لیے حُرمت کا درجہ اختیار کیے ہوتی ہیں اور یہیں سے ان کے بارے میں اختلافِ رائے اور کشمکش کی بنیاد پڑتی ہے اور ایک مکالمے کا آغاز ہوتا ہے۔

چنانچہ میں نے اگر اور کچھ بھی نہ کیا ہو تو کم از کم ایک مکالمے کا آغاز اور اس کی بنیاد اور جواز ضرور فراہم کر دیا ہے اور یہ کام میں نے محض ہوا میں، یا زبانی کلامی نہیں کیا بلکہ میرے شعری سفر میں اس گرد و غبار کی چھاپ مسلسل نظر آتی ہے، تاہم اس موضوع پر اگر کسی باقاعدہ مکالمے کا آغاز نہیں بھی ہوا تو بھی مجھے اس پر کوئی تشویش نہیں ہے کیونکہ اس کساد بازاری کے عالم میں خود شعر و ادب پر کتنی توجہ اور اسے کتنی وقعت دی جا رہی ہے جو اس کے کسی پہلو پر کسی تحریک یا مکالمے کی گنجایش بھی نکل سکے۔ میں سمجھتا ہوں کہ شاید یہ کام ایسے ہی ہونا تھا، بغیر کسی شور شرابے اور دار و گیر کے اور یہی کیا کم ہے کہ یہ کام انفرادی اور اجتماعی بلکہ عوامی سطح پر بھی خاموشی کے

ساتھ ہو رہا ہے۔ اگر یہ غلط ہے تو اسے روکنا چاہیے اور، اگر صحیح ہے تو یہ اپنا راستہ خود ہی بناتا رہے گا، خود مجھے یا کسی بھی اور کو اس بارے فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ زبان میں ممکنہ تغیر و تبدل یا اس کے لیے شعری استعمال کے حوالے سے میں نے جو کچھ کرنے کی کوشش یا آرزو کی ہے، اس کے اظہار و بیان سے میں اپنی معذوری کا اظہار پہلے ہی کر چکا ہوں، اور شاید وہ اس قابل ہے بھی نہیں کہ اس کا ذکر ہی کیا جائے کہ یہ ایک بہت بڑے کام کی محض ابتداء بلکہ ابتداء کا ایک شائبہ ہی کہلا سکتا ہے۔ بس یوں سمجھیے کہ میں نے اس ضمن میں جاگتی آنکھوں ایک خواب سا دیکھا ہے اور تاحال اُس میں سے گزر رہا ہوں۔ تاہم یہ بے اطمینانی اپنی جگہ پر موجود ہے کہ یہ اگر ہے تو صرف میرا ہی مسئلہ کیوں ہے۔ کسی اور کا کیوں نہیں؟ میں یہ بات تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہوں کہ میں دوسروں سے اتنا مختلف ہوں کہ کوئی اس تجربے میں میرے ساتھ شریک ہونے کا اہل یا ضرورتمند ہی نہیں ہے۔ خیر یہ ایک الگ بحث ہے۔

فی الحال جو آخری بات میں عرض کرنا چاہتا ہوں وہ میری مستقبل کی ایک منصوبہ بندی کے بارے میں ہے جس کا کم از کم اعلان کرنے میں میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھتا۔ اگرچہ اس کی بنیاد میں بھی اُردو زبان کے تمول میں اضافہ کرنے ہی کی خواہش کارفرما ہے جبکہ زبان کی نشوونما کے بارے میں میری اولین تصوری اس میں بھی ایک مرکز کی حیثیت رکھتی ہے کہ اسے سیراب کرنے والے اُن قدرتی سرچشموں کو پھر سے رواں کر دیا جائے جو کہ بوجوہ اس پر بند کر دیے گئے ہیں۔ منصوبہ یہ ہے کہ اس بات کا امکان پیدا کیا جائے کہ پاکستان کے صوبوں میں بولی جانے والی مقامی بولیوں اور اردو کے باہمی فاصلے کو اس حد تک کم کر دیا جائے کہ جس کے نتیجے میں صرف اردو، اُور ایسی اُردو تشکیل پذیر ہو جائے کہ مقامی زبانیں کسی حد تک باقی رہتے ہوئے بھی اس اُردو میں اس حد تک گھل مل جائیں کہ اصل شناخت اُردو ہی کو ارزانی رہے۔

تقسیم ملک کے بعد ہمارے ملک کی حد تک اُردو میں جو تبدیلیاں وقوع پذیر ہوئی ہیں انھیں ہر صوبے کی سطح پر بھی دریافت اور شناخت کیا جا سکتا مثلاً صوبہ سرحد کی اُردو میں پشتو الفاظ، محاوروں، لہجوں اور رنگ کی آمیزش ہوئی ہے تو پنجاب، سندھ اور بلوچستان میں پنجابی، سندھی اور بلوچی کی حد تک ظاہر ہے کہ یہ کام بغیر کسی منصوبہ بندی کے اور قدرتی طور پر یعنی اپنے آپ ہی ہوا ہے جس سے کم از کم ایک بنیادی بات ثابت ہوتی ہے کہ ان تمام مقامی زبانوں کے اردو کی طرف مائل ہونے کے رجحان کا سُراغ ضرور ملا ہے جس سے مندرجہ بالا منصوبے کے توڑ چڑھنے کا حوصلہ اور اُمید لازمی طور پر میسر آتی ہے کہ یہ کوئی ایسا ان مل بے جوڑ معاملہ نہیں ہوگا کہ جس کا فطری طور پر ہونا ممکن نہ ہو، کیونکہ اردو کے مزاج میں انجذاب کی جو زبردست خاصیت اور طاقت موجود ہے، اس کے بل بوتے پر اس کی توسیع اور کشادگی کا ہر مرحلہ سر کیا جا سکتا ہے۔

اس بات کو تسلیم کر لینے میں کوئی ہرج نہیں کہ آزادی کے پچاس سال بسر کرنے کے بعد بھی ہمارے ہاں ایک متحدہ قومیت کا تصور مضبوط نہیں ہو سکا ہے۔ بے شک سیاسی طور پر ان صوبوں کو یکجا رکھنے کے لیے پارلیمانی طرزِ حکومت کے سیاسی نظام کا تردد تو روا رکھا گیا ہے لیکن جہاں کہاں ملک کی نسبت صوبے کی سطح پر سوچ کی کار فرمائی زیادہ زور شور کے ساتھ موجود ہے۔ بلکہ اب تو حالیہ مخفی اور نظر آنے والی بعض تبدیلیوں کے پیش نظر پارلیمانی طرزِ حکومت بجائے خود خطرات میں گھری نظر آتی ہے جبکہ ہمارے ازلی دشمنوں کی نظریں ہمیں فتح کرنے کی نسبت ہمیں تقسیم در تقسیم کر کے کمزور اور محتاج بنانے پر زیادہ لگی ہوئی ہیں اور اس سمت میں اُن کی پیش رفت بھی مختلف سطحوں پر جاری و ساری ہے۔ اس صورتِ حال کا بھی یہی تقاضا ہے کہ ہمارے ہاں تو ملی یکجہتی کا تصور مضبوط اور توانا ہو سکے تاکہ ہم اندرونی اور بیرونی دونوں قسم کے

خطرات سے عہدہ برآ ہونے کے قابل ہو سکیں۔ بے شک دینی اور ثقافتی لحاظ سے ہم ایک مضبوط رشتے میں منسلک ہیں لیکن اس کے باوجود ہمیں اب تک وہ یکسوئی میسر نہیں آسکی ہے جو ہماری بقاء کے لیے ضروری ہے۔ جہاں اس اندوہناک حقیقت کی یاددہانی ضروری ہے کہ مشرقی پاکستان کے ساتھ ہمارے بنیادی رشتے میں دراڑ اُس وقت بھی پڑی جب وہاں اُردو کو قومی زبان کے طور پر تھوپنے کی کوشش کی گئی جس کے نتیجے میں لسانی فسادات برپا ہوئے اور لاتعداد قیمتی جانوں کا ضیاع ہوا۔

دین و مذہب اور ثقافت کے بعد اب ہمارے پاس زبان ہی کا ایک رشتہ باقی ہے جس کے ذریعے ہم اپنے آپ کو ایک دوسرے کے ساتھ مضبوطی سے باندھ سکتے ہیں اور وہ ہے اُردو زبان لیکن اسے اُوپر سے تھوپنے کی غلطی اگر دوبارہ کی گئی تو نتیجہ پھر منفی ہی نکلے گا۔ چنانچہ اس کا واحد طریقہ یہی ہوگا کہ اردو اور یہاں کی صوبائی اور مقامی زبانوں اور بولیوں کا آپسی فاصلہ اور فرق ہی کم سے کم کر دیا جائے کہ نہ اُردو ان زبانوں کے لیے اجنبی رہے اور نہ یہ زبانیں اُردو کے لیے کسی طرح کی غیریت کا سامان کر سکیں۔ چنانچہ اس سے زیادہ ستم ظریفی کی بات اور کیا ہو سکتی ہے کہ مختلف صوبوں میں رہنے والے ایک دوسرے کی زبان ہی نہ سمجھ سکیں۔ بے شک اردو کو ہمارے ہاں قومی زبان قرار دیا جا چکا ہے لیکن محض زبانی کلامی کیونکہ اسے ابھی تک دفتری زبان بننے کی فضیلت حاصل نہیں ہو سکی ہے اور یہ آدھا تیتر اور آدھا بٹیر ہو کر ہی رہ گئی ہے۔ بے شک یہ صورت حال انگریزی کے حوالے سے ایک احساس کمتری کا نتیجہ ہی کیوں نہ ہو لیکن اس کے نقصان رساں اثرات کو بجا طور پر محسوس کیا جا سکتا ہے۔

چنانچہ نابود اور مفقود ہوتی ہوئی قومی یکجہتی کو حاصل اور مضبوط کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اس سلسلے میں جلد از جلد پیش رفت کے لیے منصوبہ بندی کی جائے جو کہ سرکاری اور اجتماعی سطح پر بھی ممکن ہے اور انفرادی طور پر بھی۔ سرکاری طور پر اس

طرح سے کہ ہر صوبے میں دوسرے صوبوں میں بولی جانے والی زبانوں کی تعلیم کا اہتمام کیا جائے، حتیٰ کہ غیر سرکاری تعلیمی ادارے بھی اس کام میں برابر کے شریک ہوں۔ بین الصوبائی طور پر ما بعد اور اساتذہ کے تبادلے کرنے کے علاوہ اس کام کو ایک تحریک کے طور پر شروع کیا جائے۔ علاوہ ازیں الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا کے ذریعے اس تحریک کو مزید مؤثر طریقے سے روبراہ کیا جائے۔ اس سے صرف یہ نہیں ہوگا کہ مختلف صوبوں میں بولی جانے والی زبانیں ایک دوسری کے قریب آئیں گی بلکہ لامحالہ طور پر صوبوں کے لوگوں کو حقیقی طور پر ایک دوسرے کے قریب آنے اور ایک دوسرے کے مسائل سمجھنے کا موقعہ ملے گا اور جس سے قومی یکجہتی کا وہ عظیم مقصد پورا ہونا ممکن ہوگا جس کا ابھی تک ہم خواب ہی دیکھ رہے ہیں۔

انفرادی طور پر یہ کام شاعروں اور ادیبوں کا ہے جو اپنی تخلیقات کو الفاظ کا جامہ پہناتے وقت اس بات کا خیال رکھیں کہ وہ چاروں صوبوں میں بولی جانے والی زبانوں کی زیادہ سے زیادہ آمیزش اپنی تحریروں میں اس چابکدستی کے ساتھ کیونکر کر سکتے ہیں کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی بچ رہے۔ یہ کام کچھ ایسا آسان بھی نہیں ہوگا لیکن اپنی بقا کے لیے اگر کسی مشکل کام میں بھی ہاتھ ڈالنا پڑے تو مشکل چھوڑ ناممکن کو بھی ممکن بنایا جا سکتا ہے۔ شرط صرف یہ ہے کہ ہر شخص اسے اپنی انفرادی ذمہ داری بھی سمجھے اور اس جہاد میں اپنا ذاتی حصہ ڈالنے پر تیار بھی ہو۔ اس ضرورت کا احساس و ادراک پیدا کرنے کے لیے بھی حکومت اور میڈیا کی طرف سے ایک زور دار تحریک چلائی جا سکتی ہے جس میں غیر سرکاری ادارے اور افراد بھی شامل ہو کر اپنا کردار ادا کر سکتے ہیں۔

اس کام کا یہ نامکمل سا خاکہ میں نے پیش کر دیا ہے اور جس میں یار لوگوں سمیت جملہ متعلقہ فریقوں کے لیے دعوتِ فکر و عمل کا بھی اپنے طور پر اہتمام کر دیا ہے۔ تاہم اگر یہ کام مندرجہ بالا سطحوں پر شروع نہیں بھی کیا جاتا تو مجھے تو بہرحال یہ

کام کرنا ہی ہے کیونکہ یہ میرے ہی شروع کردہ کام کا ایک ایسا بقایا حصہ ہے جس کے بغیر میرا تھیسس کسی منطقی نتیجے پر پہنچ ہی نہیں سکتا۔ میرا اپنا اندازہ بھی یہی ہے کہ یہ تحریک شاعری میں سب سے پہلے آغاز کرے گی اور آہستہ آہستہ پھیلنا شروع کرے گی کہ معلوم تاریخِ ادب میں شاعری ہی ہمیشہ ہراول دستے کے طور پر کارفرما رہی ہے۔ میں نے شروع میں کہا تھا کہ میں شاعری ہی کے حوالے سے بات کروں گا، تو یہاں بھی بات شاعری سے شروع نہ ہوتے ہوئے بھی شاعری ہی پر ختم ہو رہی ہے، اور یہ بات میرے لیے بجائے خود اطمینان بخش ہے۔

چنانچہ یہ کام میرے مستقبل کے شعری منصوبے کا ایک ایسا حصہ ہے جس میں دوسرے بھی نہ صرف شریک ہو سکتے ہیں بلکہ مجھے خوشی ہوگی اگر کوئی یہ کام خود مجھ سے بھی پہلے شروع کر دے کیونکہ یہ محض پیش بینی نہیں بلکہ وقت کی اہم ضرورت بھی ہے۔ علاوہ ازیں خواب دیکھنے پر کسی کی کوئی اجارہ داری بھی نہیں ہو سکتی۔ میرے علاوہ، اور، مجھ سے بہتر خواب دیکھنے والے بھی موجود ہیں جو اپنے اپنے تبصروں کے بارے میں فکرمند بھی ہوں گے کہ کسی بھی بڑے کارنامے کی ابتدائی شکل ایک خواب ہی پر مشتمل ہوتی ہے، اور یقیناً اُس خواب کے خدوخال نے ابھی مزید واضح ہونا ہے، جو اب بھی کچھ ایسا دھندلا یا غیر واضح نہیں ہے یعنی:

نظر کے سامنے رہتا ہے نقشہ اُس عمارت کا

ظفرؔ جس کے لیے ہم نے کبھی مسمار ہونا ہے

اردو زبان اور میرے لسانی تجربات

امجد اسلام امجد

اردو زبان اس اعتبار سے ایک انتہائی منفرد زبان ہے کہ اس کا جغرافیائی محل وقوع اور تاریخ ارتقاء دونوں ہی کا عمل دنیا کی دیگر بڑی زبانوں سے بنیادی فرق رکھتا ہے۔ اس لشکری زبان کی فتوحات کا دائرہ تاریخی اعتبار سے تو ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد سے ہی سلسلہ آرا ہوتا ہے لیکن ان تیرہ صدیوں کے سفر میں مستثنیات سے قطع نظر اصل کام گزشتہ چار صدیوں ہی میں ہوا ہے۔ عربی، فارسی، ہندی اور برصغیر کی دیگر علاقائی زبانوں کے میل جول سے بننے والی اس زبان کو فورٹ ولیم کالج کے توسط سے جو ایک نیا رنگ ملا اور پھر انیسویں صدی کے آخر سے اب تک اس میں مغربی زبانوں کے الفاظ کی جو آمیزش ہوئی ہے، اس کے پیش نظر یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ اُردو زبان کا بنیادی رجحان ایک کھلے دروازے کی پالیسی والا ہے یعنی کہ...... جو آئے، آئے کہ ہم دل کشادہ رکھتے ہیں۔

میرے خیال میں یہ تصویر اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتی جب تک اسے "پاکستان اور اردو" کے تعلق کے مخصوص تناظر میں دیگر پاکستانی زبانوں کے ساتھ ہم آہنگ اور ہم رنگ نہ کیا جائے۔ یہ ایک امر واقعہ ہے کہ گزشتہ ۵۰ برس میں بالخصوص اور بیسویں صدی میں بالعموم اُردو زبان کی ترویج و ترقی اور ساخت کے سلسلے میں جو کام برصغیر کے اُس حصے میں ہوا ہے جسے آج ہم پاکستان کہتے ہیں، وہ اپنی مثال آپ ہے اور اب صحیح معنوں میں یہی علاقے اُردو کا اصل گڑھ اور اس کے مستقبل کے امین ہیں۔ یوپی اور سی پی کا محاورہ اور روزمرہ تاریخی اعتبار سے تو اُردو زبان کا ایک قیمتی اثاثہ ہیں مگر

جہاں تک جدید اردو کا تعلق ہے اب یہ علاقے اس زبان کے عناصرِ ترکیبی کی فہرست میں بہت ہی آخری درجے پر آتے ہیں۔ بقول عطاء الحق قاسمی اُردو معلیٰ اب اُردوئے محلہ کی شکل میں ڈھل کر ہی زندہ رہ سکتی ہے۔

ذاتی طور پر میں اس تبدیلی اور ارتقاء کے عمل کو ایک زندہ زبان کا حق اور خاصہ سمجھتا ہوں اور اس بات پر یقین رکھتا ہوں کہ پاکستان میں لکھی اور بولی جانے والی تمام زبانوں کے وہ سب الفاظ، محاورے، تراکیب اور مثالیں اردو میں شامل کر لینے چاہئیں جن سے اس زبان کو فطری مناسبت ہو اور جن کی شمولیت سے اس زبان کے ذخیرۂ الفاظ میں وسعت اور قدرتِ اظہار میں گہرائی اور تنوع پیدا ہو سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے اپنے ٹی وی ڈراموں میں بالخصوص اور اپنی دیگر تحریروں میں بشمول شاعری میں بالعموم ان الفاظ کو کھل کر استعمال کیا ہے اور اظہار کے پیرایوں میں بھی اُن رنگوں کو خوش آمدید کہا ہے جن سے تحریر میں ہماری زمین، تہذیب اور لوک ورثے کی خوشبو رچ بس سکے۔

ڈرامے میں (خاص طور پر "وارث" میں) مجھے یہ آسانی رہی ہے کہ کردار جس علاقے سے تعلق رکھتا ہے اور جو بھی اس کی مادری زبان ہے، اس کا لہجہ اور مخصوص ذخیرہ الفاظ اس کے مکالموں میں شامل کر دیا جائے۔ مجھے بے حد خوشی ہے کہ میرے اس انداز کو عمومی طور پر بہت پسند کیا گیا ہے۔ شروع شروع میں چند احباب نے اسے زبان کی توڑ پھوڑ اور معیار کی پستی کا راستہ قرار دینے کی کوشش کی لیکن مقامِ شکر ہے کہ اب اُن میں سے بھی بیشتر نے میری نیت کی صفائی اور اس عمل کی ضرورت اور معنویت کو سمجھ لیا ہے اور اگرچہ میں اس سفر میں کبھی بھی اکیلا نہیں تھا مگر اب تو میرے بے شمار رازدان بھی پیدا ہو چکے ہیں۔

آخر میں ایک بات کی وضاحت ضرور کرنا چاہوں گا کہ لسانی تجربات اور زبان

کے ذخیرۂ الفاظ میں تبدیلی اور وسعت کو محض نئے پن یا فیشن کے طور پر نہیں اپنانا چاہیے اور اُردو زبان میں مستعمل بامعنی اور خوبصورت لفظوں کو ناما نوس، بے ڈھب اور غیر ضروری مقامی لفظوں سے صرف اس لیے نہیں بھر دینا چاہیے کہ ایسا کرنے سے اُردو زبان زیادہ امیر اور وسیع ہو جائے گی کیونکہ ایسی نادان دوستی سوائے انتشار کے اور کسی چیز کو راستہ نہیں دے گی۔

جہاں تک بول چال اور عام استعمال کی زبان کا تعلق ہے وہ تو اپنا راستہ خود متعین کرتی رہے گی۔ البتہ ہر پانچ دس سال کے بعد ایسے الفاظ کی فہرست مرتب کرکے، جو تحریروں میں استعمال ہو کر قبولیت اور استناد کا درجہ حاصل کر چکے ہیں، اُنھیں لغات میں شامل کرتے رہنا چاہیے تاکہ اُنھیں معیار کی سند حاصل ہو جائے اور یوں زبان میں ہونے والے عمل کی توثیق ہوتی رہے۔

حصہ پنجم

محضری تجربے اور تجزیے

پاکستانی اردو کا ایک نمونہ:

شوکت صدیقی کے ناول جانگلوس کا مختصری تجزیہ

ڈاکٹر عطش درانی

پاکستانی اردو کے نثری ارتقا میں تعلیم، صحافت اور ادب کے دھارے متوازی بہتے ہوئے بھی زبان کے مختلف متغیر پہلوؤں کا ایک واضح سنگم پیش کرتے ہیں۔ اردو کے اس پچاس سالہ سفر میں ان لسانی تغیرات کا باسانی تجزیہ کیا جا سکتا ہے۔ صحافتی کالموں، سفرناموں، انشائی ادب اور خاص طور پر افسانوں اور ناولوں کی دنیا میں پاکستانی اردو کا لب و لہجہ اکثر اہل قلم کے ہاں بکھرا ہوا ملتا ہے۔ اس کے نثری مخزن کا تجزیہ ہم تین طرح سے کر سکتے ہیں۔ (۱) علاقائی تغیرات، (۲) سماجی تغیرات اور (۳) ذاتی تغیرات۔

جہاں تک علاقائی تغیرات کا تعلق ہے، وہ کسی بھی زبان کے جغرافیائی سفر میں لازم ٹھہرتے ہیں: زبان میں اس قسم کے موڑ آتے ہیں۔ پاکستانی اردو بھی ایسی ہی راہوں کی ایک منزل ہے۔ سماجی اور علاقائی ثقافت، رسوم، لہجے، تلفظ اور ذخیرۂ الفاظ و تسمیہ بھی پاکستانی اردو پر اپنا اثر لازم ڈالتے ہیں۔ جہاں تک ذاتی تغیرات کا تعلق ہے اس کا زیادہ تر حوالہ قلمکار کے اپنے رجحانات، پس منظر اور غرض و غایت ہی میں ملتا ہے۔ پاکستانی اردو کے ارتقا میں یہ حوالہ قابل توجہ ہے۔ اردو نثر میں خاص طور پر انشائی ادب، سفرناموں، افسانوں، ڈراموں اور ناولوں میں ان تینوں تغیرات کا مطالعہ واضح

انداز میں کیا جا سکتا ہے۔

قیام پاکستان کے بعد سے ۱۹۶۵ء تک پاکستانی اردو کا تناظر اسلوب سے زیادہ موضوع کے حوالے سے ہمارے سامنے آتا ہے۔ خاص طور پر اردو ناولوں میں یہ موضوع زیادہ محسوس ہوتا ہے۔ آزادی کے وقت تاریخ اسلام اور فسادات کے موضوعات پسندیدہ تھے۔ رئیس احمد جعفری کے "خاک و خون"، ایم اسلم کے "رقص ابلیس"، قدرت اللہ شہاب کے "یا خدا"، فضل احمد کریم فضلی کے "خون جگر ہونے تک"، احسن فاروقی کے "سنگم" اور شوکت صدیقی کے "خدا کی بستی" میں یہ موضوعات تو ہمارے سامنے آتے ہیں، ماحول بھی نظر آتا ہے جو آگے بڑھ کر مختار مسعود کے انشائیے "آواز دوست" میں زبان کی چاشنی سے آشنا کرتا ہے۔ تاہم ابھی زبان کا تغیر بہت کم محسوس ہوتا ہے۔ پھر "آواز دوست" کے حوالے سے پاک سرزمین کی بو باس واضح ہونے لگتی ہے۔ ثقلین نقوی کا ناول "میرا گاؤں" مشرقی پاکستان کا حوالہ لیے ہوئے ہے جس کے تناظر میں آگے بڑھتے ہوئے سلمیٰ اعوان کا "تنہا" اور طارق محمود کا "اللہ میگھ دے" قابل توجہ ہیں۔ مسعود مفتی کا رپورتاژ "لمحے" سقوط ڈھاکہ کے حوالے سے اسی زمرے میں شامل کیا جا سکتا ہے۔

موجودہ پاکستان کا حوالہ شوکت صدیقی کے "خدا کی بستی" کے بعد جمیلہ ہاشمی کے ناولٹ "روہی" (بہاولپور) کے تناظر میں واضح ہوتا نظر آتا ہے، جو آگے بڑھتا ہوا صدیق سالک کے "پریشر ککر" اور "ایمرجنسی" میں ملتا ہے اور انور سجاد کے "خوشیوں کا باغ" اور یونس جاوید کے ڈرامہ "رگوں میں اندھیرا" تک چلا آتا ہے۔ رحمان مذنب کا ڈرامہ "تکون" بھی اسی تناظر میں شامل ہے۔ مختار مسعود کا سفرنامہ "سفر نصیب" بھی اس حوالے سے قابل تذکرہ ہے۔

جہاں تک جغرافیائی، سماجی و علاقائی لسانی تغیر کا تعلق ہے۔ اس میں پاکستانی

دیہات کا پس منظر سید شبیر حسین کے ناول "جھوک سیال" سے آغاز کرتا ہے۔ امجد اسلام امجد کے ڈرامہ "وارث" میں پنجابی آمیز مکالمات، نور الہدیٰ شاہ کے "جنگل" میں سندھی ماحول کے تناظر سے ہوتا ہوا یونس جاوید کے ڈرامے "اندھیرا اُجالا"، منو بھائی کے "سونا چاندی"، سلیم چشتی کے "نشیمن"، عطاالحق قاسمی کے "شب دیگ" کے علاوہ اصغر ندیم سید کے ڈراموں کے بعد مستنصر حسین تارڑ کے سفر ناموں اور خاص طور پر ان کے ناول "بہاؤ" تک جا پہنچتا ہے۔

یہاں بول چال کے حوالے سے اشفاق احمد کے ریڈیو پروگرام "تلقین شاہ" کا ذکر لازم ہے، یہ پاکستانی اردو بول چال کے مختلف سانچوں کی پہلی کڑی ہے۔ ان کے ٹی وی ڈراموں نے اس منظر نامہ کو بہت حد تک پھیلا دیا۔ چنانچہ پاکستانی اردو کے فروغ میں اشفاق احمد کی خدمات سب سے بڑھ کر ہیں۔

ادبی منظر میں بول چال کے سانچے امجد اسلام امجد اور اصغر ندیم سید سے بھی ممتاز مفتی کے "علی پور کے ایلی" کے بعد کی تحریروں میں واضح ہیں لیکن اپنے پورے پاکستانی تناظر میں شوکت صدیقی کے ناول "جانگلوس" میں بھرپور طور پر سامنے آتے ہیں۔ یہ ناول "سب رنگ، ڈائجسٹ" میں ظہور پذیر ہوا، ٹی وی ڈرامے کی ہیئت سے گزرا اور تین جلدوں میں اشاعت پذیر ہوا۔

ایک دوسری روایت نثر پاروں کی تھی، جو اسلامی روایات، زبان اور ثقافت کے حوالوں سے سامنے آ رہی تھی۔ ممتاز مفتی، رحیم گل، زیتون بانو، اشفاق احمد کی نگارشات کے بعد اس میں بانو قدسیہ کا ناول "راجا گدھ" بہت بلند مقام پر نظر آتا ہے۔ اشفاق احمد کے ڈرامے "من چلے کا سودا" میں یہ موضوع واضح تر ہوتا ہے جس میں زبان کا تغیر بھی شامل ہے۔

صحافتی تحریروں میں عطا الحق قاسمی کے "کالم تمام" اور رفیق ڈوگر کے شخصیے "چالیس چہرے" پاکستانی اردو کی اہم مثالیں ہیں۔

جہاں تک لسانی تغیرات کا تعلق ہے یہ "جانگلوس" میں بہت واضح ہے۔ یہ ایک ایسا ناول ہے جو نہ صرف قیام پاکستان، اس کی تاریخ، تقاضوں، مسائل اور پاکستانیت کے موضوعات کا احاطہ بھی کرتا ہے بلکہ اس کے جغرافیے، مقامات، شہروں، دیہات، گلی محلوں، سڑکوں اور نہروں کے ساتھ ساتھ چاروں صوبوں میں سفر کرتا، مختلف ثقافتوں، رسموں، رواجوں سے بھی آشنا کرتا ہے اور اس حوالے سے مقامی لہجوں، تلفظ/ ذخیرۂ الفاظ و تسمیہ کو بھی پیش نظر رکھتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ یہاں مصنف کا اپنا لسانی تغیر بھی واقع ہوتا ہے اور ذخیرۂ الفاظ کے ساتھ ساتھ استعمال زبان، روزمرے اور محاورے بھی بدلتے جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس ناول کا تجزیہ پاکستانی اردو کو واضح کرنے کی ایک عمدہ مثال نظر آتا ہے۔ چنانچہ اس کے دیگر ادبی محاسن سے قطع نظر یہاں اس کے لسانی مخنسر کی تجزیاتی مثالیں پیش نظر رکھی جائیں گی۔ مکالمات واوین (" ") میں دیے گئے ہیں اور مصنف کے بیانیہ سے اقتباسات اُن کے بغیر ہیں۔

ہمارے پیش نظر اس ناول کے مندرجہ ذیل ایڈیشن تھے۔ جلد اول چوتھا ایڈیشن اپریل ۱۹۹۲ء، جلد دوم تیسرا ایڈیشن جون ۱۹۹۵ء، جلد سوم پہلا ایڈیشن اکتوبر ۱۹۹۴ء۔ اس کا مخنسر ۱۹۶۵ء اور ۱۹۷۱ء کے درمیانی دور سے تعلق رکھتا ہے جس میں مقامیت آمیزی کا رجحان تیزی سے بڑھا۔ البتہ انگریزی آمیزی بہت کم تھی۔

.... O ....

جہاں تک پاکستانیت کے منظر نامے کا تعلق ہے، اس ناول میں جابجا قیام پاکستان، آزادی، تقسیم اور تقسیم کے بعد کی لوٹ ار کے واقعات، مسائل اور

موضوعات پر بحث کی گئی ہے۔ پنجاب کی تقسیم، سکھوں کی لوٹ مار، ہندوؤں کا طرز عمل، کانگریس اور مسلم لیگ کی سیاست، یونینسٹوں کے مسائل اور پھر قیام پاکستان کے بعد کی کایا پلٹ یہ سب کچھ اس میں ایک کھلے منظر نامہ کے طور پر پیش کیا گیا۔ جب مسلمانوں سے کہا جاتا رہا:۔

"تم نے پاکستان مانگا تھا............

اب پاکستان بن گیا۔ جاؤ اپنے پاکستان"۔ (جلد دوم، ص ۶۸۱)

پھر پاکستان میں ان پر کیا بیتی۔ ذرا ملاحظہ ہو:۔

"وہی تھانے دار جو پاکستان کو گندی گندی گالاں نکالتا تھا اور یونینسٹوں اور ان کی حکومت کو خوش کرتا تھا، اب ہر گھڑی پاکستان پاکستان کی رٹ لگاتا تھا" (جلد دوم، ص ۷۶۵)

پاکستان میں کلیموں اور الاٹ منٹوں کا جو چکر شروع ہو گیا تھا۔ یہ ناول اس کے تانے بانے سے تخلیق پاتا ہے۔ اس میں خاص طور پر پٹواری کا کردار ہے جس کے خلاف آج بھی کچھ نہیں ہو سکتا۔

"رپورٹ پٹواری مفصل ہے۔ اتے باری تھلے پٹواری" (جلد اول، ص ۴۹۷)

اس چکر میں چھوٹے چھوٹے لوگ بڑے بڑے زمیندار بن گئے، مارشل لا بھی آیا، زرعی اصلاحات بھی ہوئیں، لیکن ان کا کچھ نہ بگڑا۔

"تجھے یہ تو پتا ہوگا۔ سندھ میں زرعی اصلاحات کے لیے باری کمیٹی بنائی گئی تھی"۔ (جلد سوم، ص ۵۶۸)، "پر اس کا تو کچھ نتیجہ نکلا شکلا نہیں" (جلد سوم،

ص ۵۶۹)، "پنجاب میں بھی تو پہلے زرعی اصلاحات ہو چکی ہیں"۔ (جلد سوم، ص ۵۷۲)

"اس بار تو مارشل لا کے تحت ہونے والی ہے......... سائیں اب حالات پہلے سے نہیں رہے۔ نہ اسمبلیاں رہیں نہ ان کی ممبری، نہ وزارتیں"۔ (جلد سوم، ص ۵۶۵)

یہاں آکر کلیم ہولڈروں نے کیا کیا۔ نواب فرخو کا کردار، اس کی بیٹی گیتی آرا کا شمع محفل بننا، لکھنؤ جا کر جائداد کے کاغذات بنوانا، بوڑھے باپ کی مدد کے لیے بڑے افسروں کے پاس جانا، کلیم منظور کرانا (جلد اول، ص ۴۲۳ تا ص ۴۴۴) یہ سب کچھ مفصل طور پر پیش کیا گیا ہے۔ پاکستان کے ساتھ الحاق کرنے والے نوابوں کا کیا حال تھا، ذرا ملاحظہ ہو:

"شان دار ڈاگ ہاؤس تو سچ پوچھو نواب جونا گڑھ کا ہوتا تھا۔ بہت شہرت تھی اس کی" (جلد سوم، ص ۲۰۰)

مقامی زمینداروں کا کیا حال تھا۔ یہ مندرجہ ذیل اقتباسات سے واضح ہے۔ ان سے مجموعی طور پر پاکستان کے ہر علاقے (پنجاب، سندھ، بلوچستان اور سرحد) کی تصویر اپنے پورے خدوخال کے ساتھ نمایاں ہوتی ہے۔ ان اقتباسات میں مکالمات بھی ہیں اور مصنف کے بیانیہ جملے بھی۔ ان میں ثقافت کے ساتھ زبان کا تغیر، لہجے اور استعمال بھی قابل توجہ ہے:

"زیادہ تر وڈے زمیں دار یا جگیر دار شہر میں کوٹھیاں، بنگلے بنوا کر رہتے ہیں۔ وہاں عیش کرتے ہیں اور زمیں داری مینجر، کاردار اور منشی چلاتے ہیں"۔ (جلد دوم، ص ۳۴۶)

"یہ ہماری جدی جگیر ہے یہاں ہمیشہ ہماری عملداری رہی ہے۔ انگریز کے راج

میں بھی اور آج بھی ادھر ہمارا ہی کنون چلتا ہے"۔ (جلد دوم، ص ۵۰۹)

"جتنا وڈا زمیں دار ہو گا اتنا ہی وڈا رسہ گیر ہو گا"۔ (جلد دوم، ص ۲۱۳)

"یہ عزت اور دبدبہ قائم رکھنے کا معاملہ ہے۔ اس کے لیے خود کو بہت اونچا رکھنا پڑتا ہے۔ مزارعوں اور کمیوں کو جتی کے نیچے دبا کر رکھنا پڑتا ہے"۔ (جلد دوم، ص ۶۱۷)

"ہمارے بزرگ اور وڈیرے ایسا نہ کرتے تو مزارعے سرکشی اور بغاوت کر کے کب کے ہم سے زمیں داریاں چھین لیتے" (جلد سوم، ۵۲)

شادی کی اجازت کے لیے انھیں سردار کو نذرانہ پیش کرنا پڑتا جسے ڈالی کہا جاتا ہے۔ یہ پرنا ٹیکس تھا۔ (جلد دوم، ص ۵۵۰)

"افضل خاں نے کنجری کو نیا ٹکا بنوا کر دیا اور سزا کے طور پر اپنے تمام مزارعوں پر ٹکا ٹیکس لگا دیا۔ بر یگ بن پر ایک من کنٹرک" (جلد سوم، ص ۶۵)

"سئیں گالہ صرف اتنی نہیں ہے۔ آج وہ ٹکا ٹیکس ختم کرائیں گے تو کل پرنا ٹیکس، مرن ٹیکس، مونڈن ٹیکس، ڈھور ڈنگر ٹیکس، دری ٹیکس، گکڑ ٹیکس، سارے ہی ٹیکس ایک ایک کر کے ختم کراتے جائیں گے۔ تب زمینداروں کا کیا بنے گا؟ خالی ونڈائی سے فصل پر کیا ملے گا؟" (جلد سوم، ص ۶۸)

"میری طرح یہاں تین اور بکر قید ہیں۔ ان کا پرنا ماپیو نے سردار کی اجازت کے بنا چوری سے کر دیا تھا" (جلد دوم، ص ۵۸۰)

کھتا تھا رن کے معاملے میں تو سندھی وڈیروں کا حال یہ ہے کہ کسی جھاڑی پر

بوچھن پڑا لہراتا ہو تو وڈیرے دونوں بازو پھیلا کر اسے بھی بھینچ لیتے ہیں"۔ (جلد سوم، ص ۲۴۸)

بلوچستان کے قبائلی سرداروں اور جاگیرداروں کی بھی ایسی ہی نجی جیلیں تھیں جو زمین دوز تہہ خانوں میں قائم تھیں۔ (جلد سوم، ص ۱۹۸)

"تجھے پتہ ہے! یہ بلوچ تمن داروں کا علاقہ ہے یہاں ان کا ہی قانون چلتا ہے"۔ (جلد سوم، ص ۲۳۲)

"بلوچ جرگے کے فیصلے کے خلاف عام طور پر سرکاری عدالتوں میں نہیں جاتے۔ اسے بہت بُرا سمجھا جاتا ہے"۔ (جلد سوم، ص ۲۵۲)

"بلوچ قانون کی رو سے کالی کی سزا یہ ہے کہ اسے خود اپنے ہاتھ سے گلے میں پھندا ڈال کر پھانسی پر لٹکنا پڑتا ہے۔ کالے کو کوئی بھی پھانسی پر چڑھا سکتا ہے"۔ (جلد سوم، ص ۲۸۲)

"یارا تم کو کیا کیا بتائیں۔ سرحد کے دوسرے خوانین جو بڑے زمیں دار ہیں غریب لوگ پر ایسا ہی ظلم کرتے ہیں۔ کسان پہاڑ اور چٹانیں کھود کر کھیتی باڑی کے لیے زمین نکالتے ہیں۔ اس پر فصل اگاتے ہیں۔ خوانین انھیں بے دخل کر کے خود زمین کے مالک بن جاتے ہیں"۔ (جلد سوم، ص ۶۷۷)

"(سرحد میں) مالتار وہ مزارع یا کسان ہوتے ہیں جو زمین کے مالک کو بٹائی نہیں دیتے۔ گھی، بکریاں اور مرغیاں دیتے ہیں، عشر ادا کرتے ہیں"۔ (جلد سوم، ص ۶۷۶)

یہ میاں اسلم کی مرضی پر تھا کہ کسی بتیرے کو کب تک بھٹے پر رکھا جائے اور

کب علیحدہ کر دیا جائے۔ (جلد سوم، ص ۴۵۹)

قرض کی فوری ادائیگی کے لیے بھرتی کے وقت بھٹہ مالکان کی جانب سے پتھیروں کو کچھ رقم پیشگی دے دی جاتی۔ یہ ایسا قرض ہوتا ہے جو قسطوں میں پتھیروں اور بھٹہ مزدوروں کی اُجرت سے کٹتا رہتا۔ (جلد سوم، ص ۴۶۰)

"راکھے چمڑے کے لمبے لمبے چھانٹے اور کوڑے ہاتھوں میں دبائے"۔ (جلد اول، ص ۳۵۹)

اور آخر میں سب سے دلچسپ جملہ "اوئے بھول جا" (جلد سوم، ص ۳۴۷) ان تمام باتوں کے ابلاغ کا بہت ہی عمدہ نمونہ ہے۔ اسی تناظر میں تاریخ کے اسباق بھی پوشیدہ ہیں:۔

"آج احمد خاں کھرل کو کوئی نہیں جانتا۔ کوئی اس کا ذکر نہیں کرتا۔ اس کی بہادری کی شان میں کسی میراثی نے گیت نہیں گایا، کوئی سد نہیں لگایا۔ لگاتا تو جیل میں بند کر دیا جاتا"۔ (جلد اول، ص ۴۲۷)

"انگریز، باغی سرداروں اور ان کی آل اولاد کو جانگلی کہتے تھے۔ سو میں اور میرا پیو جانگلی کہے جانے لگے۔ سجان اور اس کا پیو چوہدری بن گئے"۔ (جلد اول، ص ۴۲۹)

"میں تو جی بد تمیز ہوں۔ جانگلی جو ٹھہرا۔ بلکہ جانگلوس ہوں"۔ (جلد اول، ص ۴۴۵)

مقامی ماحول، ثقافت اور رسوم و رواج کی جھلکیاں ملاحظہ ہوں:

ایک بلوچ آگے بڑھا۔ وہ لمبی قمیص اور خوب گھیر دار شلوار پہنے ہوئے تھا۔ سر

پر ملگجی سفید پگڑی تھی۔ پگڑی کے نیچے گردن پر بالوں کے گھنے پٹے لہرا رہے تھے۔ ڈاڑھی اور مونچھوں کے بال بھی گھنے اور سخت تھے۔ چہرہ تیز دھوپ سے جھلسا ہوا تھا۔ آنکھوں سے سرخی جھلک رہی تھی۔ (جلد سوم، ص ۱۵۲)

اس کے ہاتھ میں خیری تھی یہ سفید لٹھے کا ڈھائی گز لمبا ٹکڑا تھا۔ وہ سردار مزاری کے قریب پہنچا، جھکا اور نہایت احتیاط سے خیری اس کی کمر اور گھٹنوں کے گرد لپیٹ کر بغل بندی کی۔ (جلد سوم، ص ۲۰۴)

"قرآن مجید کے ساتھ کیسے نکاح ہو سکتا ہے" .... "کسی مرد کے ساتھ ویاہ کرتا تو بیٹی کے ساتھ اس کے حصے کی زمین اور جائیداد بھی چلی جاتی "۔ (جلد سوم، ص ۵۷۵)

"جائیداد اپنے پاس رکھنے کے لیے ادھر کے کتنے ہی زمیں دار اپنی بیٹیوں کا نہ صرف قرآن شریف سے بلکہ میں نے تو یہ بھی سنا ہے کہ چاند اور سورج سے نکاح پڑھا کر اپنے ہی ساتھ رکھتے ہیں ......" (جلد سوم، ص ۵۷۵)

"جس کڑی کا قرآن سے نکاح ہو جاتا ہے، اسے بہت عزت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ اس کی سخت نگرانی بھی کی جاتی ہے۔ اگر وہ کسی سے چوری چھپے یاری لگا لے تو اسے بہت بُرا سمجھا جاتا ہے۔ سزا کے طور پر اسے اور اس کے یار دونوں کو کارا کاری قرار دے کر قتل کر دیا جاتا ہے"۔ (جلد سوم، ص ۵۷۵)

"سندھ میں ایسی ایک اور رسم بھی ہے۔ مرید اپنے پیر کی خوشنودی اور برکت حاصل کرنے کے لیے منت مانتے ہیں۔ اپنی سب سے زیادہ سوہنی کڑی کو اس کے لیے رکھ چھوڑتے ہیں"۔ (جلد سوم، ص ۵۷۶)

"ایسی کڑی کو بڑھنی کہتے ہیں۔ پیر تو بعد میں ...... کبھی نہیں آتا۔ پر بڑھنی بھی

ایک طرح سے پیرنی بن جاتی ہے"۔ (جلد سوم، ص ۵۷٦)

"اگر مرجان پر سیاہ کاری کا جرم ثابت ہو گیا اور جرگے نے اسے کالی اور سہراب کو کالا قرار دے دیا تو جائیداد پر مرجان کا حق ختم ہو جائے گا"۔ (جلد سوم، ص ۲۵۲)

وہ سردار تھا۔ سب کچھ کر سکتا تھا۔ اس سے کوئی باز پرس کرنے والا نہ تھا۔ (جلد سوم، ص ۳۰۳)

"سردار کے ساتھ سونے پر کوئی رن کیسے کالی ہو سکتی ہے"۔ (جلد سوم، ص ۳۰٦)

"کوئی جگیردار اور وڈا زمیں دار کسی بھی زنانی کو اٹھوا لے۔ اسے رکھیل بنا کر رکھے۔ بچے جنوائے۔ تب نہ عزت یاد آتی ہے نہ آن اور آبرو.......... دوسری طرف اپنی ہی طرح کا مزارع یا کمی بھگا لے جائے تو جھٹ عزت اور آبرو جاگ اٹھتی ہے۔ تب جی داری دکھاتے ہیں۔ قتل کرتے ہیں اور پھانسی کے پھندے پر لٹک جاتے ہیں"۔ (جلد دوم، ص ٦۷٦)

اس ناول میں مختلف علاقوں کی رسموں، لوک گیتوں، ماہیوں، دوہڑوں، سدوں، کافیوں، سمیوں، جھمروں کے علاوہ چیزوں اور منظروں کو بھی بخوبی پیش کیا گیا ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

بلوچیوں کا طائفہ قناتوں کے عقب سے نکل کر سامنے آیا۔ ان کے قد اونچے تھے۔ جسم مضبوط اور سڈول تھے۔ چہروں پر گھنی داڑھیاں تھیں۔ سروں پر گردن اور کانوں تک لٹکے ہوئے لمبے لمبے پٹے تھے۔ وہ ململ کے لمبے چغے پہنے ہوئے تھے۔ (جلد

دوم، ص ۵۱۷)

خواجہ فرید کی کافیاں بھی نہیں چلیں.... سمیں تھل کے علاقے کا بے حد مقبول عوامی گانا ہے۔ سمیں گیتوں میں عام طور پر یاس و حرماں کا پہلو نمایاں ہوتا ہے۔ (جلد دوم، ص ۵۱۹)

میاں والی کے تھل میں، چولستان اور بہاولپور کے ریگستانوں میں جال کے درخت کثرت سے ہوتے ہیں، ان میں پیلو لگتے ہیں۔ (جلد اول، ص ۳۶۹)

وہ اپنے سینے سے چمڑے کی ایک چھوٹی سی مشک باندھ لیتے ہیں جسے سندھاری کہا جاتا ہے۔ (جلد دوم، ص ۵۳۹)

دریا کے درمیان جگہ جگہ خشکی کے دو آبے نظر آتے ہیں۔ .... ان جزیروں کو کچے کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ (جلد دوم، ص ۵۳۸)

"تو اسے پانی کی چلہ سمجھ رہا ہے۔ ..... روہی کے علاقے میں ریت کے ٹیلوں کے درمیان میں نے ایسے ڈابر دیکھے ہیں"۔ (جلد اول، ص ۳۶۸)

جب دریا میں سیلاب آتا ہے جسے مقامی بولی میں ڈھا کہا جاتا ہے۔ (جلد دوم، ص ۵۳۹)

ملاّ کے لیے فاتحہ کا توشہ لے کر جا رہی تھی، یہ سچ کڑکا تھا۔ (جلد دوم، ص ۲۸۱)

وہ ریاست دیر کا اتمان زئی پٹھان تھا۔ (جلد سوم، ص ۶۷۳)

ناول کی تینوں جلدوں میں پاکستانی لینڈ سکیپ کی مثالیں جا بجا بکھری پڑی ہیں،

جن میں جیتے جاگتے، چلتے پھرتے باشندے بھی نظر آتے ہیں۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں، ان میں مصنف کے طرز تحریر کا ذاتی تغیر بھی نمایاں ہے:

یہ ۱۹۵۴ء کے موسم خزاں کی ایک ویران رات تھی۔ لاری اسٹینڈ سنسان پڑا تھا۔ دکانیں بند تھیں۔ روشنیاں بجھ چکی تھیں۔ دونوں اندھیرے میں دم بخود کھڑے تھے۔ ڈرائیور ہوٹل کے سامنے لکڑی کی بنچ پر کوئی چادر اوڑھے لیٹا تھا۔ قریب ہی ایک آوارہ کتا ہڈی چبا رہا تھا۔ (جلد اول، ص ۷)

گندم اور جو کی بالیاں جھومنے لگتیں۔ کھیتوں میں دور تک لہریں اُبھرتی اور ڈوبتی نظر آتیں۔ ہوا کی سرسراہٹ سے فصلوں میں سیٹیاں بجتیں۔ ...... پھر ان آوازوں میں ایک نئی آواز اُبھری۔ یہ گیدڑوں کا بے ہنگم شور تھا۔ (جلد اول، ص ۱۱)

اس نے دیکھا ان میں ایک مرد تھا اور دوسری عورت تھی۔ مرد آگے آگے چل رہا تھا۔ اس کے سر پر بڑی سی گٹھڑی تھی۔ عورت کی گود میں بچہ تھا۔ وہ سکنالہ کی گزرگاہ پر چل رہے تھے۔ زمین ریتلی اور ناہموار تھی۔ دونوں طرف اونچے نیچے ٹیلے اور ٹبے تھے۔ کہیں کہیں کیکر اور بیری کے درخت تھے۔ جنگلی جھاڑیوں کے جھنڈ تھے۔ (جلد اول، ص ۲۰)

دروازے کے سامنے صحن تھا۔ ایک طرف شیشم کا پیڑ تھا۔ اس کے نیچے بتل تھا۔ جس میں ایک بھینس بندھی تھی۔ صحن سے ملا ہوا دالان تھا۔ اس پر پھونس کی چھت تھی۔ دالان کے عقب میں دروازہ تھا۔ اس کا ایک پٹ ذرا کھلا تھا۔ روشنی چھن چھن کر باہر آرہی تھی۔ (جلد اول، ص ۳۵)

سامنے دور تک پھیلا سبزہ زار تھا۔ سبزہ زار کے ارد گرد ٹاہلی، شریہنہ اور سرس

کے گھنے درختوں کے جھنڈ تھے۔ (جلد اول، ص ۱۳۷)

کھال کے ایک طرف گندم اور جو کے کھیت لہلہاتے تھے۔ (جلد اول، ص ۳۵۱)

قریب ہی ملہا تھا۔ یہ خاردار جھاڑی تھی۔ اس میں چھوٹے کوکن بیر لگے تھے۔ (جلد اول، ص ۴۰۳)

آگ پر لوہے کا لہانڈا رکھا تھا...... آڈ سے کھیت میں پانی جانے کا ناکا تھا..... سامنے جوہ تھا۔ جس میں جنڈ، ٹاہلی اور بیری کے پیڑ تھے۔ (جلد اول، ص ۴۰۵)

"احمد کوٹ سے آگے بیلا ہے۔ اس کے چھتروں میں بابر والے بہت ہیں"۔
"تیرا مطلب ہے جنگلی سوّر"۔ (جلد اول، ص ۴۵۰)

جھل سائیں سائیں کر رہا تھا۔ رکڑ ویران تھا۔ اونچے نیچے ٹیلے اور ٹبے دم بخود تھے۔ (جلد اول، ص ۴۵۹)

ربیع کی فصلیں تیار کھڑی تھیں۔ اپریل کا سورج جنڈ کے ایک گھنے درخت کے پیچھے سے آہستہ آہستہ اُبھر رہا تھا۔ دھوپ ہر طرف پھیلتی جا رہی تھی۔ گندم اور جو کے اونچے اونچے پودے دھوپ سے سنہری پڑتے جا رہے تھے۔ (جلد اول، ص ۵۱۷)

جگہ جگہ کٹی ہوئی فصل کے ترنڈے اُبھرے ہوئے تھے۔ گندم کے خوشے اور سِلے بکھرے تھے۔ (جلد اول، ص ۵۱۷)

....................O....................

پاکستانی ثقافت کا حوالہ اس کے مقامات، اشیاء، جانوروں، پودوں، لباسوں کے

ناموں، افراد اور کرداروں کے تسمیہ اور ذات برادریوں/خاندانوں کے ناموں سے بھی ملتا ہے۔ جانگلوس میں لاہور، کراچی، پشاور، کوئٹہ، ملتان، لائل پور، حیدر آباد جیسے بڑے پاکستانی شہروں کے ساتھ ساتھ، مشرقی پنجاب کے شہروں: امرتسر، پٹیالہ، کھیم کرن، نصیر پور، گورداس پور، جالندھر، فیروز پور، پنجاب کے شہروں اور قصبوں: منٹگمری (ساہیوال)، عارف والہ، پاک پتن، یوسف والہ، قادر آباد، گیمبر، نور شاہ، کمیر، گوگیرہ، عالم شاہ، دیپالپور، اوکاڑہ، گوڑے شاہ، پیلی پہاڑ، جہانگیرہ، بہاولنگر، کبیر والہ، چیچہ وطنی، وہاڑی، خانیوال، کمالیہ، جھنگ، سمندری، مرید والہ، سنڈیانوالہ، جڑانوالہ، تاندلیانوالہ، کھرڑیانوالہ، وار برٹن، سید والہ، چک جھمرہ، چنیوٹ، سرگودھا، لیہ، مظفر گڑھ، کوٹ ادو، شیر شاہ، ڈیرہ غازی خان، لودھراں، راجن پور، جام پور، چوٹی بالا، چوٹی زیریں، غازی گھاٹ، اوچ شریف، جلالپور، روجھان، صادق آباد، رحیم یار خان اور دوسری طرف قصور، رائے ونڈ، جہلم، گوجرانوالہ، سیالکوٹ، شیخوپورہ، راولپنڈی، کیمبلپور، کندیاں، خوشاب، شاہ پور، تھل، میانوالی، کالا باغ، بھکر، دریا خاں، سرحد میں: چترال، دیر، چکدرہ، بلزئی، سندھ میں: نواب شاہ، شکارپور، میرپور خاص، غلام محمد بیراج، جتوئی کلاں، بلوچستان میں: کوئٹہ، فورٹ سنڈیمن، قلات، جیسے شہروں، قصبوں میں ناول کے کردار چلتے پھرتے اور باتیں کرتے نظر آتے ہیں۔

علاوہ ازیں پاکستان کے دریا: سندھ، جہلم، چناب، راوی، بیاس، ستلج اور ان کے دوآبے اور بار: نیلی بار، گنجی بار، بیاس بار، راوی بار، نہریں: لوئر باری دوآب نیز کینجھر جھیل، ان کے پتن اور بیڑیاں دکھائی دیتے ہیں۔

کرداروں کے تسمیہ میں مقامی ثقافت اور انداز کی جھلک نظر آتی ہے۔ لالی، رحیم داد، شاداں، تاجاں، بھاتاں، جنت، بھاگ بھری، سلطڑی، میداں، سگراں، شدو، نوری، نوراں، بالا، قادو، ماجھا، اللہ وسایا، اللہ داد، مولاداد، میر داد، خداداد، جھورا، بختاور، بشیرا،

پیر بخش، اللہ دتہ، عیدو، ملیّ، ہیما، نواز گل، زمان خاں، یا پھر ذاتوں کے ساتھ نام جیسے چانڈیو، دریشک، شابانی، مانیکا وغیرہ۔

چاروں صوبوں میں ماچھی، مصلیٰ، تیلی، نائی، موچی، درزی، جتوال وغیرہ پیشوں/قوموں کے ساتھ ساتھ خاندان اور ذاتوں کے نام اور ان کے کردار بھی قابل توجہ ہیں۔ سید، قریشی، چشتی، شیخ، چودھری، ملک، ارائیں، کراڑ، لنگاہ، مانیکا، کالوکا، تیجے کا، ٹھاکر کا، لالیکا، وٹو، چوہان، سیال، ڈوگر، جوئیے، ٹوانے، مہر، راٹھور، جنجوعے، مخدوم، لنگڑیال، بزدار، اتمان زئی، سرگانی، مصدانی، شابانی، خاکوانی، نوانی، رستمانی، بلچانی، کھوکھر، باہنی وال، فتیانے، کھرل، ہرل، لکھیرے، اہیرے، ڈھانڈلے، دولتانے، سلدیرے، گردیزی، گیلانی، دریشک، تمن دار، مزاری، لغاری، کھوسے، کُنڈ، کھتران، بگٹی، اعوان، گورمانی، جسکانی، زرداری، قیصرانی، لاشاری، چانڈیو وغیرہ۔

مقامی اشیا کے نام جیسے ڈنگر، مج، کٹی، کٹا، ڈھگی، مدھانی، ریڑکا، چاٹی، لسی، گھڑونجی، ڈھولی، ڈوڈھا، ٹوپا، ساوی، منجی، کنک، کنٹرک، بھٹی، کریل، جال، لانا، جری، ٹاہلی، جنڈ، ملھا، شرینھ، پیلو، بکائن، مارھی، ڈھاٹا، کھیس، دھوتی، جھگی، لاچا، ہمسانی، ٹوبھا، بڈھ، منھا، آڈ، ڈل، چوبچا، جھل، جھنگر، ابر، رڑ، نکڑ، ڈھارا، وستی، پنڈ، جھوک، موضع، وٹ بندی، جیسے بہت سے الفاظ پورے کینوس پر بکھرے پڑے ہیں۔

..................O..................

مقامی الفاظ کا ذخیرہ جملوں میں اس کے سیاق و سباق کے ساتھ مختلف مکالموں میں دیکھا جائے تو پاکستانی زبان کا تنوع زیادہ واضح کرتا ہے۔ پنجابی، سرائیکی، سندھی کے علاوہ کسی حد تک بلوچی اور پشتو کے الفاظ سامنے آتے ہیں۔

پنجابی کے مختلف انگ ملاحظہ ہوں:۔

"لما رستہ ہے۔ اگے نہر ہے"۔ (جلد اول، ص ۱۴)، "ایک چھوہری ہے۔ دو پت ہیں۔ چھوہری مجھ سے بہت لاڈ کرتی ہے"۔ (جلد اول، ص ۳۲)، "سخت بھکھ لگی ہے"۔ (جلد اول، ۴۵)، "روٹی ٹکر لے آؤں" (جلد اول، ص ۴۷)، "مسکری نہ کر" (جلد اول، ص ۵۰)، "میں ملک کی گھر والی ہوں" (جلد اول، ص ۵۳)، "دھی کے ویاہ کے لیے" (جلد اول، ص ۶۴)، "مجھے تو جھوک آ رہی ہے، میں تو اب سوتا ہوں" (جلد اول، ص ۷۲)، "چھیتی نال ٹر جا یہاں سے" (جلد اول، ص ۸۴)، "مگر اس طرف لاگھا تھا" (جلد اول، ص ۸۵)، "ابھی یہ کھانگڑ تو نہیں ہوئی" (جلد اول، ص ۹۵)، "فصلوں کی واڈھی میں ابھی کتنی دیر ہے؟" (جلد اول، ص ۱۵۳)، "لیکن یہ بھی ہو سکتا ہے کہ پروگرام لما ہو جائے" (جلد اول، ص ۱۶۴)، "ایں ویں ای گلے پڑا جا رہا ہے" (جلد اول، ص ۲۹۱)، "وہ اسے لارے لپے دیتا" (جلد اول، ص ۳۶۰)۔ "اپنے ڈیل ڈول کے اعتبار سے برچھا لگتا تھا" (جلد اول، ص ۳۷۱)، "الٹی کرے گا؟" (جلد اول، ص ۴۱۶)، "مرونڈے ہیں۔ ابھی تو اسی سے کام چلا لے" (جلد اول، ص ۵۴۰)، "بنیرے پر دھوپ پہنچ گئی اور تو پڑا سوتا رہا" (جلد اول، ص ۵۳۱)، "تیرا مطلب چابلیا کرنے سے ہے" (جلد دوم ۳۲۱)، "میانداد سے ادھاپی پر زمین لی ...... ادھار لے کر بل پنجالی خریدی" (جلد اول، ص ۵۴۰)، "وڈا ٹبر نہیں، ارام نال گزر بسر ہو رہی ہے۔ کامل کی ایک ہی بھین ہے" (جلد دوم، ص ۲۲۷)، "میں اس کا کون سا شریکا لگتا ہوں" (جلد دوم، ص ۳۱۰)، "ایک رات اچانک ڈھا آیا۔ میری ساری فصل رڑھ چھل میں بہہ گئی"۔ (جلد دوم، ص ۵۵۲)، رحیم داد لوئی اوڑھے ہوئے تھا۔ اس کے نیچے گرم کوٹ بھی تھا (جلد دوم، ص ۷۵۸)، "تیرا حکم ملتے ہی میں نے واڈھی شروع کرا دی تھی۔ اب تو گاہنے کے لیے پڑ میں بھی پہنچنے لگی ہے"۔ (جلد سوم، ص ۶۱)، "یہ سمجھاوا تو بیٹی کو بیچنے کا سیدھا سیدھا بیوپار

ہے...... ایویں ہی ریت بنار کھی ہے"۔ (جلد سوم، ص ۷۵)، "یاد تھا ہے تو نے نیا موگھا کھولنے کی گل کی تھی" (جلد سوم، ص ۸۶)، چند لمحے تو اس نے تکلف برتا، پھر برڑ برڑ روٹی کے لقمے کھانے لگا۔ (جلد سوم، ص ۵۴۰)۔

جٹکی، سرائیکی اور سندھی لہجہ ملاحظہ ہو:

"گھر والی کے بغیر بالکل تباہ ہو گیا۔ وہ تو میرا بازو ہے" (جلد اول، ص ۳۵۷)، "وہ تو کئی مہینے اوٹھ چلانے والا جتوال بھی رہ چکا ہے" (جلد اول، ص ۳۷۹)، "سئیں صدا جیویں، سکھی صحت ہووے" (جلد دوم، ص ۴۹۸)، "بختاور ہووے۔ بھا گیں بھریا ہووے" (جلد دوم، ص ۵۰۲)، "سئیں میری زاری سن لے۔ اسے بچا لے۔ رب راضی ہووے۔ تیرا لال جیووے۔ میرے نکے کوُ چھڑا لے" (جلد دوم، ص ۵۰۵)، "سئیں میکوں اب جانا ہے۔ میری نلی چھوڑ دے۔ میں اب نہیں رک سکتی" (جلد دوم، ص ۵۳۱)، "تو نے سونے کی مالھان تو نہیں دیکھی" (جلد دوم، ص ۵۳۳)، "با سئیں یہ عجب ہی گالھ ہے" (جلد دوم، ص ۵۳۵)، "سئیں۔ سچی گالھ یہ ہے کہ وہ ملوک زادی ہے" (جلد دوم، ص ۵۴۴)، "میرا سکا ملویر وہاں مزدوری کرتا ہے" (جلد دوم، ص ۵۵۴)، "جوڑے بوچھن بالکل ہٹا دے" (جلد دوم، ص ۵۵۵)، "میں بہت موجھی ماندی اور پریشان ہوں" (جلد دوم، ص ۶۰۸)، "صبح کی ٹرین سے اچانک مراد خاں کی بیوی کا پچھلگ یا اگوایا محمد سلمان خان آ گیا۔ (جلد دوم، ص ۶۲۴)، "اس کی چاچی میری چھنیل ہے۔ میں نے اسے طلاق دی اور" (جلد سوم، ص ۲۰۸)۔

جہاں سرائیکی اور ملتانی لہجے کا منظر نامہ سامنے ہے، وہیں پختون حوالہ بھی قابل ذکر ہو گا۔ اس کے کئی نمونے آگے چل کر بھی پیش کیے گئے ہیں:۔

"یارا تم کو کیا پتہ کتنا ظلم ہوتا ہے" (جلد سوم، ص ۶۷۴)

"امارا توکل ویسے ہی ادھر کا ڈیوٹی ہے" (جلد سوم، ص ۶۷۸)

...............O.............

مقامی الفاظ مقامی ثقافت کے حوالے سے بھی سامنے آتے ہیں۔ ماحول، گیت، رسوم، رواج، لباس، کھانے، اطوار و اندازِ زندگی بھی زبان کے تغیرات کا سبب بنتے ہیں مثالیں ملاحظہ ہوں:

"پڑ میں گاہی ہوئی کنک پڑی ہے۔ دھڑ کو پچھوڑے اور بھٹکنے کے لیے مصلی نہیں مل رہے" (جلد دوم، ص ۳۷)

"ادھیارے پر نوکٹہ زمین لے لی تھی۔ اس طرح میں پاہی بن گیا۔ ادھیارے کی پہلی فصل خریف کی تھی....... بھٹی کی چنائی..... کے لیے چوگیوں سے بات بھی کرلی تھی ...... میری واڈھو فصل کو آگ لگا دی" (جلد اول، ص ۳۶۳)

.... کہ بیل گاڑی میں لاوے سوار ہیں۔ وہ اجرت پر فصل کی کٹائی کرنے والے مزدور تھے (جلد اول، ص ۵۱۵)

وہ مزارع تھے اور مانگی پر فصل کاٹنے آئے تھے .... واڈھی سے پہلے حسب دستور اس نے مانگی کے لیے سیپی کمیوں کے ذریعے گاؤں والوں کو پیغام بھیجا تھا (جلد اول، ص ۵۱۸)

"بٹائی کے لیے اپنے ونڈا وے لے کر آیا۔ مجھے کم راہکی دی" (جلد اول، ص ۵۴۱)

"وہ کٹے ہوئے پودوں کے پولے باندھ باندھ کر ڈھیر لگاتی جا رہی تھی" (جلد

اول، ص ۵۱۹)

"یہ گھر کا اگواڑہ ہے ساتھ ہی میں ڈیرا ہے۔ بیٹھک بھی اسی طرف ہے" (جلد اول، ص ۸۷)

"مجھے گھوڑی کی سواری پسند ہے........ ادھر ڈیرے پر کمی اور کئی نوکر چاکر موجود ہیں" (جلد اول، ص ۹۰)

"میں جی چاک ہوں........... زمیں دار کے چوکھر اور مویشی چَراتا ہوں" (جلد اول، ص ۳۵۳)

نہادھو کرڈبل گھوڑا بوسکی کی نئی قمیص اور شلوار پہنی (جلد دوم، ص ۴۶۴)

پانچ روپے لاگی کے دیے (جلد دوم، ص ۱۳۲)

"وہ میری انگ ہوتی ہے۔ اس کے ویاہ پر تو میں نہ جا سکا۔ بخار میں پڑا تھا۔ اب اس کے یہاں پُتر ہوا ہے۔ اس کی جھنڈ لہائی کے لیے اس نے مجھے بلوایا" (جلد اول، ص ۵۳۲)

کوڑا وٹا یا کڑوی روٹی مزارع لائے تھے (جلد دوم، ص ۲۷۹)

"یہ غریب کمی ہیں.......... شام کو میل لگا کر ساوی سے شغل کرتے ہیں" (جلد دوم، ص ۴۹۳)

"میرا پیر خریف کی واڈھی کے بعد آئے گا......... اپنے خاص خاص مریدوں کے پاس چند روز کے لیے ٹھہرتا ہے" (جلد دوم، ص ۴۹۵)

"اسے تو جی جن تھیون ہے۔ آسیب بتاتے ہیں" (جلد دوم، ص ۵۴۷)

"ان (جالندھری پٹھانوں) کے بارے میں تو مشہور ہے کہ اراضی کیسی بھی ہو، کہیں بھی ملے، ہرگز نہیں چھوڑتے" (جلد دوم، ص ۷۵)،

"جانگلی نہ صرف لوٹ مار کے لیے خون کرتا ہے بلکہ پیسے لے کر دوسروں کے لیے بھی کتل کرتا ہے" (جلد دوم، ص ۲۱۶)

"ملتانیوں میں رن کھلا مشہور ہے۔ مطلب یہ کہ جیسے گھوڑوں کے لیے گھاس ضروری ہے، ویسے ہی زال یا گھر والی کے لیے جتی سے پٹائی" (جلد دوم، ص ۱۹۴)

"ایک بار جب کوئی کسی کی پناہ میں آجاتا ہے یا باہوٹ بن جاتا ہے تو پناہ دینے والا اس کا میار دار بن جاتا ہے..... یہ بلوچوں کا بہت پرانا دستور ہے" (جلد سوم، ص ۱۵۸)

"یہ ان کی آن اور مڑاواری کا سوال ہے۔ (لغاریوں کی)" (جلد سوم، ص ۱۹۰)

"اوطاق (سندھی بیٹھک) میں لے جا کر خود نیچے زمین پر بیٹھا اور ان کو چارپائی پر بٹھایا" (جلد سوم، ص ۵۷۱)

"لکڑی کی ایک چوکی پر رحل لا کر رکھی گئی۔ اس پر ریشمی جزدان میں بند قرآن مجید رکھا گیا۔ سارے مہمان چوکی کے گرد نیم دائرے میں بیٹھ گئے" (جلد سوم، ص ۵۷۴)

"چاکر تجھے پتہ ہونا چاہیے۔ کالے اور کالی کو رات کے اندھیرے میں ہی دفن کیا جاتا ہے" (جلد سوم، ص ۲۷۹)

"تم اپنے بیمار بچے کے پاس ضرور جائے گا...... ام تارا مدد کرے گا" (جلد سوم، ص ۶۷۹)

ثقافتی منظر نامہ اشیا، طعام اور کھانے پینے کے انداز، لباس، زیورات اور رسوم و رواج کی روشنی میں ملاحظہ کیا جاسکتا ہے:

"ٹیلے پر پیلو کے درختوں کے ایک جھنڈ کے نیچے مصلیوں اور کٹانوں کا جمگھٹا تھا۔ جھوم جھوم کر بھنگ گھونٹی جارہی تھی۔ مٹی کے کوزوں اور المونیم کے گلاسوں میں بھر بھر کر پی جارہی تھی......... ہیجڑے ناچ رہے تھے۔ جھمر کا مقبول گیت گا رہے تھے" (جلد دوم، ص ۴۹۲)

"سونے سے پہلے چاسے اپنی مج کا کوسا پلاتی تھی" (جلد اول، ۱۴۳)

"کوسا کیا بہار دکھاتا ہے" (جلد اول، ص ۱۴۴)

بختاور پڑچھتی کے نیچے چبوترے پر ٹانگیں پسارے بیٹھی تھی اور چاٹی میں مدھانی ڈالے اطمینان سے دودھ بلو رہی تھی (جلد اول، ص ۲۶۱)

وہ بلوچی ساخت کی قمیص پشک پہنے ہوئے تھے۔ پشک کا رنگ گلابی تھا اور اُس کے جیک پر ہفت رنگی ریشمی دھاگوں سے کشیدہ کاری کی گئی تھی......... کلائیوں پر چاندی کے منقش تملل بندھے تھے۔ کانوں میں سونے کے دُر تھے۔ سر کے بالوں پر جگمگاتی کید تھی......... ناک میں جھلملاتا پلوہ جھول رہا تھا (جلد سوم، ص ۲۴۴)

"(بلوچی میں) روچ موجیر کا مطلب ہے، سورج سے بھی پردہ کرنے والی رن" (جلد سوم، ص ۱۵۷)

میراثنوں نے رخصتی کا گیت گایا.... لے چلنے بابلا لے چلنے (جلد سوم، ص ۱۸)

دولہا کے بیٹھتے ہی حویلی کے نائی نے اس کے مونہہ میں مصری کی ڈلی ڈالی اور دودھ پلایا۔ یہ پُش کارہ تھا (جلد سوم، ص ۱۴)

کڑاہیاں رکھی تھی۔ دیگچوں میں گھنگھیناں اُبل رہی تھیں۔ کڑاہیوں میں گلگلے تلے جا رہے تھے (جلد دوم، ص ۷۱۴)

بیوہ کا سایہ مائیوں بیٹھنے والی لڑکی پر پڑنا نحوست اور بدشگونی سمجھا جاتا ہے (جلد دوم، ۷۱۴)

یہ تیل چڑھانے کی رسم تھی .... میراثنوں میں سے ایک نے ڈھولک پر تھاپ دی اور اونچی آواز سے یہ گیت چھیڑا۔ میری میدڑھی نہ کھولو (جلد دوم، ص ۷۱۳)

تھوڑی دیر بعد وہ دونوں ہاتھوں سے بھڑولی اُٹھائے ہوئے آئی، یہ پیالے کی شکل کی کھلے مونہہ اور چوڑے پیندے کی انگیٹھی تھی .... بھڑولی کے اوپر پیتل کی گڑوی میں دودھ بھرا تھا (جلد دوم، ص ۶۵۱)

"یہ لاہن سے بنتی ہے۔ اسے بنانے کے لیے بیری، پیپل، بوہڑ کے درختوں کی چھال مٹی کے کورے گھڑوں میں ڈال کر کچی زمین کھود کے دبا دی جاتی ہے" (جلد دوم، ص ۵۷۵)

(انگور کے لیے) "موتی، سچے موتی"، (انار کے لیے) "کابل تے کندھار"، (گنڈیری کے لیے) "بکھن پیرڑے کھا" جیسے الفاظ عام طور پر ملتے ہیں ان کے علاوہ ایسے

مزید نام ملاحظہ ہوں:

مراد خان نے روانگی سے قبل دودھ اور گھی میں گندھی ہوئی میدے کی پانچ بڑی بڑی میٹھی گوگیاں تیار کرائیں (جلد دوم، ص ۴۹۰)

"فکر کی کوئی گل نہیں۔ پاتھی کی گرم گرم راکھ چوٹ پر باندھ دے۔ دو تین دن میں چنگا ہو جائے گا۔ ویسے نیم کے پتے کچل کر باندھنے سے بھی آرام آجائے گا" (جلد دوم، ص ۱۳)

"یہاں سے ڈیڑھ میل آگے کلراہٹی ہے" (جلد اول، ص ۳۵۴)

"لانا کے بوٹے سے سجی بنتی ہے اور سجی سے کپڑے لتے دھو کر صاف کیے جاتے ہیں" (جلد اول، ص ۳۵۵)

"اندر جاؤ، وٹنا ملو، نہاؤ، خوشبو لگاؤ، ریشمی پٹانگل پہنو، سرخ جھمی اوڑھو، سنگھار کرو، سویرے سویرے سامنے ایسے نہ آنا، وہٹی بن کے آنا، میں تمہارا گھونگھٹ اٹھاؤں گا۔ گھنڈ چکائی دوں گا" (جلد اول، ص ۱۰۶)

گلوں میں چاندی، گلٹ کے کٹمالے اور مالحان تھے۔ ناک میں فیروزہ جڑے توے اور پوپے جھل ملا رہے تھے۔ (جلد دوم، ص ۶۰۲)

.... O ....

مقامی لہجہ کرداروں کے انداز زندگی کے حوالے سے جملوں کی ایک خاص ساخت تخلیق کرتا ہے۔ اس سے ان کے اطوار، سطح اور بول چال کے سانچے اور سلینگ

نظر آتے ہیں۔ ایسی بولی ٹھولی کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

"ہائے ربا میں مر گئی" (جلد اول، ص ۴۴)، "اب اٹھ جا بہت کر چکی پٹنی۔ اُٹھتی ہے کہ نہیں" (جلد اول، ص ۴۴)، "مج کو پھٹا وٹھا دے" (جلد اول، ص ۴۵)، "شاداں خطرناک زنانی ہے" (جلد اول، ص ۶۳)، "میری بوری دھرلی ہے۔ نیلی بار کی مج ہے۔ بھاڑو ہے۔ کٹے کے بغیر صرف چارے پر صبح شام پکا اٹھاراں سیر دودھ دیتی ہے........ ملک کی حویلی پر دودھی آتا ہے۔ روز کے روز دام چکا کر دودھ لے جاتا ہے .... اور سن! ساڑی کی فصل پر پھٹی کی چنائی بھی کرتی ہوں۔ اچھی خاص چوگ مل جاتی ہے" (جلد اول، ص ۷۷)۔ "اوئے تنگ نہ کر" (جلد اول، ص ۷)، "اڑیل کھوتی نہ بن، مرداں والی چال چل" (جلد اول، ص ۸)، "مخول نہ کر۔ ٹھیک ٹھیک گل کر (جلد اول، ص ۹)، "توں نے فیر ٹیڑھی گل بات کی" (جلد اول، ص ۱۳)، "اتنا وکھت خراب کیا" (جلد اول، ص ۱۴)، "میرے پچھے پچھے چلا آ" (جلد اول، ص ۱۶)، "یہ پولیسئے ادھر کیسے آ گئے" (جلد اول، ص ۱۰)، "اونچا کاریگر لگتا ہے" (جلد اول، ص ۱۳)، "پرچہ چاک کرانا ہے" (جلد اول، ص ۱۳)، کوئی بندہ جان پڑتا ہے۔ ہوگا کوئی۔ تو سدھی سدھی چل" (جلد اول، ص ۱۹)، "تو کیسا گھبرو ہے؟" (جلد اول، ص ۳۷)، "لمبردار کی حویلی میں کام کرتی تھی"، "اوئے چھبڑ" (جلد اول، ص ۵۸)، "کچھ اونچا چکر ہے" (جلد اول، ص ۵۹)، "ادھر اپنی ہی عمل داری ہے۔ لور تک کی میں گارنٹی لیتا ہوں" (جلد اول، ۵۹)، "جی چاہے تو لگ جا لین میں" (جلد اول، ص ۶۰)، "شر فے۔ یہ اپنا جگر ہے" (جلد اول، ص ۶۱)، "گالاں نہ نکال" (جلد اول، ص ۷۷)، "پانی ہو تو پلا دے۔ مجھے تو جیسے بھڑکی لگ گئی ہے" (جلد اول، ص ۵۳)، "میں صدقے تھیواں" (جلد دوم، ص ۵۷۴)، "جند جانی، آج تو بھری ہوئی بندوک لگ رہی ہے" (جلد دوم، ص ۵۷۷)، "کسی نے جی بھانجی مار دی" "یہ شیرا کون ہے اور اس نے کیوں بھانجی ماری"؟، "وہ تاجاں سے ویاہ کرنا چاہتا

ہے" (جلد دوم، ص ۶۴۲)، "بالیں بچے- ڈیڈھی پردے سب خیر اے- بال جان، مال ڈنگی، سب خیر اے"؟ (جلد سوم، ص ۶۱)، "فی امان اللہ- بالیں بچیں یاریں دوستیں سب کو خیر سلا ڈیوا ہے" (جلد سوم، ص ۸۰)، "اوئے خانہ خراب تو ادھر کیسے آ گیا"؟ (جلد سوم، ص ۵۰۱)، "...... کی چاٹی بنا کر اس میں مدھانی ڈالیں گے اور ایسا ریڑکا لگائیں گے کہ تیری ساری زمیں داری لسی بن کر نکل جائے گی" (جلد اول، ص ۵۰۴)، "سردی ادھر کہاں پڑتا ہے- سردی تو دیر میں پڑتا ہے- آج کل تو وہاں برف گرتا ہے" (جلد سوم، ص ۶۷۳)، "ان دنوں امارا باپ زندہ تھا" (جلد سوم، ص ۶۷۳)، "باپ کے مرنے کے بعد ام بلزئی سے دیروایس آ گیا" (جلد سوم، ص ۶۷۴)، "رات کو ڈیوٹی دو- دن میں بھی کام کرو اور پگار بہت کم .... سمجھ میں نہیں آتا کہاں سے ان کو خرچہ مرچہ بھیجا جائے" (جلد سوم، ص ۶۷۷)، "نہیں- یہ روپی ام نہیں لے گا- ام نے ایک بار تم کو بول دیا- اپنا روپی اپنے پاس رکھو" (جلد سوم، ص ۶۸۰)، "وے لالی حرام دے- تیرا بیڑا ڈُبے...... خانہ خراب تو بہکا کر ہمیں وہاں سے لے آیا اور یہاں پاغل خانے میں ڈلوا دیا- وے تیرا اکھ نہ رہے- تو مر جائے" (جلد سوم، ص ۷۴۲)

...............O...............

مصنف نے مقامی تلفظ خاص طور پر ق، ک کے فرق کو واضح بلکہ املا کیا ہے جس کی شاید اب ضرورت نہیں رہی- جیسے باکی، کیدی، بندوک، کتل، مکتول، بکھار، بکھش، وغیرہ- اسی طرح غ اور گ کے ادل بدل کو بھی املا کیا ہے جیسے گریب، مگز وغیرہ- اس کی مثالیں ملاحظہ ہوں:

"بیڑا ہی گرک ہو جاتا" (جلد اول، ص ۱۰)، "اپنا مگز خراب نہ کر" (جلد اول، ص ۱۴)، "زیادہ بکھرا اچھا نہیں ہوتا" (جلد اول، ص ۲۹)، "رات کا وکھت تھا- یاد پڑتا ہے"

(جلد اول، ص ۸٦)، "کل صبح میں تمہارا کھسم بن جاؤں گا" (جلد اول، ص ۱۰۳)، "خاماخا کیوں وکھت برباد کر رہا ہے" (جلد اول، ص ۱۵۹)، "تگیر اور زمینداری تو جی وہ چھوڑے گا نہیں یہ بالکل پکی گل ہے" (جلد اول، ص ۲۱۱)

.....................O ....

پاکستانی اردو کی زیادہ تر مثالیں کرداروں کے ایسے مکالمات میں ہیں، جن میں مقامی کردار اس لہجے میں اردو بولتے ہیں، جیسا کہ ناول نگار چاہتا ہے یا سمجھتا ہے کہ وہ اسے بولیں۔ یعنی یہ ضروری نہیں کہ ایک پنجابی، سرائیکی یا سندھی کردار ایسی ہی اردو بولے جیسی اس ناول میں دی گئی ہے لیکن اردو مصنف کے نزدیک شاید وہ اسی طرح بولے گا۔ گویا پاکستانی اردو کے مکالمات کا یہ ایک اور پہلو ہے جو ناول نگار کے اپنے سماجی لسانی تناظر سے اُبھرتا ہے۔ بصورت دیگر مقامی کرداروں کے لہجے اور مکالمات کی مثالیں سابقہ صفحات میں ہماری نظر سے گزر چکی ہیں۔ "میں نے اوتھے جانا ہے" یا "تو نے پتہ ہے"؟ قسم کی اردو ان پڑھ جانگلی کردار قطعاً نہیں بولے گا۔ مثالیں ملاحظہ ہوں:

"تیں نوں اب کتھے جانا ہے" (جلد اول، ص ۱۳)، "مینوں ابھی بہت دور جانا ہے" (جلد اول، ص ۱۳)، "ایہہ گل ہے تو فیر باتھ ملا" (جلد اول، ص ۱۴)، "میں نوں کجھ نہیں لینا" (جلد اول، ص ۲۸)، "میں نے کجھ نہیں کھانا" (جلد اول، ص ۲۹)، "نصیب کو چھوڑ۔ عکل سے کام لے" (جلد اول، ص ۴۲)، "تو نے پتہ ہے"؟، "پوری گل تو سن، زیادہ جیبیتی نہ کر" (جلد اول، ص ۱۲٦)، "میں نوں کی پتہ۔ اسے نوں پچھ" (جلد اول، ص ۴۰۷)۔

.....................O ....

پاکستانی اردو کے نمونے کے سلسلے میں ہمارا دعویٰ جہاں تک پہنچا ہے وہ یہ ہے

کہ شوکت صدیقی کا یہ ناول نہ صرف ۱۹۷۰ء سے پہلے کے پاکستانی ماحول کی عکاسی کرتا ہے اور اس دور کی مقامی بولی آمیز اردو کو پیش کرتا ہے۔ اس کے کردار پورے پاکستان میں چلتے پھرتے ہیں، ان کے سلینگ اور لہجے کے مطابق اردو مکالمے پیش ہوتے ہیں، ان کی ثقافت اور رہن سہن کو بھی پیش کیا گیا ہے بلکہ یہ بھی ہے کہ خود "خدا کی بستی" کے مصنف کی زبان بھی بدل گئی ہے اور "جانگلوس" تک آتے آتے اس کے الفاظ، روزمرے، محاورے، ترکیبیں، جملے اور لہجے بھی بدل گئے ہیں۔ یہ بات ہمارے دعوے (Thesis) کو پایۂ تکمیل تک پہنچاتی ہے کہ ان پچاس برس میں اردو ادیبوں کا چلن بھی بدلا ہے اور وہ مقامی آمیزی، انگریزی آمیزی، زبان کی شکست و ریخت، نو تشکیل، نولفظیت اور نو ترکیب کی راہوں سے گزر کر پاکستانی اردو کی منزل تک آن پہنچے ہیں۔ "جانگلوس" اس حوالے سے سقوط مشرقی پاکستان سے پہلے کی پاکستانی اردو کا نمونہ ہے، جس میں خود مصنف کا طرز تحریر بھی بدلا ہے۔ یہ ذاتی تغیر پاکستانیت کے موضوع پر ان کی تحریر اور پاکستانی لینڈ سکیپ/منظر کشی میں بھی ملاحظہ کیا جا سکتا ہے، چند مزید مثالیں ملاحظہ ہوں۔ خاص طور پر خط کشیدہ حصے:

حجامت بڑھی ہوئی تھی (جلد اول، ص ۷)

ننگے پیر تھے (جلد اول، ص ۹)

"اس قدر نرم اور پولی کہ پیر اندر دھنستے تھے" (جلد اول، ص ۲۰)

بیل داروں نے راجباہ شرقی میں نیا موگھا کھول دیا۔ موگھے کا پانی نالیوں میں دوڑنے لگا۔ زمین نرم اور پولی ہو گئی (جلد اول، ص ۸۹)

سورج ماڑی کی اونچی ممٹی کے عقب میں ڈوب رہا تھا (جلد سوم، ۱۱۰)

وہ گہری نیلی دھوتی باندھے ہوئے تھی اور ملگجی کھیس اوڑھے سکڑی سکڑاتی حسرت کا مرقع اور عبرت کی تصویر بنی بیٹھی تھی (جلد دوم، ص ۶۶۳)

وہ نیلی دھوتی باندھے ہوئی تھی۔ جھگا موٹی سفید ململ کا تھا۔ دوپٹہ ہلکا بسنتی تھا۔ وہ پھول دار کھیس اوڑھے ہوئے تھی (جلد سوم، ص ۱۱۷)

ایک ستون کے سہارے پھوہڑی پر نڈھال بیٹھی تھی (جلد دوم، ص ۲۸۰)

اکا دکا ستھر بھی تھے۔ یہ کٹی ہوئی فصل کے پولے تھے۔ .... کھیتوں کے درمیان جگہ جگہ پڑے تھے ...... یہ خشک پولے تھے اور سانڈھنے کے لیے ان پر گید اور بیری کی سبز شاخوں کے پھلے چل رہے تھے (جلد سوم، ص ۶۲)

چنائی شروع ہوئے کچھ عرصہ گزر چکا تھا مگر ہر چوگی نے اچھی مقدار میں پھٹی چنی تھی۔ قاعدے کے مطابق چنائی کے ابتدائی دنوں میں ہر چوگی کو اس کی چنی ہوئی پھٹی یا ونواڑ کا سولھواں حصہ دیا جاتا ہے۔ بعد میں گزرتے دنوں کے ساتھ کپاس کے کھیتوں میں جوں جوں ونواڑ کم ہوتی جاتی ہے۔ چگائی میں اضافہ ہوتا جاتا ہے (جلد دوم، ص ۶۲۹)

یہ سب راستے کے کنارے ایک سالھ میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ یہ ایسی جھونپڑی تھی جس کی دیواروں پر پھوس اور سرکنڈوں کا چھپر تھا۔ چھپر کے نیچے شہتیر کی بجائے اڈیاں جڑی تھیں (جلد دوم، ص ۵۸۳)

کہیں واہن کھیت تھے، جن میں ہل چلایا جا چکا تھا۔ مگر نہ سہاگا پھرا تھا نہ .... (جلد دوم، ص ۲۱)

مکئی کے بھٹوں سے ادھر ادھر نکلے ہوئے بمبلوں کے سفید اور باریک سوت

بکھرے ہوتے تو جھالر بن کر لہراتے .... کپاس کے .... ڈوڈوں سے روئی کے سفید سفید تونبے پھوٹ کر باہر نکل آئے تھے۔ یہ بھٹی تھی (جلد دوم، ص ۴۶۸)

سردار کے قریب پہنچا۔ اس کے قدموں کو ہاتھ لگا کر پیریں پون کیا۔ سر سے پگڑی اُتاری اور سردار کے قدموں میں ڈال دی (جلد دوم، ص ۲۵۵)

زمین کھنڈل تھی۔ جگہ جگہ گڑھے تھے (جلد اول، ص ۵۶۴)

جھٹ اندر داخل ہو گیا اور دروازہ بھیڑ دیا (جلد اول، ص ۶۱۳)

لالی نے ہاتھ میں دبی ہوئی دھوتی ایک طرف پھینکی (جلد اول، ص ۳۵۲)

باڑا مویشیوں کے عام دھو یا ڈھارے کی طرح کا نہ تھا جس پر بارش اور سردی سے بچاؤ کے لیے چھپر ڈال دیا جاتا ہے (جلد اول، ص ۹۶)

زمین کی وٹ بندی پر جب رحیم داد کا سیف اللہ اور اس کے بھائیوں کے ساتھ مسلح تصادم ہوا (جلد سوم، ۳۹۹)

جمال دین نے جھٹ دھوتی کے ڈب سے چاقو نکالا اور اسے کھول کر زور سے چیخا (جلد سوم، ص ۴۰۰)

سردار مزاری ولیٹھ مارے بیٹھا تھا۔ اس کی دونوں ٹانگوں کے گرد خیری لپٹی ہوئی تھی (جلد سوم، ص ۲۱۷)

ان گڑھوں سے پتھیرے زمین کھود کر مٹی نکالتے۔ مٹی میں ضرورت کے مطابق پانی ملاتے، پھاوڑے اور ہاتھوں کی مدد سے اسے آٹے کی طرح گوندھ کر گارا تیار کرتے۔ گارے کو سانچوں میں بھر کر اینٹیں تیار کرتے .... اینٹیں دھوپ میں سوکھ

کر سخت ہو جائیں تو چٹے بنا کر ان کی گنتی کی جاتی۔........ جب کچی اینٹیں چن دی جاتیں تو جلائی کا کام کرنے والے آگے بڑھتے .... چمنی کے عین نیچے پختہ چبوترہ تھا .... اس چبوترے کو پتھیروں کی اصطلاح میں تو اکہا جاتا ہے (جلد سوم، ص ۴۴۶)

وہ پتھیروں کا چٹھا تقسیم کر رہا تھا........ معاوضے کی رقم گن کر اس کے حوالے کر دیتا (جلد سوم، ص ۴۵۱)

ڈوگر کے ہاتھ میں اس وقت بھی چمڑے کا چھتر دبا تھا۔ وہ بھی میاں اسلم کا کارندہ تھا (جلد سوم، ص ۴۵۷)

اس نے بوچھن کے آنچل سے بکل مار کر اپنے چہروں کو اس سے اس طرح چھپا رکھا تھا (جلد سوم، ص ۲۲۳)

قمیص پھٹ کر لیر لیر ہو گئی تھی۔ برہنہ پیٹھ اور کمر پر چھتر کی مار کے نشان صاف نظر آ رہے تھے (جلد سوم، ص ۴۸۲)

"جانگلوس" کے اس لسانی تجزیے کی مندرجہ بالا مثالوں سے اگرچہ چند ہی پہلو اُبھر کر سامنے آئے ہیں مگر قاری پورا ناول پڑھنے کے بعد اس بو باس کا اندازہ کر سکتا ہے، جو بپسی سدھوا کے ناول The Crow Eaters میں سرزمین کے حوالے سے محسوس ہوتا ہے۔ یوں اصل مطالعے کے بعد بھی ہم اسی نتیجے پر پہنچیں گے کہ "جانگلوس" پاکستانی اردو کا ایک اہم نمونہ ہے۔ اگر اس طرح کے تجزیے ان پچاس برسوں میں پاکستانی ادب میں تخلیق دادہ دیگر اردو تحریروں کے بھی کیے جائیں تو تجزیاتی کوائف کا اچھا خاصا ذخیرہ ہاتھ لگ سکتا ہے جو پاکستانی اردو کے خدوخال میں رنگ بھرنے اور اسے تحقیقی بنیادوں پر ایک رنگین مرقع بنانے میں بہت حد تک کام کر سکتا ہے۔ یہ تجزیہ اسی کام کا نقشِ اول ہے۔

ابتدائی سطح پر اردو کی تدریس پاکستانی بچوں کے حوالے سے

تاج محمد

پاکستانی اردو کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اس میں لہجے کے علاوہ علاقائی زبانوں کے الفاظ بھی بولے جانے لگے ہیں۔ انگریزی کے اثرات سے قطع نظر کہ وہ تو تقریباً تمام ہی پاکستانی زبانوں پر اثرانداز ہو رہی ہے، پاکستانی اردو کا منفرد اور واضح پہلو یہی ہے کہ یہ پاکستان کی دوسری زبانوں سے میل جول کے بعد ایک نئی صورت اختیار کر چکی ہے، اس کی ایک صورت کسی دور میں کراچی جیسے شہر میں نظر آ رہی تھی لیکن اب اس کی ایک واضح صورت پاکستان کے تقریباً سبھی بڑے شہروں میں دکھائی دیتی ہے۔ اسلام آباد میں تو یہ واضح تر ہوتی جا رہی ہے۔ خاص طور پر سکولوں میں، جہاں مختلف اور متنوع بولیوں اور پس منظروں سے بچے آتے ہیں، پاکستانی اردو کا منظر نامہ دیدنی ہے اور یہی وہ پاکستانی اردو ہے جس میں مختلف علاقوں اور مختلف زبانوں سے تعلق رکھنے والے بچے آپس میں گفتگو کر کے ایک دوسرے کے نقطہ ہائے نظر کو سمجھ لیتے ہیں۔ اس میں سندھی، بلوچی، پنجابی، پشتو، سرائیکی، براہوی اور دیگر زبانوں کا عمل دخل واضح دکھائی دیتا ہے۔ "جرگہ"، "خواہ مخواہ"، "بادشاہو"، "سجی"، "سائیں"، "پھڈا"، "لفڑا" جیسے الفاظ اسے واضح تر کرتے نظر آتے ہیں۔

اسلام آباد پاکستان کا دارالحکومت ہے۔ یہاں کے سیکرٹریٹ میں دور دراز کے علاقوں سے تعلق رکھنے والے اہل کار کام کرتے ہیں۔ ان کی مختلف زبانیں اور علاقائی

رسم ورواج سے وابستگی کی بنیاد پر ان کا انداز گفتگو اور لہجہ مختلف ہوتا ہے لیکن جب وہ آپس میں گفتگو کر رہے ہوتے ہیں، ان میں جو چیز انھیں ایک دوسرے کی زبان سمجھنے اور ایک دوسرے کے قریب لانے میں اہم کردار ادا کرتی ہے، وہ اردو ہے انگریزی نہیں کہ اگرچہ ان کا زیادہ تر کام انگریزی میں ہوتا ہے۔ اسی طرح اسلام آباد میں غیر ملکی بہت زیادہ تعداد میں آباد ہیں جو پاکستان میں غیر ملکی سفارت خانوں میں زیر ملازمت سفارت کاروں کے ہمراہ اسلام آباد آتے ہیں، مختلف ملکوں اور مختلف سفارت خانوں کے لوگ آپ میں جو گفتگو کرتے ہیں ان کا انداز بہت مختلف ہوتا ہے لیکن وہ اردو زبان میں اپنے پاکستانی دوستوں کے ساتھ جو گفتگو کرتے ہیں اس کا انداز اور لہجہ مختلف ہوتا ہے۔ اس طرح افغانستان پر روسی تسلط کے بعد جو افغان مہاجرین پاکستان آئے ہیں اور انھوں نے افغانی لہجے میں اردو کے انداز گفتگو کو ایک نئی سمت دی۔ صومالیہ اور دیگر افریقی ملکوں سے ایک کثیر تعداد آ کر یہاں بس رہی ہے۔ اسلامی یونیورسٹی میں کئی مسلم ملکوں کے طلبہ زیر تعلیم ہیں۔ یوں مختلف زبانوں کے درمیان رابطے اور باہمی تعلقات کو فروغ دینے میں پاکستانی اردو کا کردار باعث فخر و طمانیت ہے۔ یہی صورت یہاں کے بچوں میں اردو کے استعمال سے متعلق ہے۔

بچوں میں زبان کی تدریس کے حوالے سے ہم انھیں معروف چار گروہوں میں تقسیم کر سکتے ہیں جن کی طرف ڈاکٹر عطش درانی نے اپنی تحریروں میں اشارہ کیا ہے؛ یعنی ایک گروہ ان بچوں کا ہے، جن کے خاندان میں اردو بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ دوسرے وہ بچے جن کے گھروں میں اردو ان کی مادری زبان کے ساتھ بولی جاتی ہے اور یوں سکول جانے کی عمر سے پہلے اردو ان کے ماحول میں پورے طور سے موجود ہوتی ہے اور وہ اسے سیکھ چکے ہوتے ہیں۔ تیسرے گروہ میں وہ بچے شامل ہیں، جن کے ماحول میں کسی حد تک اردو موجود ہوتی ہے یعنی ان کے کان اردو سے آشنا ہوتے ہیں لیکن وہ

اسے باقاعدہ سیکھ نہیں پاتے اور یوں سکول میں آ کر انھیں اردو بطور ثانوی زبان سیکھنے کی ضرورت ہوتی ہے اور چوتھے ایسے بچے جن کے ماحول میں اردو سرے سے موجود ہی نہیں ہوتی۔ وہ دور دراز علاقوں یا غیر ملکوں سے آتے ہیں اور انھیں اردو بطور اجنبی زبان سیکھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔

اسلام آباد میں بلحاظ مادری زبان اور کلچر، مختلف پس منظروں کے بچے پڑھتے ہیں۔ البتہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ٹی وی پر یا گلی محلے میں بچوں کو زیادہ تر اردو زبان ہی سے واسطہ پڑتا ہے۔ یوں بلحاظ زبان بچوں کے معروف چار گروہوں (خاندانی زبان، ماحول کی زبان، ثانوی زبان، اجنبی زبان) میں سے (خاندانی زبان سے قطع نظر) اردو بچوں کے ماحول کی زبان سمجھی جاتی ہے۔ اس طرح یہاں خاندانی زبان کا اتنا سہارا نہیں لینا پڑتا جتنا کہ بلوچستان، سرحد، پنجاب یا سندھ کے دور دراز کے گاؤں کے بچوں کے لیے۔ بایں ہمہ کمرۂ جماعت میں مؤثر تدریس کے لیے بچوں کی خاندانی زبان کے استعمال کی ضرورت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن اس میں عملی دقت یہ ہے کہ ہر استاد چاروں صوبوں کی ان متعدد زبانوں سے کماحقہ واقف نہیں ہو سکتا۔ تاہم جس زبان پر استاد کو قدرت حاصل ہے، تعلیمی ضرورت کے تحت بچے کے لیے وہ زبان استعمال کرنے سے دریغ نہ کرے تاہم اس ایک طریقے پر اکتفا نہ کرے اور جہاں ضرورت محسوس ہو، اپنی ذہنی اُپج سے کام لے۔ گویا کامیاب تدریس وہی ہوگی جس میں استاد فنکارانہ چابکدستی کے ساتھ کام انجام دینے کی کوشش کرے گا۔ اردو میں بات چیت کرتے وقت بھی پاکستانی اردو کا درس ہاتھ سے نہ چھوٹے یعنی بچے وہی اردو سمجھیں گے جو اپنے ماحول میں سنتے چلے آ رہے ہیں۔ اس مرحلے کو کامیابی سے نباہنا بچوں کا کھیل نہیں۔

اسی پر قیاس کرتے ہوئے اگلی جماعتوں میں اردو کی تدریس کا اہتمام ضروری ہے اور اردو لازمی اور اردو ادب کو دو مختلف اور جداگانہ صورتوں یعنی (۱) "عملی

ضروریات کی زبان" اور (۲) "اصنافِ ادب کی تقسیم" کے حوالے سے مرتب کرنا لازم ہے۔ پاکستانی اردو کی تدریس کے تقاضے کچھ اسی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

اب ذرا علاقائی زبانوں کے حوالے سے گفتگو کرتے ہیں۔ تدریس کے شعبے میں اردو کے علاوہ علاقائی زبانوں کا ذریعۂ تعلیم بھی استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً سندھ میں سندھی، پنجاب میں پنجابی، پشاور اور سوات میں پشتو وغیرہ۔ آج بھی آپ ملتان، میانوالی، خانیوال یا سرگودھا کے کسی شہر یا قصبے میں چلے جائیں تو اساتذہ خاص طور پر ریاضی پنجابی اور سرائیکی میں پڑھاتے نظر آئیں گے۔ ٹیکسٹ بک بورڈوں کے قاعدے میں آم کی تصویر دیکھ کر "دیکھو اور بولو" طریق پر طالب علم اسے "امب" ہی کہتا سنائی دے گا۔

ایسی صورت میں پاکستان میں اردو کی تدریس کی مشکلات بڑھ جاتی ہیں۔ آج تک اردو کی تدریس کے لیے قاعدے اور درسی کتابیں صرف پہلے گروہ کے بچوں کو ملحوظ رکھ کر مرتب کی گئی تھیں جن میں "دیکھو اور بولو" کا طریق تدریس موزوں تھا۔ لیکن کوئی ایسی صورت نہیں تھی کہ مادری زبان اور کلچر کے ان متنوع پس منظروں میں اردو کی تدریس کا کوئی مربوط طریقہ وضع کیا جاتا۔ پاکستان کے تربیتی اداروں میں بھی اساتذہ کو اردو کے لیے کوئی ایسا جامع طریقہ نہیں سکھایا گیا۔ کسی تحقیقی ادارے نے اس پہلو سے کوئی تحقیق انجام نہیں دی۔ چنانچہ جب تدریس اردو کی مشکلات بڑھنے لگیں تو اس پر غور و فکر شروع ہوا۔

اس ضمن میں پاکستانی اردو کے حوالے سے اگر ڈاکٹر عطش درانی کی کوششوں کا ذکر نہ کیا جائے تو یقیناً ناانصافی ہوگی۔ انھوں نے مقتدرہ کے پلیٹ فارم سے تدریس اردو کے کورسوں کا انعقاد کیا اور تدریس اردو میں بچوں کو درپیش مختلف مسائل کی جس طرح نشاندہی کی وہ قابل تعریف اور لائق پذیرائی ہے۔ نیز یہ حقیقت ہے کہ ان تدریسی

ورکشاپوں سے کم از کم اسلام آباد کے مختلف اداروں میں بچوں کی تعلیم سے وابستہ اساتذہ نے بہت کچھ حاصل کیا۔ گویا یہ احساس فضا میں موجود تھا، جسے وفاقی وزارت تعلیم نے بھی نوٹ کیا۔ چنانچہ سیکرٹری تعلیم کے ایک فرمان پر ایسا ایک قاعدہ مرتب کرنے کا آغاز کیا گیا جو سادہ طریقے سے پاکستانی بچوں کی ضروریات تدریس پوری کر سکے۔ اس کے نتیجے میں ۱۹۹۵ء میں شعبہ نصابیات وفاقی وزارت تعلیم نے فیصلہ کیا کہ بچوں کی تدریس کے لیے پاکستانی کلچر اور تقاضوں کے پیش نظر نصابی کتب کی تیاری کا آغاز ابتدائی قاعدے سے کیا جائے۔

صوبوں کے ٹیکسٹ بک بورڈوں کے نمائندوں ناظم علی خان، محترمہ ذولیجہ بازئی، ڈاکٹر ممتاز منگلوری، نائب مشیر تعلیم محمد شریف، شریک مشیر تعلیم اور انچارج شعبہ نصابیات کے ساتھ سیکرٹری تعلیم کی صدارت میں ایک نشست میں یہ طے پایا کہ ایسا ایک قاعدہ مرتب کرنا چاہیے اور مقتدرہ قومی زبان اور اردو لغت بورڈ سے بھی اس سلسلے میں مشورہ لینا چاہیے۔ چنانچہ "مقتدرہ" کے صدر نشین افتخار عارف اور "مقتدرہ" ہی کے ڈاکٹر عطش درانی اور اردو لغت بورڈ سے ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے ساتھ مشاورت، تعاون اور نظر ثانی کے بعد بنیادی ذخیرۂ الفاظ جانچا گیا، جس کی روشنی میں جماعت اول کا قاعدہ مرتب کیا گیا۔ اسے نیشنل بک فاؤنڈیشن نے شائع کیا اور ۱۹۹۶ء سے وفاقی تعلیمی اداروں میں اسے نافذ کیا گیا۔ بعد ازاں ایک مابعد تحقیق بھی انجام دی گئی۔ سکولوں کے اساتذہ سے اس کی پیش رفت کا جائزہ لیا گیا جس کی روشنی میں اگلے سال اس قاعدے کو تدوین نو کے بعد پھر سے رائج کر دیا گیا اب اور صوبوں سے بھی گزارش کی جائے گی کہ کم از کم انہی اصولوں پر قاعدے مرتب کریں۔ یہ بنیادی اصول کچھ یوں ہیں:

۱۔ پاکستانی بچوں کے لیے اردو کی تدریس کا آغاز ان کے ماحول میں موجود اشیاء کی شناخت سے ہونا چاہیے۔

۲- ذخیرۂ الفاظ ان کے پس منظر سے اخذ کرنا چاہیے۔

۳- اردو حروف کی تدریس بامعنی اور بامقصد ہونی چاہیے یعنی پہلے ہی حرف سے بامعنی جملے کی تدریس کا آغاز ہو۔

۴- پاکستانی ثقافت کو ہر صورت میں مقدم رکھا جائے۔

یہی وجہ ہے کہ اس قاعدے میں چند حروف علت یا مصوتوں یعنی "الف" کے بعد "و" اور "ی، ے" کو دیگر حروف سے پہلے پڑھوایا جاتا ہے تاکہ الفاظ اور بامعنی جملے باسانی بن سکیں۔ یہی اس قاعدے کی بنیادی خصوصیت ہے، جس کی تدریس کے لیے اساتذہ کے لیے ایک رہنما کتاب بھی تیار کر کے شائع کی گئی ہے۔ اس میں کلچر طریق (Culture Method) اور طریق ترجمہ (Translation Method) کو بھی ملحوظ رکھا گیا ہے۔ حروف کی تعداد، نئے حروف کا اضافہ اور ان کے تعدد استعمال کے موضوع پر بھی کئی تحقیقات سامنے آئی ہیں، جن کی روشنی میں اس قاعدے کو مرتب کیا گیا ہے۔

اخبارات، رسائل، جرائد، ریڈیو اور ٹی وی اردو کے فروغ میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ بچے ان کے ذریعے سب کچھ حاصل کرتے ہیں تاہم ہمارے ہاں ٹی وی وہ واحد ذریعہ ہے جو بچوں کی تدریس میں اہم کردار ادا کر سکتا ہے۔ ٹی وی نے اس ضمن میں مختلف مذاکرے اور پروگرام بھی پیش کیے ہیں لیکن تدریسی نقطۂ نظر سے جن پروگراموں کی ضرورت تھی وہ پیش نہ کیے جا سکے۔ ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ ٹی وی پر، جس نے اپنے ڈراموں اور مباحثوں کے ذریعے پاکستانی اردو کے فروغ وارتقاء میں اہم کردار ادا کیا ہے، تدریسی اسباق بھی پیش کیے جائیں، جیسے انگریزی میں سیسمی سٹریٹ کے پروگرام ہیں، جن کے ذریعے سے پاکستانی اردو کا تدریسیاتی پہلو مستحکم ہو گا۔

سائنسی اصطلاحات اور اردو

پروفیسر خادم علی ہاشمی

ڈاکٹر عطش درانی نے اپنے خیال افروز مقالے میں (اخبار اردو فروی ۱۹۹۶ء) گذشتہ نصف صدی میں رونما ہونے والی زبان و بیان میں تبدیلیوں پر ایک طائرانہ نظر ڈالی ہے۔ دراصل اس مقالے میں نہ صرف زبان میں تبدیلیاں زیر بحث آئی ہیں بلکہ بین السطور معاشرتی تبدیلیاں بھی جھانکتی نظر آتی ہیں۔ جن دنوں لاہور کے خانہ فرہنگ ایران کی ناظم خانم مریم بہنام تھیں، ادبی و معاشرتی حلقوں میں اُن کی تقاریر حیرت آمیز دلچسپی سے سنی جاتی تھیں۔ ان کی تقریروں میں فارسی ترکیبوں کا استعمال انتہائی خوبصورت ہوتا تھا۔

ابتدائی دور کے سیاسی و مذہبی رہنماؤں اور دانشوروں کی تقریر و تحریر دونوں مروجہ قواعد و ترکیبوں کے دائرے میں ہوتیں۔ غالباً اُس قبیل کے آخری افراد انجمن احرار اسلام (بعد میں مجلس تحفظ ختم نبوت) کے لیڈر جن میں قاضی احسان احمد شجاع آبادی، شورش کاشمیری شامل ہیں۔ مولانا مودودی، مولانا کوثر نیازی وغیرہ تھے۔

عطش صاحب نے تو زبان، ادب اور شاعری کے حوالے سے باتیں کی ہیں۔ سائنس و ٹیکنالوجی کی دنیا ادب و فن کے دائرے میں ہوتے ہوئے بھی اس سے آزاد رہی ہے۔ عالمی ادب پر نظر ڈالی جائے تو جس زبان میں جس فن اور علم میں زیادہ ترقی ہوئی، اُس فن سے متعلق اصطلاحات بھی وضع ہوئیں اور یہ اصطلاحیں دوسری زبانوں میں ترجمہ یا معمولی تبدیلی کے ساتھ در آئیں، چنانچہ انیسویں صدی اور بیسویں صدی کے ربع اول میں

فرانس ادب اور لٹریچر کا گہوارہ تھا، جس کے اثرات انگریزی زبان و ادب پر پڑے اور کئی اصطلاحیں فرانسیسی سے انگریزی میں آئیں۔ اُسی دور میں جرمنی سائنسی علوم میں راہنما تھا چنانچہ جرمنی اصطلاحیں مثلاً کوانٹم، فوٹون (Photon) جوں کی توں انگریزی اور دوسری زبانوں کو منتقل ہوئیں۔ البتہ حیاتیات کے علم میں لاطینی اصطلاحات کا ترجمہ شاید ممکن نہ تھا لہٰذا وہ جوں کی توں یا ذرا سے تصرف (Inflection) کے ساتھ یورپی زبانوں میں استعمال ہونے لگیں۔ اس سے قبل عربی اصطلاحات یورپی زبانوں میں شامل ہوتی رہیں۔ چنانچہ فلکیات کی بیشتر اصطلاحیں، ستاروں اور مجامع النجوم کے نام معمولی تصرف کے ساتھ تاحال مستعمل ہیں۔

اردو میں اس وقت وہی صورت حال ہے جو بارہویں صدی عیسوی کے یورپ کی زبانوں کو عربی کے مقابل پیش آئی۔ یعنی علوم کا بے بہا خزانہ سامنے ہے اور اُسے اپنی زبان میں منتقل کرنا ہے۔ اردو میں اصطلاح سازی کا ابتدائی کام انجمن ترقی اردو، جامعہ عثمانیہ وغیرہ میں ہوا۔ تاہم دوسرے علاقوں اور اداروں میں بھی ایسی کوششیں جاری رہیں۔ جامعہ عثمانیہ میں بھی پنجاب اور یوپی کے علماء نے جا کر کام کیا تھا۔ تاہم اس دور کے تراجم اور اصطلاح سازی کی کوششیں بعد میں ہونے والے کام کے لیے نمونہ ثابت ہوئیں۔ البتہ اس دوران میں ایک واضح فرق یہ سامنے آیا کہ اصطلاح سازی میں عربی کے مقابلہ میں فارسی اور ہندی نیز مقامی بولیوں اور زبانوں کی جانب جھکاؤ بڑھتا چلا گیا ہے۔

پاکستان کے آئین میں اردو کو قومی درجہ دینے کے باعث ذریعۂ تعلیم ثانوی سطح تک اردو بن گیا۔ اس سے پیشتر نویں دسویں جماعت میں سائنس اور ریاضی کی تدریس انگریزی میں ہوتی تھی تاہم مڈل کلاسوں میں اردو میں مستعمل تھی۔ ابتدائی دور میں ریاضی کی کتابیں خواجہ دل محمد نے تصنیف کیں۔ سائنس کی کتابیں ڈاکٹر محمد شجاع ناموس،

ڈاکٹر عبدالبصیر پال اور حمید عسکری کی آئیں۔ ثانوی سطح پر یہ اور دوسری کتابیں ایسے حضرات کی تصنیف تھیں جو زبان کا استعمال بھی جانتے تھے اور انھیں اپنے مضمون پر بھی مہارت حاصل تھی۔ خواجہ دل محمد مرحوم صاحب طرز شاعر تھے اور اُن کی شاعری کی ایک کتاب السنۂ شرقیہ کے امتحان کے لیے جامعہ پنجاب نے منظور کی ہوئی تھی۔ ڈاکٹر ناموس مرحوم اردو اور فارسی کے شاعر تھے، صاحب دیوان تھے اور کئی کتابوں کے مصنف تھے، جن میں ناول، سفرنامے، ادبی ڈرامے شامل ہیں۔ ان کی تصانیف ادبی دنیا کے لیے قابل قبول تھیں۔

وقت گزرنے پر حالات کی تبدیلی کے پیش نظر، درسی کتابوں کی ترتیب و تدوین ٹیکسٹ بک بورڈ کی ذمہ داری ہوئی تو کتابوں کی تیاری کا انداز بھی تبدیل ہو گیا۔ سرکاری ادارے میں ملازمت کے لیے ادیب یا ماہر زبان ہونا شرط نہ تھی اور کتابوں کی ترتیب و تدوین میں تعلیمی اداروں کے معروف اساتذہ سے مدد لی جانے لگی۔ ایسے لوگ اپنے مضمون میں مہارت تو رکھتے تھے مگر ان میں ہر شخص ڈاکٹر نذیر احمد مرحوم کی طرح سائنسی علوم اور ادبی زبان پر قادر نہ تھا۔ نتیجتاً نئے مضامین اور نئے موضوعات پر لکھنے کے لیے نئی اصطلاحات کی ضرورت پیش آئی۔ وقت کا تقاضا تھا کہ کتاب جلد از جلد مارکیٹ میں آئے تاکہ طلبہ کا نقصان نہ ہو۔ مصنفین کو اردو زبان پر عبور نہ تھا۔ بعض مصنفین نے تو زندگی بھر اردو میں ذاتی خط تک نہ لکھا تھا۔ ایسی صورت میں انگریزی اصطلاحات کو بجنسہ اردو میں استعمال کرنے کا رواج شروع ہوا۔ چند مثالیں درج ذیل ہیں۔

میگنٹ (Magnet)، فیلڈ (Field)، الیکٹرک چارج، آئن (Ion)، مالیکیول (Molecule)، بانڈ (Bond)، ان ایکوالٹیاں (Inequalities)، لائن (Line)، رداس (Radius)۔

شروع ہی سے طے پا گیا تھا کہ تکنیکی اصطلاحات کا ترجمہ نہ ہوگا۔ مثلاً آکسیجن، ہائیڈروجن، کاربن، نیز حیاتیات میں لاطینی اصطلاحات، اس کا فائدہ اس طرح اٹھایا گیا کہ بعض زبانوں کے عام الفاظ کو بھی جوں کا توں استعمال کیا جانے لگا۔ میگنٹ وغیرہ کا تذکرہ اوپر آگیا ہے۔ اس طرح فراگ (Frog) اور اس کی جمع فراگ ز، سیل (Cell) اور اس کی جمع سیل ز لکھا جانے لگا۔

اردو میں اس قسم کی اصطلاحات کا استعمال ایک تو اس لیے روا رکھا گیا کہ پڑھانے والے اساتذہ ان اصطلاحات سے واقف تھے۔ اس کے علاوہ یہ سوچ بھی کار فرما تھی کہ اردو میں پڑھنے کے بعد جب یہ بچے انگریزی میں پڑھنے کے لیے بڑی جماعتوں میں جائیں گے تو ان کو نئی اصطلاحات کے باعث دشواری نہ ہوگی اور وہ پہلے ہی سے ان اصطلاحات سے واقف ہوں گے جو انگریزی ذریعۂ تعلیم میں پیش آئیں گی۔ یہ استدلال کہاں تک درست ہے ایک علیحدہ بحث طلب موضوع ہے۔

ایک طبقہ اس روش کے خلاف بھی کام کر رہا تھا۔ وہ طبقہ درسی کتابوں سے باہر عام لٹریچر تیار کر رہا تھا۔ ان میں بعض بڑے نام تھے۔ مثلاً میجر آفتاب حسن، عظمت اللہ خاں، ڈاکٹر افضال حسین قادری، میجر علی ناصر زیدی، ڈاکٹر سید اسلم وغیرہ نیز عام اخبارات و جرائد میں شائع ہونے والے سائنسی مضامین بھی "بہتر اردو" پیش کرتے۔

اس طرح سائنسی میدان میں لکھنے والے دو گروہوں میں بٹ گئے ایک گروہ کی تحریروں میں جملے کے جملے انگریزی الفاظ پر مشتمل ہوتے جبکہ دوسرے گروہ کی تصانیف میں ریاضیاتی مساوات بھی اردو ہی میں ہوتیں۔ ان دونوں کے بین بین چند لوگ نئی راہ نکالنے میں مصروف تھے۔ ان میں عظمت علی خاں کی ادارت میں شائع ہونے والا "کاروانِ سائنس" تھا جس نے بہت عمدہ مضامین شائع کیے اور ہر دو طبقوں کے ماہرین سے مضامین تصنیف کرائے اور مجموعے مرتب کرائے۔

زبان اور علم و فن کا معاشرتی حالات سے گہرا رشتہ ہوتا ہے۔ چنانچہ اس دوران میں ایک اور تبدیلی رونما ہوئی، وہ تھی ملک بھر میں انگریزی ذریعۂ تعلیم کے اداروں کی بھرمار اور الیکٹرانک میڈیا کی یلغار۔ اس نئی صورت حال نے اردو میں سائنسی ادب کی تیاری کی رفتار کو سست کر دیا۔ نئی نسل جس قسم کی اردو بول رہی ہے، ٹیلی وژن پر جو زبان پیش کی جا رہی ہے، اُس نے صحافت اور ادب کو یکساں متاثر کیا ہے۔ ڈاکٹر عطش درانی نے جو مثالیں پیش کی ہیں کہ اردو انگریزی الفاظ کے، اردو املا کے تکلف کے بغیر، انگریزی ہجے اگر بڑے ادیب استعمال کر رہے ہیں تو سائنسی کتابیں لکھنے والے تو پہلے ہی ایسی آسانی کے خواہاں تھے۔ گذشتہ دو دہائیوں میں ابلاغیات میں اس قدر ترقی ہوئی ہے کہ ہر روز نئی اصطلاحات سامنے آ رہی ہیں۔ ان اصطلاحات کا ترجمہ کسی بھی قوم کے لیے ناممکن ہے۔

ہم اس وقت علوم کے بہاؤ کے ایک عبوری دور سے گزر رہے ہیں اور ہر جہت میں ترقی کی منازل سامنے ہیں۔ ان کی طرف بڑھتے ہوئے بعض اصولوں کا پاس ممکن نہیں۔ بالکل اُسی طرح جیسے کسی شکست خوردہ فوج کے تعاقب میں بھاگنے والی فوج کا ہدف محض گرفتار کرنا ہوتا ہے۔ اس میں طریق کار یا بھاگنے کے اصول پیش نظر نہیں ہوتے۔ ہم بھی اس وقت علوم کی دنیا میں ترقی یافتہ اقوام کے پیچھے بھاگ کر بہر طور اُن تک پہنچنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ہم کس طرح اپنا ہدف حاصل کرتے ہیں۔ یہ ہمیں بھی معلوم نہیں۔ جب حالات رو بہ سکون ہوں گے تو معلوم ہوگا کہ اس دوڑ میں کیا کھویا کیا پایا!

پاکستانی اردو:

گھر میرا نہ دلی نہ صفاہاں نہ سمرقند

محمد شریف کنجاہی

لیکن جس طرح درویش خدامست کے اس انکار میں اقرار کا یہ پہلو بھی موجود ہے کہ دلی بھی اس کا گھر ہے، صفاہاں بھی اس کا گھر ہے اور سمرقند بھی اس کا گھر ہے، اسی طرح پاکستانی اردو شرقی یا غربی نہ ہوتے ہوئے شرقی بھی ہے اور غربی بھی ہے اور ڈاکٹر عطش درانی نے بجا طور پر لکھا ہے کہ اردو کا خمیر دنیا بھر کی زبانوں سے مل کر اٹھا ہے۔ اسی اجمال کی تفصیل میری سعی بھی ہے اور میرا مدعا بھی۔

میں اپنی بات کو دسمبر ۱۹۹۰ء کے "اخبار اردو" میں شائع ہونے والے اپنے ایک مضمون سے شروع کرتا ہوں جو ناروے کی ایک متروک بولی سے متعلق تھا اور اس جغرافیائی خطے کے متعلق جہاں روس اور سکینڈے نیویا ایک دوسرے کے بہت قریب ہیں۔ یہ جغرافیائی قربت انسانوں کو بھی ایک دوسرے کے قریب کر جاتی ہے اور زبانوں کو بھی۔ زبان شناسوں نے رابطے کی اس زبان کو روس نارس کہا ہے اور اس کے محدود موجود ذخیرۂ الفاظ میں دو لفظ ہیں "موجو توجو" اور ان کا مفہوم تقریباً وہی ہے جو ہمارے یہاں ہے یعنی "میں اور تم"۔ اسی طرح ایک اور لفظ "کرالم" بھی توجہ طلب ہے۔ اس سے چوری کرنا مراد ہے یعنی چرانا اور چران اور اگر اٹھالنا بٹھالنا کو ذہن میں رکھ کر کرالم کو کرالنا مان لیا جائے کہ م = ن آوازوں کا عام چلن ہے اور ک = چ بھی تو کرالم = چرالن = چرالنا = چرانا بن جاتا ہے اور اردو کے اس لفظ کا تعلق ہی قطب شمالی

سے نہیں جڑ جاتا بلکہ ل کا مخصوص استعمال اس تعلق میں ایک گہرائی پیدا کرتا ہے۔

لیکن میں اس متروک مخطوطے کو چھوڑ کر سکینڈے نیویا کی طرف آتا ہوں اور سب سے پہلے لفظ آفت کی طرف۔ ہم نہیں جانتے کہ اس لفظ سے کیوں وہ مراد ہے جو اس سے مراد ہے لیکن نارویجی زبان میں aften سے شام مراد ہے اور شام ماضی بعید ہی نہیں ماضی قریب تک جب یہ ملک جدید سہولتوں سے محروم تھا تکلیف دہ تبدیلی تھی۔ سوسن ٹائیرل اپنی کتاب Ways of Nor way میں لکھتی ہے کہ "تاریکی کے لمحات حقیقی مصائب کے لمحات ہوتے ہیں۔ انہیں ساعات مرگ سمجھیے۔ بوڑھے، کمزور و ناتواں اور بیماران تاریک مہینوں میں کم ہی جانبر ہوتے ہیں" اور ہم قیاس کر سکتے ہیں کہ آفت اصل میں ناروی لفظ آفتن ہی کی بے نون صورت ہے۔ اسی طرح باد (Bad) کو لیجیے۔ اس سے غسل کرنا مراد ہے جس کی طبعی صورت صدیوں پہلے بادل ہی ہوتے تھے۔ انگریزی ہجا Bathe اسے بادل سے دور لے گیا ہے لیکن Bad اور Badal ہم اصل لگتے ہیں بلکہ فارسی لفظ باد یعنی ہوا کو یہ نام اسی لیے ملا کہ وہ بادل لے کر آتی تھی۔ قرآن کریم میں بھی بادل لانے والی ہواؤں کو مبشرات کہا گیا ہے۔ اسی طرح پلک کو لیجیے۔ ہم اس کو جانتے ہیں لیکن یہ نہیں جانتے کہ اسے یہ نام کیوں دیا گیا۔ یہ عقدہ ناروی لفظ بلک سے کھلتا ہے جس سے آنکھ اور دید مراد ہے۔ یعنی پلک میں بلک، کا حوالہ ہے۔ عجیب اتفاق ہے کہ بلک بلکنا کی صورت میں ہمارے ہاں موجود ہے۔ اسی پٹی میں بک ہے جس سے بکرا مراد ہے اور بک ہے جس سے پیٹ مراد ہے اور بھوک سے دراصل یہی مراد ہے کہ معدہ کچھ مانگ رہا ہے۔ بھیک میں بھی یہی حوالہ ہے۔ مانگنے کے حوالے سے منگل ناروے میں کمی اور احتیاج کا مفہوم رکھتا ہے اور قیاس آرائی کی جا سکتی ہے کہ منگول سے وہ لوگ مراد تھے جو غذائی قلت کے باعث شمال سے جنوب کو چل پڑے تھے اور مانگنا میں غذائی کمی کا حوالہ پوشیدہ ہے جس سے مانگت بنا لیکن اٹلی

میں جا کر منگیار سے کھانے کا عمل مراد ہوا۔ کیوں ہوا سے زیادہ یہ اہم ہے کہ منگ (مانگ) دور شمال سے گھومتا پھرتا ہمارے دیس میں آگیا اور اردو کو "لسان الارض" بنا گیا۔ ایسا ہی ایک لفظ وطن ہے جو عربی، فارسی اور اردو میں یکساں مقبول اور معروف ہے لیکن اس کے بنیادی مفہوم کی طرف پوری توجہ کسی بھی عربی، فارسی اور اردو کی ڈکشنری میں نہیں دی گئی۔ یہ لفظ سورۃ توبہ میں بھی آیا ہے (آیت ۲۵) جہاں اس کی جگہ "مواطن کثیرہ" کی ترکیب ملتی ہے۔ وطن سے عربی لغت میں انسان کے رہنے اور بسنے کی جگہ مراد ہے اور مواطن سے جنگ کے میدان مراد لیا گیا ہے لیکن سویڈش زبان میں اس سے پانی مراد ہے اور پانی ہی دنیا بھر میں لوگوں کے رہنے کا مرکز رہا ہے اور وجہ جنگ و جدال بھی۔ پرانی ناروی بولی میں واتو (Vatu) پانی کو کہتے ہیں اور یوں وطن (وتن) سے پانی والی جگہ مراد تھی۔ انگریزی لفظ Wet اور پنجابی لفظ "وتر" اس کے ہم اصل ہیں۔ بلکہ وتن اور پتن بھی (و = پ)۔ اسی طرح وی (vee) استھونی زبان میں پانی کو کہتے ہیں اور پی پنجابی میں پانی پینے کا حوالہ رکھتا ہے لیکن ہم جنوبیوں تک آتے آتے لفظ وطن اپنے بنیادی مفہوم کی جگہ ثانوی مفہوم کے حصار میں آچکا تھا۔ یہ سفر اور گردسفر قوموں کی طرح لفظوں کا بھی مقدر بنتی آئی ہے اور مخصوص رسم الخط سے یہ گرد یوں جم گئی ہے کہ ہم باسانی پہچان نہیں سکتے کہ کبھی ہم بھی تم بھی تھے آشنا۔

اوپر میں نے بک اور بکرا کا ذکر کیا ہے جس سے مجھے "بکی" یاد آگئی۔ مرزا صاحباں کے مشہور قصے میں مرزے کی گھوڑی اور یہ جاننا ایک حیرت انگیز اور حیرت آمیز مسرت کا باعث بنا جب میں نے قطب شمالی کے ایک ملک آئیس لینڈ کی ڈکشنری میں bak/baki کو گھوڑے اور گھوڑی کا مترادف پایا۔ اسی ملک کی زبان کا ایک لفظ فار (far) ہے جس سے سردی مراد ہے اور جو پالا (ر = ل) کے بہت قریب

ہے۔ اس لفظ کی ایک صورت far یعنی فار ہے جس سے گزر گار مراد ہے اور جو پار کے بہت قریب ہے اس کے آخری حرف کو متحرک اور مفتوح کرنے سے فعل بن جاتا ہے بمعنی جانا یا سفر کرنا اور پارا کو یہ نام اسی حوالے سے ملا کہ وہ سدا سفر میں رہتا ہے۔ دوسری جانب سردی والے لہجے سے ایک فعلی صورت فراسٹ (farast) ہے بمعنی مر جانا، ڈوب جانا (سردی یا سرد پانی یعنی برف کے ذریعے)۔ فراسٹ انگریزی میں بھی سردی کا حوالہ لیے ہوئے ہے لیکن ہجائی اختلاف اسے پالا سے دور لے گیا جب کہ آئیس لینڈی صورت میں ذہن اس طرف ہی چلا جاتا ہے کہ فراست سے مراد کبھی سردی ایسی صورت حال سے بچ نکلنا یا اس میں کود نہ پڑنا تھا۔ جس طرح دانا سے کبھی مراد ڈان (دن) کے ساتھ اُٹھ کر تلاش رزق میں نکل جانے والا تھا لیکن بعد میں ثانوی مفہوم غالب آ گیا۔ .... ہماری تاریخی ترتیب سے تیار کی گئی کئی جلدوں والی ڈکشنری بھی اس قسم کی "سرگذشت الفاظ" سے خالی ہے جس کا آغاز مولوی احمد دین صاحب نے اسی عنوان کے ساتھ آج سے ستر برس پہلے کیا تھا۔

اس دور افتادہ جزیرہ کے چند اور الفاظ بھی توجہ طلب ہیں جن میں سے ایک سوکن (sókn) ہے۔ ہمارے یہاں اس سے دوسری بیوی مراد ہے لیکن کیوں بے جواب ہے۔ جب کہ آئیسی بولی میں اس سے مراد ہے۔ حملہ، جارحیت کا عمل، لڑائی، اذیت رسانی اور سوکن میں یہ سب حوالے موجود ہوتے ہیں۔ پنجابی تمدنی زندگی کا ایک لفظ ترنجن بھی ادھر کو مہار کش ہو رہا ہے۔ اس کا مفہوم پنجابی لغات میں یوں دیا ہے۔ بھنڈار، عورتوں کے مل کر چرخہ کاتنے کی جگہ، مجلس، دوستوں کی بھری مجلس، بزم احباب، دنیا، جہان۔ پٹیالے کے بھاشا وبھاگ کی طرف سے شائع شدہ پنجابی کوش میں ترنجن کو تری ن + جن کا مرکب بنا کر مفہوم دیا ہے۔ "کاتنے والے لڑکیوں، عورتوں کا اکٹھ"۔ بلاشبہ تریا سے عورت مراد ہے اور جن سے اکٹھ لیکن اس میں کاتنے کا حوالہ

دخیلی سا ہے کیوں کہ کاہن سنگھ نابھا کی پنجابی ڈکشنری مہان کوش یعنی لغت معلی میں یہ تو لکھا ہے کہ ترنجھن (ترنجن، تنجن اور تے ادن) سے استریوں کا ٹولہ مراد ہے جو کاتنے کے لیے اکٹھا ہو لیکن قدیم سکھ شعرا میں سے کسی کے شعر کو حوالہ نہیں بتایا جو اس لغت کا چلن ہے۔ سکھ شعرا کی تخصیص میں نے اس لیے کی ہے کہ وارث شاہ نے اس لفظ کو متعدد بار برتا ہے اور ہیر کا تعارف غائبانہ ہی رانجھے سے یوں ہوتا ہے کہ "بادشاہ سیالاں دے ترنجناں دی" اور چند بند آگے جب وارث ہیر کی سراپا نگاری کرتا ہے تو کہتا ہے۔ "کھلی ترنجناں دے وچ لٹکدی اے ہاتھی پھرے جیوں مست نواب دا جی"۔ اس کے بعد جب دونوں کے عہد و پیماں ہوتے ہیں تو رانجھا یوں گویا ہوتا ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو۔ "گل گھت جنجال، کنگال ماریں، جا ترنجنیں وڑیں کوارئیے نی"۔ اور اس کے جواب میں ہیر کہتی ہے۔ "ہتھ بدھڑی رہاں غلام تیری سنے ترنجناں نال سہیلیاں دے"۔ اس کے جواب میں رانجھا ایک بار پھر اس خدشے کا اظہار کرتا ہے کہ "نال نڈھیاں گھن چرکھڑے نوں تساں بیٹھنا وچ بھنڈار ہیرے" تو بلاشبہ چرخے اور کاتنے کا ذکر آتا ہے لیکن یہاں ترنجن کی جگہ بھنڈار کا لفظ آیا ہے۔ اسی طرح یہ لفظ ان ان مصرعوں میں آیا ہے:۔

وچ ترنجناں گاوندا پھرے بھوندا انت اوس دا کسے ناہ پایا ئی (ب ۳۰۸)[1]

کویں ویکھیے اوس مستانڑے نوں جدھی دھم ترنجناں پئی ہے نی (ب ۳۰۹)[2]

پھرے ترنجناں وچ خوار ہوندا وچ وہڑیاں پھیریاں پاؤں دائی (ب ۳۱۱)[3]

وچ ترنجناں پوے وچار تیری ہووے ذکر تیرا اچکی ہانیاں دے (ب ۳۱۶)[4]

چل جو گیا اسی وکھالیائیے جتھے ترنجنیں چھوہریاں گاؤں دیاں نیں (ب ۳۲۴)[5]

اس کے بعد ایک عنوان ہے "تعداد قوم ہای ترنجن والا"۔ گلابی فارسی والے

عنوان والا یہ بندیوں شروع ہوتا ہے۔ جتھے ترنجناں دی گھمکار پوندی آتن بیٹھیاں لکھ مہریٹیاں نیں، اور اس سے ترنجن اور آتن اور کتائی کی سانجھ کی طرف اشارہ جاتا ہے لیکن بعد کے بند پھر مفہوم کو غیر واضح کرتے دکھائی دیتے ہیں:۔

اجو دھی رکھی دھاڑے مار، لیٹر، مشٹنڈڑی ترنجنیں گھمدی اے (ب ۳۲۷)[۶]

ترنجن ویکھناں دہوئیاں چھیل کڑیاں اوتھے گنگ دی تار وجاوناں ایں (ب ۲۷۰)[۷]

روز جمعے دے ترنجناں دھوڑ کیتی ترنکلے گنگ ار بیلیاں دے (ب ۴۶۱)[۸]

وانگ شاہ پریاں چھنا چھن چھنکن وڈے ترنجن نال سہیلیاں دے (ب ۴۶۱)[۹]

اس آخری مصرع میں ترنجن سے بظاہر جھرمٹ کی فضا بنتی ہے اور ب ۴۶۱ میں بھی لیکن ب ۳۲۷ اور ب ۳۷۰ میں ترنجن سے مخصوص زنانہ بیٹھکوں کی طرف مفہوم جاتا ہے اور اسی بنا پر نابھاجی نے ترنجن کو زنان خانے کا باغ ہی لکھا ہے اور یہ طول کلام سارا اسی ایک بات کے لیے تھا کہ آئیسی بولی میں ترجن (Trjanna) سے درختوں کے جھنڈ ہی مراد تھے اور Hun sat milli Trjanna سے مراد ہے "وہ درختوں میں بیٹھی"۔ آپ چاہیں تو میں کو تیسرے لفظ سے ملالیں کہ ملنا میں میں کی مہک موجود ہوتی ہے اور انگریزی میں یہ Among کا ہم معنی ہے اور باغ سے کبھی آج والے باغ مراد نہیں تھے، درختوں کے جھنڈ ہی مراد تھے۔

اب ایک اور لفظ Kveda کو لیجیے۔ اس سے مراد ہے کھو اور اگر اس صوتی چلن کو سامنے رکھیں کہ و اکثر ب سے بدل جاتی ہے تو یہ لفظ بآسانی کبت بن جاتا ہے کیوں کہ د ، ت بھی عام صوتی اسلوب ہے۔ اردو سائنس بورڈ کی شائع کردہ پنجابی اردو لغت میں کبت کو شعر، بیت، نظم اور پنجابی کی ایک صنف سخن لکھا ہے اور کبتا کو کوتا ہی کا ایک روپ۔ یہ لفظ کتنی دور سے اور نہ جانے کب سے اسی طرح ادھر آیا ہوا ہے جس

طرح میرے خیال میں کافی کا لفظ آیا ہے۔ کافی کیا ہے اس کی تفصیل اور تشریح مشہور محقق آصف خاں صاحب نے کافیاں شاہ حسین کے دیباچے میں برسوں پہلے کی تھی اور بات کسی کھوج کار کی جانب سے اس سے آگے نہیں بڑھ سکی جس میں اپنا نکتہ اختلاف میں نے اسی قدر بڑھایا تھا کہ کافی میں ف اصل میں واؤ کی بدلی ہوئی صورت ہے اور جس طرح کوتا • کہتا ہے، اسی طرح کافی • کاوی ہے اور کاوی وہی ہے جسے ہم کاویتا کے روپ میں عرصہ سے جانتے ہیں۔ یہاں میں اس قدر اور اضافہ کرنا چاہتا ہوں کہ آئیسی زبان میں اسی لفظ کافی (Kafi) سے باب (Chapter) اور ٹکڑا (Section) مراد ہے اور چونکہ اس لفظ کے عرب و عجم سے شمال کو جانے کا (بالخصوص وادیٔ سندھ سے) کوئی تاریخی اور ادبی حوالہ نہیں ہے اس لیے اہل تحقیق کو فراخ دلی سے کام لیتے ہوئے یہ جاننے کی کوشش کرنی چاہیے کہ یہ لفظ شمال سے جنوب کو کب آیا اور کیسے آیا۔ بلکہ کافی کے ایک اور مفہوم پر بھی سوچیں جس میں اس سے پانی مراد ہے اگر شراب سے مشروب خاص مراد ہو سکتا تھا تو کافی سے بھی قہوہ مفہوم ثانی کے طور پر مخصوص مشروب مراد لیا گیا ہوگا۔ اسی بنا پر میں نے اپنی کتاب PanjabScandan avian Language Contact میں لکھا تھا کہ کعبہ کافی (قہوہ • قہوی) ہی کا ہم اصل لفظ ہے اور اسے یہ نام اس لیے نہیں دیا گیا تھا کہ وہ مقام اونچی جگہ پر تھا اور مربع شکل میں بنایا گیا تھا جیسا کہ پرویز صاحب نے لغات القرآن میں بتایا ہے بلکہ اسے یہ نام اس چشمے کے باعث ملا تھا جس میں ماننے والوں کے علاوہ نہ ماننے والوں کے لیے بھی ایک کشش تھی۔

میں نے بکی کا سراغ اس جزیرہ میں پایا تھا۔ اب اس فقرے کو دیکھیے۔ Datta af Baki مفہوم ہے۔ "بکی یعنی گھوڑے سے گر پڑا"۔ af کو ہم فارسی از اور اردو "سے" کا ہم اصل سمجھ سکتے ہیں کہ از کی آخری آواز متحرک ہو کر ازے اور ازے • سے

بن جاتی ہے اور جس طرح فارسی میں از • زہو گیا اسی طرح زے • سے ہو گیا۔ جہاں تک پہلے لفظ کا تعلق ہے وہ پنجابی لفظ "ڈھٹھا" یعنی گرا کا اس قدر ہم اصل اور ہم معنی ہے کہ محتاج وضاحت نہیں اور یہی ایک لفظ دلیل ناطق ہے کہ آئیس لینڈ والے پنجاب میں آئے تھے اور میرے قیاس کے مطابق آریاؤں سے کہیں پہلے اور وہ اٹک کی جانب بھی گئے تھے کہ اس کے قریب ایک جگہ ہٹیاں ہے جس کا معروف مفہوم نہیں بنتا لیکن جب ہم دیکھیں کہ Hatt سے آئیسی بولی میں رستہ مراد ہے تو اس سر راہ بستی کے نام کی عقدہ کشائی ہو جاتی ہے۔ اسی زبان کا ایک لفظ Mer ہے جس سے "مجھے" بھی مراد ہے اور "میں" بھی اور اس کا میر اور میرا سے تعلق بنتا ہے۔ اس قسم کا تعلق مجھے قدیم پنجابی لفظ لون سے ملا جسے لُون یعنی نمک سمجھا جاتا ہے۔ بابا فریدؒ کا ایک شعر ہے:

اکناں آٹا اگلا اکناں ملے ناہ لون

اگے گیاں سنجا پسی چوٹاں کھاسی کون[10]

گون سے لون کے لُون ہونے کا قرینہ نکلتا ہے اور آئیسی زبان میں Laun سے مراد ہے اجر اور تنخواہ۔ اس لفظ سے آگاہی کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ فریدی شلوک میں آئیسی لفظ ہی برتا گیا ہے۔ اس جزیرہ کی بات کو میں ترنجن کی طرح کے ایک اور رنگین لفظ پر ختم کرتا ہوں اور وہ ہے عشق۔ اس کے اشتقاقات اسے عربی لفظ بتاتے ہیں لیکن کسی عربی لغت میں مجھے اس کا قابل قبول مفہوم نہیں ملا۔ آئیسی بولی میں Oska سے خواہش کرنا، چاہنا مراد ہے اور اس مفہوم کو میں نے عشق کی داخلی کیفیت کے بہت قریب پایا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ لفظ ادھر ہی سے آیا ہے۔

میں اس جزیرہ نما کی بات ختم کرنا چاہتا تھا کہ ایک داستان دامن گیر ہونے لگی اور وہ ہے شیریں فرہاد کی داستان محبت، جو آئیس لینڈ سے شاید ہماری طرف آئی اور

تبدیلیوں کے ساتھ کہ شاعر کہیں بھی اور کبھی بھی نقال نہیں ہوئے ہیں، خلاق ہوئے ہیں۔ اس داستان کا آغاز یوں ہوتا ہے کہ ان ایام میں جب جارل ہاکن کی ناروے پر حکمرانی تھی، آئس لینڈ کا ایک شخص (درمُند نامی) سرکار کو سلام کرنے کے لیے آیا اور یہ خواہش کی کہ یہاں سے دو جانباز اپنے ساتھ لے جائے۔ یہ بات اس شرط پر مان لی گئی کہ ان جانبازوں کو حق ہوگا کہ معاوضے میں کوئی بھی ایسا تقاضا کریں جس کو پورا کرنا ناممکن نہ ہو۔ آئس لینڈ میں آتے ہی ایک کی طرف سے کیا گیا تقاضا پورا کرنا دشوار تھا۔ اس دشواری میں قدرے آسانی پیدا کرنے کی غرض سے درمند نے دونوں کو اپنے بھائی کی طرف بھیج دیا جس کی ایک بہت خوبصورت بیٹی تھی اور ایک جانباز اس پر دل ہار بیٹھا۔ حالات کی نزاکت کو سامنے رکھتے ہوئے عاشق زار کو بتایا گیا کہ دوستوں سے مشورہ کیے بغیر کوئی نہ ہاں ممکن نہیں اور اس غرض کے لیے "اس دیسا" کا باپ ایک اور جگہ ایک شخص سنور کے پاس گیا اور طے یہ پایا کہ جانباز کی بات اس شرط پر مان لی جائے گی کہ وہ اپنے بھائی کے ساتھ مل کر برزباف کی لاوائی چٹانوں میں سڑک کھود نکالیں۔ دونوں نے یہ سڑک تو کھود نکالی لیکن دونوں ایک خفیہ زمین دوز غسل خانے کا لقمہ بن گئے جو اس طرح بنایا گیا تھا کہ ایک پل میں اسے ابلتے کھولتے پانی سے بھرا جا سکتا تھا۔ ان کے اس انجام کے بعد اس دیسا کی سنور سے شادی کر دی گئی۔

گزشتہ صدی میں ناکافی وسائل کے ساتھ اُدھر کا سفر کرنے والے ایک انگریز لارڈ ڈفرن کے مطابق اس ملک میں مشرقیت مہکتی ہے اور آئس لینڈ میں گھوم پھر کر بار بار مشرق یاد آتا ہے۔ یہ لوگ خیمہ باش تھے اور داستاں طراز بھی تھے جس کا ایک نمونہ اوپر پیش کیا گیا ہے۔ لارڈ ڈفرن کا کہنا ہے کہ ان کے مزاج میں شعریت اور شعر سازی تھی۔ یورپی اقوام میں سے یہ کریڈٹ ان ہی کو جاتا ہے کہ وہ مقامی ادب کے خالق تھے اور ناروے کے تقریباً سارے قدیم دست نوشت آئیسی زبان میں ہیں۔ ساحتی جائزوں کا

سہرا بھی ان کے سر ہے اور ناممکن نہیں ہے کہ وہی لوگ ناروے سے ترک مکانی کر کے پہلے قریب ترین جزیرے میں جا بسے ہوں اور پھر وہاں سے وادی سندھ میں آ کر ان ہی کے کسی قبیلے نے ویدرَچے ہوں کہ شعری تخلیق کی یہ روایت یورپ بھر میں نہیں ملتی۔ مہا بھارت اور رامائن کی طرز کی کسی اور عظیم تخلیق کا ہمیں کسی شمالی خطے میں حوالہ اشارہ نہیں ملتا۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ افلاطونی مزاج کے بعض شمالی دانشوروں نے شعر و ادب کو دانش کدوں کے لیے ضروری نہ جان کر ان سے دوری اختیار کی ہو اور یوں بالائی شمالی خطوں میں ایک فکری دیوار کھڑی ہو گئی ہو جس کے ایک طرف میری سوچ کے مطابق دراوڑ تھے اور دوسری طرف آریائی۔ میرا یہ قیاس اس بنیاد پر ہے کہ آریائی جنوب کی جانب ایران میں رکے یا ہندوستان میں یا بحیرۂ روم کی طرف گئے۔ ایک مذہبی رویہ ان میں موجود رہا لیکن یہ مذہبی رویہ معروف معنوں میں غیر آریائی شمالیوں میں نہیں تھا اور اگر چند سال پہلے کی ایک کتاب کو مناسب اہمیت دی جائے جس کے مصنف ڈاکٹر جولی نے سینکڑوں دراوڑی اور چینی لفظوں کی ہم اصلی کا سراغ لیا ہے تو یہ بھی قیاس کیا جا سکتا ہے کہ دراوڑ لوگ پوری ہمالائی پٹی میں سے راہ یابی کے مطابق ہمالہ کے اس پار پھیل گئے تھے اور بس گئے تھے لیکن ان میں اپنے فطری میلانات کو بے مہار ہونے سے بچانے والی شخصیتوں اور کتابوں کے نہ ہونے کے باعث وہ آریاؤں کی آمد سے پہلے ہی اپنے منطقی مادی انجام کو پہنچ چکے تھے۔ شمشیر و سناں اول طاؤس و رباب آخر۔ ان کی مادی ترقی ہر ترقی یافتہ قوم کی طرح مادی خود غرضی کو جنم دے کر ان کے زوال کا باعث بنی ہو گی[1]۔ دراوڑ قوم کا اصل نام میرے خیال میں دراوج تھا جیسے آریاناوج

۱۔ آج سے ربع صدی پہلے ماسکو میں چھپنے والی ایک کتاب "اے ہسٹری آف انڈیا" میں وادیٔ سندھ کے شہروں کے زوال کا ذکر کرتے ہوئے لکھا گیا ہے کہ جدید تر تحقیق کے مطابق کسی بیرونی قبائل کی آمد سے پہلے ہی بہت سے شہر داخلی وجوہات کی بنا پر ناپیدی کی صورت دیکھ چکے تھے ان وجوہات میں

______ بقیہ فٹ نوٹ اگلے صفحہ پر

ایک خطے کا نام تھا اور ناروج ایک اور شمالی خطے کا۔ یہی وجہ بعد میں واد اور آباد بن کر بستیوں کی شناخت بنا۔ اور ابھی تک کتنی بستیوں کا حصہ ہے۔ ان تینوں میں سے بھی ناروج (ناروجو) کو میں آب دوستوں کا علاقہ گردانتا ہوں۔ آریاناوج والوں کو زراعت دوست اور دراوجوں کو درخت دوست سمجھتا ہوں اور اسی حوالے سے مال پال۔ کہ ڈھور ہمارے پاکستانی مفہوم میں سیکنڈے نیویا کے بیشتر ممالک کا مشترک لفظ ہے اور آب دوستوں یعنی ملاحوں نے ان کے کاروبار کے حوالے سے ان کو یوں موسوم کیا ہوگا۔ یہ میرا قیاس ہے اور تحقیق کا محتاج۔ بنیاد قیاس یہ ہے کہ ٹی برو اور ایم بی ایمینیٹو کی دراوڑی ڈکشنری میں نہ دراوڑ لفظ ملا ہے اور نہ ہی ڈھور۔ ہاں ٹوڑو (گائیوں کا گلہ) ضرور ملا ہے جو ڈٹ کے مطابق ڈھور کا متبادل تو ہو سکتا ہے لیکن یہ صوتی تبادلہ جنوب میں جا کر ہوا تھا۔

ماضی کے آثار الفاظ کے سوا سب ناپائیدار ہوتے ہیں اور لفظوں کے حوالے سے ہمیں وادیٔ سندھ کی جنوب سے جو سانجھ ملتی ہے وہ بہت عیاں ہے۔ اسی سے اندازہ ہوتا ہے کہ بیرونی دباؤ کے باعث یا کم سرد فصلوں کی طلب شمالیوں کو جنوب کی طرف لے گئی ہوگی۔ اس کا ایک ثبوت ہمیں مدراس سے ملتا ہے جہاں کے پتھری کلہاڑے کھدائیوں میں خاص اہمیت کے مالک تو چلے آئے ہیں لیکن یہ نام بھی کم اہم

بقیہ: فٹ نوٹ

سے زمین کے ٹکرا جانے کے ساتھ ساتھ طوفانوں اور راجپوتانہ کے صحرا کی چیرہ دستیوں اور دریائے سندھ کے رخ بدلنے کو بھی شمار کیا گیا ہے۔ بعض نے زمین میں پیدا ہونے والی تبدیلیوں کو اس تباہی کا ذمہ دار ٹھہرایا ہے۔ اسی کتاب میں مذکور ہے کہ لوگوں میں عدم مساوات بھی بہت تھی۔ امیروں اور غریبوں کی باشاہوں ہی میں تفاوت نہیں تھا، ان کی دفن گاہوں میں بھی تھا اور نابرابری والا معاشرہ آخر اپنے داخلی تضادات کا شکار ہو جاتا ہے جب ان میں کوئی نذیر یا بشیر بھی نہ ہو۔

نہیں کہ مدراس اسمتوئی زبان کا لفظ ہے اور اس سے ملاح مراد ہے اور کسی جنوبی زبان میں اس کا کوئی مفہوم نہ ہونا بتاتا ہے کہ یہ لفظ اپنے بولنے والوں کے ساتھ ادھر آیا ہوگا کہ سرما زدہ لوگوں کے لیے کل بھی دھوپ ایک نعمت تھی اور آج کی سہولتوں کے باوجود شمالی خطوں کے لوگوں کی تمنا یہی ہوتی ہے کہ دھوپ دیس کا چکر لگائیں اور شاید اسی لیے سویڈن کو جو سکینڈے نیویا کے باقی خطوں سے جنوب یعنی دھوپ کی جانب ہے سورگ کہا جاتا ہے جس سے ہمارے یہاں جنت مراد لیا جاتا ہے اور دلچسپ بات یہ ہے کہ اس سورگ کو Svayryuh اُچارا جاتا ہے جو ہماری سویر سے بہت مختلف نہیں اور سورگ سرگی یعنی سحری کے بہت قریب ہے۔ سویڈن کو سویزیا بھی اچارا جاتا ہے جس سے اشارہ ملتا ہے کہ سویز کو یہ نام اس لیے دیا گیا تھا کہ یہ جگہ یورپ سے جنوب میں تھی اور دھوپ نگر سے رابطہ پیدا کر دیتی تھی یا کم سے کم اٹلی سے جہاں سویڈن کو بھی Sveiga ہی لکھا اور بولا جاتا ہے۔ لیکن اگر صوتی تبادلوں کی مزاج شناسی کریں تو گ • ج کا چلن بھی ہم کو بعض جگہوں اور قوموں میں ملتا ہے۔ اور سورگ باسانی سورج بن کر دھوپ کے سرچشمے کی صورت میں سامنے آجاتا ہے شاید اسی لیے جہاں زرتشیوں میں جنوب کو روشنی کی جگہ اور جنت کہا گیا ہے وہاں ناروی زبان میں مندر (Sondre) سے دکنی مراد ہے لیکن ہمارے خطے میں اس کا اپنا ہی ثانوی مفہوم صدیوں سے چلا آیا ہے۔ سدھر میں بھی South کا حوالہ ہے (تھ • د)۔

آٹا جو ہم میں سے ہر ایک کی ضرورت ہے سویڈنی لفظ ہے لیکن اس سے کھانا مراد ہے اور اسے خوردنی ہونے کے باعث ہی یہ نام دیا گیا اور ظاہر ہے کہ سویڈنیوں نے۔ بج بھی سویڈش میں دعا کرنے کا مفہوم دیتا ہے جس کی ایک صورت بھجن ہمارے الفاظ کا حصہ ہے۔ یہی نہیں بٹہ (Beta) سے چرنا مراد ہے جو پٹھہ کے روپ میں پنجاب کی بولی کا حصہ ہے (ب • پ)۔ یہی بات بوجھ کی ہے جس کی نامزدگی کا عقدہ

سویڈش لفظ سے کھلتا ہے کہ وہاں بوج (Boj) سے جھک جانا مراد ہے اور بوجھ میں جھکا دینے کا حوالہ ملتا ہے۔۔ ڈیگر ایک اور ایسا ہی لفظ ہے جسے ہم نے دیگر سے جوڑا ہوا ہے۔ لیکن سویڈش میں اس سے روشنی مراد ہے اور میرے خیال میں ڈیگر سے دن ہونے کی آخری نماز مراد تھی۔ اسی حرف تہجی کا ایک لفظ ڈمی ہے جس سے مراد ہے چھاتی سے دودھ پلانا اور دمی یعنی بیٹی۔ یہی لفظ بانڈک تصرف ہے کہ اولاد میں سے دھی سے مراد وہ تھی کل جو دودھ والی بنے گی بلکہ دودھ بھی اسی لفظ سے ہے اور ناروی لفظ Die بھی جس سے شیرمادر مراد ہے اور جس کا حوالہ ہمیں دایہ میں ملتا ہے۔ لیکن کل یعنی رکیل تو اسی رنگ میں سویڈنی زبان کا حصہ ہے اور ککڑ (Kokr) بھی۔ ترنجن کی طرح سویڈن کا ایک لفظ بھی عناں گیر ہوتا ہے اور وہ ہے Maka۔ اس سے مراد بیوی ہے۔ اور یوں یہ لفظ میکے کا ایک نیا مفہوم سامنے لاتا ہے کہ اس میں ماں کا حوالہ نہیں بیوی کا اپنا حوالہ ہے کہ یعنی وہ جگہ جہاں بیوی نے جنم لیا اور جوان ہوئی۔ ماتا بھی ہمارے یہاں اجنبی لفظ نہیں ہے لیکن ماں کو ماتا کیوں کہا جاتا ہے یہ گتھی بھی سویڈنی لفظ سے کھلتی ہے جہاں Mat سے غذا مراد ہے اور ماتا وہ ہے جو غذا دیتی ہے۔ ویسے موٹا بھی اس کا ہم اصل ہے کہ موٹاپے کو خوب کھانے کا ثمر گنا جاتا ہے۔ مٹھا (میٹھا) میں بھی غذائی حوالہ ہے اور مٹر کو بھی اسی لیے یہ نام ملا ہوگا۔ مٹ کے ساتھ Matta سامنے آجاتا ہے جس سے مقصد مراد ہے اور متا پکانا یہی لفظ ہے۔ م کے بعد ن کی طرف آئیں تو ناگ سامنے آجاتا ہے اور اس کے یوں موسوم ہونے کا حوالہ بھی سویڈن میں ملتا ہے۔ جہاں اس سے چبھنا چبھونا مراد ہے اور ناگ کو ڈسنے کے حوالے سے یہ نام دیا گیا ہوگا۔ جس طرح ندی کو نیچے کی طرف بہنے سے کہ سویڈش بولی میں (Nedie) سے نچان مراد ہے۔ اسی پٹی کا ایک لفظ "نی" ہے جس کا مفہوم سویڈش بولی میں تو اور تم ہے اور اسی سے وضاحت ہوتی ہے کہ نی کو پنجابی میں نی کیوں کہا گیا اور کن لوگوں

نے اسے یہاں کے ذخیرۂ الفاظ کا حصہ بنایا۔ اس لفظ کی طرح اک اور لفظ ہے "سالو" جس سے مجیٹھی رنگ کا وہ دوپٹہ مراد تھا جو ہندو لڑکیاں بیاہ کی پھیرے لگانے کی رسم کی وقت اوڑھا کرتی ہیں۔ سویڈش بولی میں اس سے بِکنا مراد ہے کہ لڑکیوں کو بیچنے کا عام دستور تھا اور یہ دوپٹہ اس کا اظہار ہوتا تھا کہ یہ بیچی جا چکی ہے۔ سالا اور سالی میں بھی یہ بیچنے کا حوالہ ہے کہ فروخت شدہ کا وہ بھائی ہے یا اس کی بہن ہے۔ ویلا (وقت) کے دو مرکب بھی سویڈش بولی میں ملتے ہیں۔ سویل اور کویل۔ اول الذکر یعنی Sval سے ٹھنڈا مراد ہے اور یہاں بھی پہلا پہر ٹھنڈا گنا جاتا ہے۔ آخر الذکر سے سویڈش میں شام مراد ہے اور ہمارے یہاں بے وقتی کا اس میں حوالہ ہے۔ یاد رہے کہ ک میں منفی پہلو پایا جاتا ہے اور یہ مسافتی لفظ ہو گیا ہو گا کہ اب سفر پر جانے کا وقت نہیں رہا۔ اسی بٹی میں ایک لفظ Sveda ہے جس سے جلا ڈالنا مراد ہے۔ یہ لفظ میرے قیاس کے مطابق سفیدہ کا ایک روپ ہے اور سفیدہ اس جگہ کو کہتے ہیں جو تعمیر شدہ نہ ہو اور قدیم اقوام میں جگہ کو خالی کرنے بنانے کا ایک ہی آسان طریقہ تھا کہ وہاں موجود درختوں کو جلا کر راکھ کر دیا جائے۔

ٹ کی طرف آئیں تو Tom توجہ طلب ہوتا ہے اس سے مراد ہے خالی۔ اور اسی سے پتہ چلتا ہے کہ تُمہ کو اندر سے خالی ہونے کے باعث یہ نام ملا اور تنبو کو بھی بلکہ اندر سے خالی کیے گئے کدو سے بنائے گئے ساز کو بھی تونبا اسی بنا پر کہا گیا۔ آپ چاہیں تو دست طمع سے خالی ہاتھ مراد لے سکتے ہیں۔ اسی بٹی کا ایک لفظ Topp بمعنی چوٹی ہے۔ جس سے ہم نے ٹوپی بنائی اور ٹوپی رکھ سے بھی اونچائی والا درخت زار مراد تھا جس کا نام بدل کر اس کا لسانی کھوج مٹا دیا گیا ہے اور کبھی اسے ایوب پارک بنایا اور کبھی نیشنل پارک۔ اسی بٹی کا ایک اور اہم لفظ ٹرنگر (Trangre) ہے جس سے تنگ تر مراد ہے۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ ستاروں کے ایک جھرمٹ کو ترنگڑ اس لیے کہا گیا تھا

کہ وہ عام ستاروں سے زیادہ ایک دوسرے کے قریب تھے اور ر۔ڑ۔ن کے صوتی چلن کے مطابق خیال ادھر جاتا ہے کہ ترنجن میں بھی درختوں کے قریب تر اُگے ہونے کا حوالہ ہوگا۔ اس قیاس کو تقویت اس سے ملتی ہے کہ گجرات کے نواح میں ایک جگہ کا نام ترینگڑ ہے جہاں کسی زمانے میں بہت درخت اگے ہوئے تھے۔ اب ایک اور لفظ کی طرف آتے ہیں۔ جسے فارسی میں تنور اور پنجابی میں تندور کہا جاتا ہے۔ کیوں؟ اس کا جواب ہمیں ڈنمارک لفظ Tande میں ملتا ہے جس سے آگ مراد ہے اور یوں تندور کو آگ کے حوالے سے یہ نام ملا اور یہ بھی واضح ہو گیا کہ فارسی لفظ میں دال کی آواز گر گئی تھی۔ اسی لفظ نے یہ عقدہ بھی وا کیا کہ باجرے کے سوکھے تنے کو ٹانڈا اس لیے کہتے تھے کہ وہ جلانے کے کام آتا تھا۔ اسی زبان میں ایک لفظ Tigge ہے جس سے بھیک مانگنا مراد ہے ادھر ہمارے یہاں مانگے تانگے کی ترکیب میں دوسرا لفظ عام طور پر مہمل گنا جاتا ہے حالانکہ وہ بھی ڈنمارک کی لفظ ہے اور بات میں زور پیدا کرنے کے لیے اس میں تکرار معنوی سے کام لیا گیا ہے۔

طول کلام سے بچنے کے لیے میں سکینڈے نیویا کے ایک اہم خطے فن لینڈ کی طرف آتا ہوں۔ اس کا ایک لفظ Ala ہے بمعنی رقبہ یا علاقہ اور پنجابی لفظ آلادوالا سے معنوی اور صوتی مناسبت رکھتا ہے بلکہ کوہالہ اور سہالہ میں بھی اس کا اشارہ موجودہ ہے۔ اسی طرح ase سے ہتھیار مراد ہے اور عصا (عاصا) میں بھی یہی حوالہ ہے کہ یہ انسان کے اولیں ہتھیاروں میں سے ایک تھا۔ اس لفظ سے یہ بھی کھلتا ہے کہ فن لینڈ والے وادی سندھ ہی میں نہیں آئے تھے، بحیرہ روم کی طرف بھی گئے تھے اور یوں لگتا ہے کہ اٹلی کو یہ نام انھوں نے ہی دیا تھا۔ کیوں کہ فن بولی میں etala جنوب کو کہتے ہیں اور اس لیے جنوبی امریکہ کو Etala Amerikka کہا بولا جاتا ہے اور یہ وہی لفظ ہے جو ہیٹھلا (یعنی نچلی جانب کا) کے روپ میں پاکستان کے سرمایہ الفاظ کا ایک حصہ ہے۔ بجا ایک

اور ایسا ہی لفظ ہے جس سے پھیلا دینا مراد ہے اور عربی سمیت اردو میں اس سے جوڑ کرنا مراد ہے جس میں ہر آواز کو دوسری آواز سے ملا دیا اور یوں پھیلا دیا جاتا ہے۔ اسی طرح جال سے اردو میں ماہی گیری کے کام آنے والی تناوٹ مراد ہے اور جالا سے فن میں بھی یہی مراد ہے بلکہ جوک (جونک) میں بھی اسی خطے کا حوالہ ہے کہ جوکی سے وہاں دریا مراد ہے جب کہ جوّک (جوق) سے ہماری طرح وہاں بھی ہجوم مراد لیا جاتا ہے بلکہ قیاس کہتا ہے کہ جورو بھی فن بولی کا لفظ ہے اور جُوری سے نئی نویلی مراد ہونا بتاتا ہے کہ کبھی اس سے گھر میں آنے والی نوواردہ مراد ہوگی۔ جاڑا سے ہم سردی اور سردی کا موسم مراد لیتے ہیں لیکن کیوں کا جواب فن لینڈ سے ملتا ہے جہاں جا سے برف مراد ہے اور جاڑا سے برف باری کی رُت مراد ہوگی اور جنوب میں آن کر یہ لفظ موسم سرما کے لیے بولا جانے لگا جس میں برف باری کا امکان ہوتا تھا۔ اسی سے جاوٗ بن گیا یعنی کسی جگہ رک جانا (ٹھہر جانا) اور جدڈا حرکت ناپسند کو ہمارے یہاں کہتے ہیں۔ اسی حوالے کے دو اور لفظ ہیں Jaähille اور Jatton۔ اول الذکر سے برف باری میں کام کرنا مراد ہے اور جاہل سے کبھی کوئی ایسا ہی عاقبت نااندیش مراد ہوگا اور اسی سے وہ ثانوی معنی بنے جو عربی کے ذریعے پنجاب میں آئے اور جس سے انسان کے بارے میں فرمان خداوندی کی وضاحت ہو جاتی ہے کہ بلاشبہ انسان ظلوم بھی تھا اور جاہل بھی کہ اس نے اپنے اندر نہ جھانکتے ہوئے بار امانت اٹھا لیا۔ دوسرا لفظ جتن ہے جس کا بنیادی مفہوم برف سے پاک کرنا ہے اور جتن سے کبھی اس سرد خطے کے حوالے سے گھر اور ارد گرد کو برف سے پاک کرنا ہی مراد ہوگا کہ جتن میں دشواری کا حوالہ ضرور اب بھی موجود ہے۔ ان دونوں کے ساتھ ایک اور لفظ سامنے آ گیا ہے۔ جاٹی جس سے منجمد کرنا مراد ہے اور چاٹی میرے خیال میں اسی لیے موسوم ہوئی کہ اس میں دودھ جم جانے کے عمل میں سے گزرتا ہے۔ اسی کے حوالے سے ایک اور لفظ سامنے آتا ہے۔ Kannu جس سے برتن مراد ہے اور جو گنی کے بہت قریب ہے۔ کرواس یعنی تلخ اور کڑوا بھی ہمارا مانوس لفظ ہے اور

کڑواس کا صوتی اور ہجائی روپ خالص اردو کا سا لگتا ہے۔ یہی صورت کسی حد تک Keto کی ہے جس سے کھیت مراد ہے اور جس میں کاٹنے کا حوالہ پنہاں ہے۔ ایسا ہی حوالہ کرکی (Karkea) میں ہے جس سے بلند مراد ہے اور کرسی (ک ۔ س) اسی ہی سے ہے۔ جس طرح کول یعنی پیالا میرے خیال میں Kulho ہی سے ہے کہ فن لینڈ میں اس سے پیالا ہی مراد ہے اور کتنے تعجب کی بات ہے، کاتنے کا حوالہ بھی ادھر ہی جائے۔ کیوں کہ Kuto سے بُننا مراد ہے اور Kuitu سے سوت اور ریشم۔ اس سے بھی زیادہ تعجب خیز ہے کہ گد گدانے کا پنجابی متبادل کُت کُت (کُتکتاری) بھی ادھر ہی سے آیا ہوا لگتا ہے کہ Kuta سے گد گدی مراد ہے اور اس سے بھی عجیب تر یہ کہ کنیز (Kaunis) سے مراد ہے خوبصورت۔ تو کیا اس میں یہ نکتہ مضمر ہے کہ لونڈیاں عام طور پر حسین ہی لی جاتی تھیں۔ کیمیا سے بھی ہماری طرح فن لینڈ میں بھی کیمسٹری مراد ہے اور کھوپرا سے خود، جس سے ہم نے کھوپری بھی بنالی اور کھوپڑ یعنی ہدوانہ کا بیرونی حصار بھی بلکہ کچھوے کو بھی اسی حوالے سے کھوپراکھا اور ناریل کے پھل کو کھوپا۔ یہی نہیں کھوتی کو بھی یہ نام اس لیے ملا کہ Kyyti سے سواری کرنا مراد ہے اور یہ جانور ہر کسی کی سواری کے صدیوں سے کام آرہا ہے۔

اوپر لُون کا ذکر آچکا ہے۔ فن میں اس کی صورت یوں ہے Lounas اور اس سے دوپہر کا کھانا مراد ہے جس سے یہ وضاحت بھی ہو جاتی ہے کہ فریدی لُون مفتوح ہی تھا اور اس میں نمک کا حوالہ نہیں تھا۔ اسی طرح ماکھیوں میں بھی اسی خطے کا حوالہ ہے کہ Makea سے میٹھا مراد ہے۔ ماکھیوں سے یاد آگیا کہ استھونی زبان میں مگس سے شہد مراد ہے اور مگس سے شہد والی مکھی اس کے ثانوی معنی ہیں۔ تو کیا ماہی بھی استھونی لفظ ہے جس سے وہاں نرم اور میٹھا مراد ہے۔ ماتم سے استھونی میں دفنانا مراد ہے (Matma) اور ہمارا مفہوم غالباً ثانوی ہے۔ موہلا گجرات کے قریب چناب کے

کنارے ایک گاؤں ہے جو پنجابی مشہور ادیب سجاد حیدر کی جنم جا ہے ادھر استھونی میں مولا سے پتوار مراد ہے اور ملاح لفظ کی اصل بظاہر اسی میں ہے۔ اسی خطے کا ایک لفظ nadu ہے جس سے خاوند کی بہن یعنی نند مراد ہے اور لگتا ہے کہ ن کی آواز اس میں دخیل ہے۔ اس پٹی کا ایک اور لفظ naha ہے جس میں جلدی حوالہ ہے اور ناخن اسی سے پھوٹا ہوا لفظ ہے۔ کیونکہ nahk سے استھونی میں جلد ہی مراد ہے اور ناخن میں جلد سے پھوٹنے کا حوالہ ہے۔ ایک اور استھونی لفظ کا ذکر بھی ضروری ہے اور وہ ہے Kahar اس سے شاخ دار اور جھاڑیل (Husky) ہونا مراد ہے۔ ادھر چکوال کے قریب ایک جگہ ہے کلر کہار۔ اس میں کلر سے بادشاہ مراد ہے (جیسے کلر سیداں) اور چوں کہ وہ جگہ جھاڑیوں اور درختوں کی بہتات والی ہے۔ اس لیے یہ قیاس بے جا نہیں کہ آج ہر چند ہماری مقامی بولی میں اس کا کوئی واضح مفہوم نہیں ہے لیکن کبھی یہ بھی با معنی استھونی لفظ ہوگا اور اپنے بولنے والوں کے ساتھ آ گیا ہوگا۔

ناروی زبان کے ایک لفظ سے ملتے ہوئے دو لفظ سامنے آ گئے ہیں۔ مالا اور مالی۔ دونوں ہی ہمارے ذخیرہ الفاظ کا حصہ ہیں لیکن کسی لغت سے ان کی جگونگی عیاں نہیں ہوتی اور اگر ہوتی ہے تو ناروے کی a اور o کے بین بین ہے۔ میرے خیال میں مالا اسی لفظ سے ہے اور مراد وہ چیز ہے جسے کچھ پڑھنے میں برتا جاتا ہے۔ ہماری لغاتوں میں اس سے پھولوں کا ہار مراد لیا جاتا ہے اور سبحہ یا تسبیح کو بطور متبادل لکھ دیا ہے لیکن یہ نہیں بتایا کہ لفظ میں پھولوں کا قرینہ کیسے نکل آیا۔ شاید اس طرح کہ مالی سے انھوں نے باغبان مراد لے لیا۔ یہاں بھی مال سے پودوں یا پھولوں کے ہونے کی کوئی مثال نہیں دی گئی اور ثانوی مفہوم ہی کو ابتدائی مفہوم بھی سمجھ لیا۔ اصل میں مالی سے باغ کا مالک نہیں رکھوالا مراد تھا اور یہ اس کی ذمہ داریوں میں تھا کہ وہ شر دشمن پرندوں سے اس کی حفاظت کرتا رہے۔ یہ کام وہ دو طرح سے کرتا تھا۔ درختوں پر پرندوں کو بیٹھنے اور

گھونسلے بنانے سے روکنے کی صورت میں اور آوازیں لگا لگا کر پرندوں کو ڈرانے اڑانے کی صورت میں کہ ڈرانے اڑانے کے ساتھ ایک آدھ گولی بھی غلیل سے چلادی جاتی تھی جس سے آواز اور گولی لازم و ملزوم تصور کر لیے گئے۔ مالی سے یہاں رکھوالے کی آواز پاشی کی طرف اشارہ اور حوالہ جاتا ہے یعنی وہ شخص جو باغ میں آواز پاشی کرتا رہتا ہے، باغ کے حوالے سے ایک اور لفظ گانا ذہن میں آ جاتا ہے جس کو اس نام سے موسوم کرنے کا پتہ بھی ہمیں ایک ناروی لفظ gane سے چلتا ہے جس سے گلا مراد ہے اور جو خود بھی ل = ن کے دستور کے مطابق ناروی لفظ ہی کا ایک روپ ہے اور گانا سے وہ آواز مراد ہے جو گلے سے نکلتی ہے۔ یہ ناروی لفظ گاتی میں موجود ہے جس سے بعض پرندوں خصوصاً طوطوں اور فاختاؤں کے حلقہ ہائے گردن مراد ہیں۔

سطور بالا میں متعدد مقامی الفاظ کی تفہیم شمالی توجیہات کے سہارے کی گئی ہے اور اس کی بنیادی وجہ میرے نزدیک یہ ہے کہ سردی کا مقابلہ کرنے کے وسائل کی کمی کے قدیم ایام میں شمالیوں کا جنوب کو رُخ کرنا اسی قدر قدرتی اور فطرتی تھا جس قدر یہاں کے بے وسیلہ لوگوں کا سردیوں میں دھوپ کی تلاش میں چار دیواریوں سے باہر نکل آنا۔ پھر ارضی تغیرات و تبدلات بھی قدیم ایام میں اپنی منواتے تھے اور زلزلے آج سے کہیں زیادہ من مانی کرتے تھے اور جل کو تھل تو تھل کو جل کر جاتے ہوں گے۔ اس ہوں گے کا سراغ آج سے چند سال پہلے کینیڈا کے ایک سائنس دان نے اس وقت لگایا جب اس نے کھدائی کرواتے ہوئے قطب شمالی سے سات سو میل کینیڈا کی جانب ایک جزیرہ میں منجمد جنگل کھود نکالا اور وہ جنگل سالخوردہ نہیں تھا۔ درختوں کے حلقے صاف دکھائی دیتے تھے اور ان میں تازہ کاٹے گئے درختوں کی سی تازگی تھی۔ یہ درخت ایک ایسی آب و ہوا کا پتہ دے رہے تھے جب وہاں ان کے لیے موزوں گرمی کا کال نہ تھا۔ اور جہاں جنگل تھے، وہاں انسان بھی ہوں گے اور ڈھور ڈنگر بھی اور ناممکن

نہیں کہ کل کسی اور کھدائی میں کوئی ایسے حروف اور الفاظ مل جائیں جو ہڑپہ اور موہنجودڑو کے خاموش الفاظ کو گویا کر جائیں۔ اس کھدائی کی رپورٹ میں نے رسالہ ٹائمز کے ۲۲ ستمبر ۱۹۸۶ء کے شمارہ میں پڑھی تھی جس سے میری اس خطہ میں لسانی دلچسپی بڑھ گئی کہ اس سے بہت پہلے (اس صدی کے ربع اول میں) ہندوستان کی ایک معروف سیاسی اور علمی شخصیت بال گنگادھر تلک نے اپنی ایک تصنیف The Arctic Home in Vedas میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ رگ وید آریاؤں کے بحر منجمد شمالی کے باسی ہونے کی علامتی داستان ہے اور اس جستجو میں میں نے اس خطہ کے سینکڑوں لفظوں کو آشنا پایا اور میں سمجھتا ہوں کہ پاکستانی اردو کے خدوخال پہچاننے کے لیے اس خطہ کے ذخیرۂ الفاظ سے آگاہی بہت ضروری ہے ورنہ آپ خدوخال کی جان بننے والے کتنے ہی لفظوں کی اس مہک سے بے لذت رہیں گے جو اچانک کسی شناسا کو کسی اجنبی دیس میں دیکھ کر سواد جاں کو معطر کر جاتی ہے۔ روٹی کے موجودہ ثانوی مفہوم کو جاننے کے ساتھ یہ جاننا بھی دلچسپ ہو جاتا ہے کہ یہ لفظ کہاں سے چل کر کہاں آیا اور اس کے لیے آپ کو روسی ڈکشنری میں سے گزرنا پڑتا ہے جہاں ایک جگہ آپ روٹ لکھا ہوا پائیں گے اور آگے لکھا ہو گا کہ اس سے منہ مراد ہے۔ یوں روٹی وہ چیز ہے جو منہ میں ڈالی جاتی ہے۔ یہاں بھی آپ کو راٹھ ملے گا جس سے میزبان مراد ہے یعنی جو آپ کی زبان نوازی کرتا ہے اور پھر آپ قیاس سے کام لے کر روٹھنا سے ترک کلام کرنا کے مفہوم کی طرف چلے جائیں گے۔

روٹی سے ایک اور کھانے کی چیز سامنے آ گئی اور وہ ہے میوہ لیکن اس کو یوں موسوم کرنے کا پتہ ڈنمارک میں ملتا ہے جس کی بولی میں Mave سے معدہ مراد ہے اور یوں میوا سے معدہ تک پہنچائی جانے والی کوئی چیز مراد تھی اور چونکہ وہ درختوں کے پھل ہی ہوتے تھے، اس لیے ان پھلوں کو میوا کہا گیا۔ اور عربی میں جو ماوا سے پناہ گاہ یا باشگاہ

مراد ہے، اس کے پیچھے بھی یہی شجری اور شری حوالہ ہے اور یہ اشارہ بھی کہ ڈنمار کی وادیٔ سندھ میں نہیں آئے تھے ان کے بعض بھائی بند بحیرہ روم کی طرف بھی چلے گئے تھے اور اسی لیے مجھے اس پر اصرار ہے کہ کعبہ کو یہ نام پانی کی جگہ ہونے کے حوالے سے دیا گیا تھا۔ لیکن بات روسی زبان کی ہو رہی تھی اور اس کا ایک اور لفظ اسی قدر اہم ہے جس قدر روٹ (روٹی) تھا۔ ترانہ کا لفظ ہم میں سے ہر ایک کا مانوس لفظ ہے خصوصاً جب سے اس خطے کو ایک مخصوص نام ملا اور ایک مخصوص ترانہ اور چونکہ اسے گا کر بولا جاتا ہے اس لیے یہ گانے کے بہت قریب چلا گیا ہے بلکہ فارسی میں بھی اس سے نغمہ و سرود مراد ہے اور ہم بھی اسے تان کا ہم اصل گنتے ہیں۔ حالانکہ اس کی اصل روسی لغت کے مطابق تران بمعنی حملہ بلکہ کامیاب حملہ سے اور ترانا میں کامیاب حملے کی خوشی کا اظہار پنہاں تھا جو مرد میدان کے سامنے گا کر کیا جاتا تھا۔ عجیب بات ہے کہ نابر سے بھی روسی میں حملہ مراد ہے جب کہ ہمارے یہاں اس سے بغاوت کر دینا مراد ہے جس کا اظہار حملہ آوری کی صورت میں ہوا کرتا تھا۔ تران سے پنجابی میں توانائی مراد ہے جو حملہ کرنے کی ضروری شرط ہوتی تھی اور تان سے روسی میں رقص مراد ہے جو گانے کا ضروری حصہ ہوا کرتا تھا بلکہ آج بھی ہے۔

سیکنڈے نیویا ایسے دور افتادہ خطے کی طرح انگلستان کا ایک بغلی خطہ بھی لسانی حوالہ سے بے توجہی کا شکار ہے کہ ہم اکثر اپنی علمی ادبی دلچسپیوں کو بھی سیاسی لگام سے ہلاتے ہیں ورنہ اس کی لغت کا ایک ابتدائی لفظ abairt ہمیں خوش آمدید کہتا ہوا ملتا ہے جس سے فقرہ مراد ہے اور وہ عبارت ہی کا ہم اصل لگتا ہے لیکن پڑوسی انگریزی کے ذخیرۂ الفاظ کا حصہ نہیں ہے۔ اسی طرح عقلئی (aclai) ہے جس سے لچکیلا مراد ہے اور عقل کا ایک ہی کام ہے کہ وہ بے لچک نہیں رہنے دیتی۔ آن سے آئرش میں بھی ہماری طرح اسی چمکداری کا حوالہ ہے جو آن بان شان میں ملتی ہے اور Baire وہی لفظ

ہے جو یہاں بَیر کے رنگ میں موجود ہے اور عہد بمعنی قسم بھی آئرش لغت کا حصہ ہے جو اس کا ناتا عربی سے جوڑ دیتا ہے تو Civide (کٹھن اور بات ہی کے معنوں میں) اسے کبت کے قریب لے آتا ہے (د = ب + ڈ = ت)۔ اسی طرح dic سے وہاں دیوار مراد ہے تو ڈکا سے روک اور رکاوٹ اور Eard سے ارض جس سے یہ لفظ بحیرۂ روم کی طرف بھی ہمیں لے جاتا ہے تو اردماگدھی کی ترکیب اسے پاک بھارت کی طرف لے آتی ہے کہ ہر چند گنگا جمنا کی ترائی میں بولی جانے والی اس زبان کو بعض کے خیال میں اردھ ماگدھی اس لیے کہا گیا کہ اس خطے کے ایک حصے میں ماگدھی رائج تھی اور دوسرے میں شور سینی اور ان دونوں کی درمیانی زبانوں کو اردھ ماگدھی کہا گیا۔ لیکن چونکہ لفظوں کا لین دین اور سمجھوتا تکڑی تول نہیں ہوتا اس لیے میرے خیال میں اردماگدھی سے مراد ہے عظیم ماگدھی زبان اور یہ نام آس پاس کے حوالے سے مگدھ کی بالادستی کا اعتراف بھی تھا اور اعلان بھی۔ اور اگر مگدھ اور مقدونیہ (مگدونیہ) میں کوئی سانجھ ممکن ہے تو ارد اور آئرش ارد میں بھی ممکن ہے جس میں اس کے ستر کے قریب مرکبات میں عظمت اور بڑائی کا کوئی نہ کوئی اشارہ ملتا ہے اور ہائی کورٹ کو وہاں ارد کورٹ کہتے ہیں اور ارڈری سے شاہ اعظم مراد ہے جس میں رَے وہی ہے جو رائے کے روپ میں ہمارا جانا پہچانا لفظ ہے۔ اردشیر ایک فارسی حکمران کے نام میں بھی یہی بزرگی موجود ہے اور اردبیل سے آئرش میں صدر مقام مراد ہے جبکہ اردولک میں وہی خودسری اور خودپرستی موجود ہے جو وردی سے ہمیشہ مخصوص رہی ہے۔

یوں اردو سے لشکری زبان نہیں بلکہ شاہی زبان مراد لینا شاید زیادہ مناسب رہے کہ اردو کو لشکر کہنے میں اردیعنی شاہ سے متعلق ہونے کا حوالہ پنہاں ہے۔ اردو مفرد لفظ نہیں ارد + و سے مرکب ہے اور خود آئرش میں بھی Ardu کی صورت میں موجود ہے اور اسے ardaigh کا اسم فعل بتایا گیا ہے جس سے بلند لے جانا مراد ہے اور لشکری

ہونا مصاحب شاہ کے تعلق کی بنا پر وہ کتنا بھی معمولی کیوں نہ ہو ہر دور میں بلندی کا حوالہ ضرور رکھتا تھا۔ رہی یہ بات کہ ارد مفتوح ہے اور اُردو مضموم تو اس قسم کے اعرابی تبادلے عام صوتی چلن رہے ہیں اور انگریزی میں Word کی پہلی آواز واضح طور پر مضموم نہیں ہے بلکہ مفتوح بھی نہیں ہے جبکہ اس کی سکینڈے نیویائی صورت Ord میں جھکاؤ پیش کی طرف جاتا ہے لیکن صوتی مماثلت کی بنا پر دونوں میں شاید مماثلت معنوی کا سراغ نہ لگ سکے جب تک یہ نہ مان لیا جائے کہ اس میں آخری آواز مقامی حوالے سے اُرد کا حصہ بن گئی تھی اور ڈاکٹر جمیل جالبی اور بعض دیگر لسانی مفکروں کے اس قیاس کے باوجود کہ جہاں بھی مختلف بولیاں بولنے والوں کا میل جول ہوا ایک ملی جلی سی نئی بولی وجود میں آنے لگی میں یہ کہوں گا کہ میل جول کا وہ مرکز بازار کے علاوہ دربار بھی ہوتا تھا اور اہل دربار کی باہمی غیر درباری ملاقاتیں بھی اور اردو زبان اُرد بازاروں کے علاوہ باقی مقامات کی ملاقاتوں سے بھی پروان چڑھی اور اس کے صورت گر چونکہ صاحب علم نہیں تھے صاحب سیف و قوت تھے اور ان کے خاندانوں کی ترکی اور فارسی ان سے پہلے ہی تمام ہو جاتی تھی۔ ان کے میل ملاپ سے ایک عرصہ تک لفظوں کی جو کھچڑی پکتی رہی اس پر بھی یہ پھبتی کسی گئی تھی کہ اک بات لچر سی بزبان دکنی ہے اور اسے وہ زبان بننے تک بہت وقت لگا جب داغ نے فخر سے کہا تھا کہ سارے جہاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے۔

آج کے حوالے سے لیکن اس تحقیق سے زیادہ معاشرتی حوالے سے اور پاکستان کے سیاسی اور لسانی پہلو سے یہ اہم ہے کہ اختلاط نے ہر جگہ اور ہر زمانے میں بے اختلاطی کو شکست دی ہے۔ سنسکرت اسی بے اختلاطی سے مردہ زبان بن گئی۔ اوستا کی زبان کو آج ایران میں بھی گنتی کے چند لوگ سمجھنے والے ہیں لیکن لفظوں کا وہ اختلاطی رویہ اور رجحان جس نے ایران میں جدید فارسی کو اور یہاں ایک مخلوط زبان کے روپ میں

اردو کو جنم دیا دونوں جگہ کامیاب رہا۔ یہاں یہ رویہ اور بھی کامیاب ہو گیا ہوتا اگر میرے خیال میں ناسخ ایسے لوگوں نے تطہیر کے نام پر اسے مردہ زبان کے قریب نہ پہنچا دیا ہوتا اور برہمنوں کی طرح لفظوں کے استعمال کا سند نامہ جاری کرنے کا اختیار اپنے جیسے چند لوگوں کے ہاتھوں میں رکھنے کی غلطی نہ کی ہوتی اور اس کاررواں سرا کو حرم سرا بنانے کے شوق میں علاقائی زبان کا اس حرم میں داخلہ بند نہ کر دیا ہوتا۔ پاکستان بن جانے کے بعد ملک کی یہ خوش نصیبی تھی کہ اس کو صوبائی (علاقائی) بالادستی کی رسہ کشی سے بچانے کے لیے یہاں اردو موجود تھی۔ ورنہ تصور کیجیے کہ کسی ایک زبان کی بالادستی کی خواہش اس کے تمدنی پیرہن کو کس بری طرح تار تار کر دیتی۔ یہ بات میں پنجابی زبان و ادب کے ایک ایسے خادم کی حیثیت سے کہہ رہا ہوں جس نے پاکستان بن جانے کے بعد اردو کے تیروں کو انگریزی کے خلاف اٹھنے کی جگہ جو اس کی کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی، بالادستی اور خلط فکری کے زور میں مقامی بولیوں کے خلاف چلتے دیکھ کر اپنے ایک مضمون "اک سی اوٹھ تے اک سی بدو" کے پردے میں قبلہ درست کرنے کی بات کہی تھی۔

بجا کہ کارِ سرِ محبت کا سنگ ترا
ستم ہے جب بھی گرا جام و ساتگیں پہ گرا

اور آج بھی میں سمجھتا ہوں کہ اختلاط لسانی ہی میں لسانی افتراق و نفاق کے زہر کا تریاک ہے اور جس طرح ماضی میں مختلف قوموں کے ذخیرۂ الفاظ نے پاکستانی سرمایہ الفاظ میں اضافہ کیا تھا آج بھی اسی طرح ہونا چاہیے اور یہ جب ہی ممکن ہے کہ بالادستی کی جگہ یک جہتی کے لسانی رویے کو عام کیا جائے۔ پاکستانی اردو کے خدوخال کی بنیاد اور تونگری اسی میں ہے کہ ہر زبان کے الفاظ کو اپنے الفاظ سمجھا جائے۔ اردو وفاقی مسند سنبھالے اور ایک رابطے کی زبان کی حیثیت سے صوبائی زبانوں سے رابطہ رکھے اور ان کے سر پر

دست محبت رکھے۔ بقول حافظ:

بہیں بنائے محبت چہ محکم است، شکست
بکاخ کسریٰ خداداست و بیستوں برجاست

۱۔ ترنجنوں میں گاتا پھرے ہے اور کوئی بھی نہیں جانتا کہ اس کے دل میں کیا۔

۲۔ کسی حیلے سے اس مستانڑے کو دیکھیں جس کا ترنجنوں میں چرچا ہے۔

۳۔ وہ ترنجنوں میں بے وقار ہوتا پھر رہا ہے اور آنگن آنگن چکر کاٹ رہا ہے۔

۴۔ تیرے نامناسب تذکرے ترنجنوں میں ہو رہے ہیں اور پنیہاریوں کے لبوں پر تیری باتیں ہیں۔

۵۔ اے جوگی چل تجھے وہ جگہ دکھائیں جہاں نوخیزیں ترنجنوں میں نغمہ سرائی کرتی ہیں۔

۶۔ اجو نے ایسی بیٹی پال رکھی ہے جو زیادتیاں کرنے والی ہے۔ دست دراز ہے۔ مشٹنڈری ہے اور جس کا کام ترنجن ترنجن گھومنا ہے۔

۷۔ ترنجنوں میں بیاہی گئی خوبصورت لڑکیوں کو دیکھتے رہنا اس کا مشغلہ ہے اور پھر وہاں اپنے ساز کی تاریں چھیڑ دیتا ہے۔

۸۔ جمعہ کے دن ترنجنوں نے یوں گرد خیزی کی کہ جیسے مغلوں کا لشکر چڑھ آیا ہے۔

۹۔ شاہ پریوں کی طرح چھن چھنا چھن کرتی آرہی تھیں اور سہیلیوں کے بڑے ترنجن ہمراہ تھے۔

۱۰۔ ایک وہ ہیں جن کے پاس آٹا وافر مقدار میں ہے لیکن دوسری طرف وہ بھی ہیں جن کو منتانہ بھی نہیں ملتا۔ اور یہ تو آگے چل کر پتہ چلے گا کہ ضربیں دونوں میں سے کس طبقے کا مقدر ہوں گی۔

پاکستانی اُردو کے ثقافتی رویے

ایس ایم شاہد

زبان اس کے بولنے والوں کے ثقافتی رویوں کا مظہر ہوتی ہے۔ پاکستان میں اردو کے استعمال سے پاکستانی قوم کے بعض ثقافتی رویے (Cultural Attitudes) بہت واضح ہیں اور بعض ابھی مختلف مظاہر میں جھلک رہے ہیں۔ ایسے ہی چند روّیوں کا جائزہ لیا جا رہا ہے خاص طور پر جب ہم اردو کے اس استعمال کی بات کرتے ہیں جو صرف پاکستانی بول چال کے مخصر (Discourse) میں ہمارے سامنے آرہا ہے اور جسے آج ہم پاکستانی اردو کے نام سے معنون کر رہے ہیں جو پاکستانی ثقافتی رویے کا سماجی طور پر بھی اظہار کر رہی ہے۔

زبان اور تاش کا کھیل کئی طرح سے مناسبت رکھتا ہے جس طرح تاش کے پتوں میں یکا یا غلام، رانی یا بادشاہ کے کوئی خاص معنی نہیں ہوتے بلکہ کھیل کی مناسبت سے اور اس کے قوانین کے مطابق یہ پتے مختلف معانی اختیار کرتے ہیں اور تاش کے بیسیوں کھیل ہیں، اسی طرح زبان کا استعمال بھی تاش کے کھیل کی مانند ہے جس میں الفاظ کے کوئی مخصوص معانی نہیں ہوتے بلکہ برتنے والوں کے منشاء کے مطابق یا کھیل کے اصولوں کے مطابق یہ نئے معنی اختیار کر لیتے ہیں۔ چنانچہ مختلف الفاظ برتنے والی قومیں جس وقت اور جس طرح چاہے استعمال کریں۔ یہ نظریہ مکمل طور پر قابلِ قبول ہو یا نہ ہو مگر اس سے کم از کم یہ بات ضرور سامنے آتی ہے کہ زبان میں ترقی کی بہت گنجایش ہوتی ہے اور الفاظ کے معانی میں تیزی سے تبدیلی کسی حد تک اس قوم کی ترقی کی تیزی کی نشاندہی کرتی ہے اور کسی حد تک قوم کے رویوں اور اس کے مزاج میں

تبدیلی کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ ثقافت، قومی رویوں کا نام ہے اور یوں زبان ثقافتی اظہار کا نام ہے۔ اس حوالے سے پاکستانی کو ایک ترقی پذیر قوم کہا جا سکتا ہے، کیونکہ اس کی زبانوں مثلاً اردو، سندھی، پشتو، بلوچی، پنجابی میں بے شمار نئے الفاظ کا اضافہ ہوا ہے۔ ان کے معنی بدلے ہیں، بہت سے متروک ہوئے ہیں اور کئی نئے روپ میں ڈھلے ہیں۔ نئی ٹیکنالوجی کے حوالے سے بھی ذخیرۂ الفاظ پہلے کے مقابلے میں بہت بڑھ گیا ہے جبکہ سماجی میدان میں الفاظ کے استعمال میں ہنوز جمود محسوس ہوتا ہے۔ نئے محاورے، نئی ضرب الامثال، نئی کہاوتیں، نئی تشبیہات و تلمیحات نسبتۃً کم سننے یا بولنے میں آتی ہیں۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس حوالے سے نئے رویے، نئے زاویہ نگاہ ابھی پاکستانی قوم میں اپنی جگہ نہیں بنا سکے۔

قومی زبان، قومی رویوں، روایات اور ثقافت کی بھرپور ترجمان ہوتی ہے۔ اردو کا مزاج اس کے برتنے والوں کے مزاج سے خاصا ہم آہنگ ہے۔ پاکستان میں اردو کے اپنے رویوں میں خاصی تبدیلی آئی ہے۔ عام بول چال میں تو یہ تبدیلی حیرت انگیز ہے۔ اس کے محاورے، طرز ادا، جملوں کی ساخت وغیرہ میں علاقائی رنگ شامل ہو گیا ہے۔ پاکستان میں یہ زبان چاروں صوبوں میں مقامی لہجوں کے ساتھ بولی جاتی ہے اور روزمرہ کے بعض الفاظ بھی ایک صوبے سے دوسرے صوبے میں مختلف ہیں۔ تاہم یہ چھوٹے چھوٹے دائرے مل کر ایک بڑا قومی دائرہ بھی تشکیل کرتے ہیں جسے ہم پاکستانی اردو کا نام دے سکتے ہیں۔

پاکستانی اردو کے بعض ثقافتی رویّے قابل توجہ ہیں۔ جانداروں میں سے بیشتر ایسے جانور جو قوت کے مظہر ہیں، مذکر سمجھے جاتے ہیں۔ طاقتور اور خونخوار درندے مثلاً چیتا، بھیڑیا، بھالو، اژدہا، مذکر ہیں۔ خود لفظ "جانور" مذکر ہے۔ جبکہ کمزور جانور یا مظلوم جانور بھیڑ، چھچھوندر، چھپکلی، مکھی وغیرہ مؤنث ہیں۔ طاقت کا سب سے عظیم سرچشمہ

"خدا" بھی مذکر ہے اور منفی قوت کی علامت "شیطان" بھی مذکر ہے۔ اسی طرح فطرت کے طاقتور مظاہر مثلاً آسمان، سورج، چاند، ستارے، پہاڑ، دریا، سمندر مذکر ہیں۔ زبان کی یہ روایت ایک ایسے معاشرے کی عکاسی کرتی ہے جس میں مرد قوت کی علامت ہے اور عورت نزاکت، لطافت یا کمزوری کی۔ عورت قوت کے بل بوتے پر فائدہ یا ضرر پہنچانے سے قاصر ہے البتہ نیکی، بدی، چالاکی، ہمدردی، قربانی یا نرمی کے ذریعے اپنا منشا پورا کر سکتی ہے۔ یہ ساری صفات مؤنث ہیں۔ چند نازک اور خوبصورت پرندے مثلاً فاختہ، بلبل، مینا مؤنث ہیں اور بدصورت پرندے مثلاً کوا مذکر ہے۔ ہوا، اوس/شبنم، نسیم، صبا مؤنث ہیں اور عورت کی لطافت کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ زمین بھی مؤنث ہے۔ پاکستان کی دیگر زبانوں میں بھی تذکیر و تانیث کا ثقافتی رویہ کم و بیش ایسا ہی ہے۔ یہ روایتیں اور بعض محاورے پاکستانیوں کی سوچ کی ایک جھلک ہے۔ اب غور کیجیے ان الفاظ پر: قوت، طاقت، پستی، ہمت، صداقت، غیرت، محنت، ندرت۔ یہ سب صفات ہیں اور فرد کی بالقوہ (Potential) حالتیں ہیں۔ یہ علامتیں مؤنث اور مستور ہیں جبکہ انہی کی حقیقی فعال (Actual) حالتیں مذکر ہیں۔ چنانچہ "صداقت" مؤنث ہے تو "صادق" مذکر، "شجاعت" مؤنث ہے تو "شجاع" مذکر، اسی طرح "قوت" اور "قوی"، "قدرت" اور "قادر"، "ندرت" اور "نادر"، "غیرت" اور "غیور"، "ہمدردی" اور "ہمدرد نیکی" اور "نیک"، "بدی" اور "بد"، "سچائی" اور "سچ"، "چالاکی" اور "چالاک"، "مکاری" اور "مکار" وغیرہ۔ پاکستانی معاشرے میں عورت کو "مستور" سمجھا اور کہا جاتا ہے۔ وہ اب بھی مرد سے کمتر اور کسی قدر غیر مکمل سمجھی جاتی ہے۔ مرد درجہ کمال کے لحاظ سے عورت سے افضل سمجھا جاتا ہے اور بولنے والوں کی یہی سوچ تذکیر اور تانیث کی روایتوں میں کس حد تک ظاہر ہوتی ہے۔

بات کی وضاحت کے لیے تکرار بیان ایک عام پاکستانی عادت ہے۔ یہ عام مشاہدے کی بات ہے کہ کالج اور یونیورسٹی کے طلبہ و طالبات سوالات کے مختصر اور

جامع جواب لکھنے کی بجائے طویل جواب دینا یا لکھنا اور ایک ہی بات کئی بار دہرانا پسند کرتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ اس طرح وہ استاد کو زیادہ متاثر کر سکیں گے اور اچھے نمبر حاصل کر لیں گے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ان کی یہ توقع زیادہ غلط بھی نہیں۔ واقعی طویل جواب لکھنے والے اچھے نمبر حاصل کر لیتے ہیں خواہ یہ طوالت مکرر بیان کی وجہ سے ہو۔ اس کے برعکس امریکی جامعات کے طلبہ و طالبات نہایت مختصر جواب لکھتے ہیں۔ اگر طالب علم بہت ذہین اور مضمون سے واقف ہے تو تمام اہم نکات کو مختصراً بیان کر دے گا۔ اگر اسے جواب یاد نہیں تو مختصراً جو یاد ہے وہ لکھ دے گا لیکن مکرر ایک ہی بات لکھنے سے گریز کرے گا۔ یہی تکرار زبان میں مہملات پیدا کرتا ہے۔ بامعانی الفاظ کے ساتھ مہمل الفاظ کا استعمال اردو کی ایک دوسری اہم روایت ہے۔ مثلاً "چائے وائے، دانہ دنکا، پانی وانی، ذات پات" یا پھر ملاحظہ ہوں ہم معنی یا قریب المعنی الفاظ جو اکثر ایک ہی جملے میں استعمال ہوتے ہیں۔ مثلاً لطف و کرم، رنج والم، شعر و سخن، شرافت و نجابت، جاہ و حشمت، شان و شوکت، مال وزر، حیلہ بہانہ "عجز وانکسار" وغیرہ یا پھر ملاحظہ ہو ایک ہی لفظ کا جملے میں دو بار استعمال۔ "جستہ جستہ، خاص خاص، زور زور، باری باری، الگ الگ، چیدہ چیدہ، صاف صاف"۔

عام بول چال میں ہندی ذخیرہ الفاظ یعنی اردو کے اپنے خالص الفاظ جنھیں غلطی سے ہندی کہا جاتا ہے اور ایسی ترکیبوں کا استعمال رائج ہے جبکہ علمی اور ادبی گفتگو میں فارسی اور عربی ذخیرۂ الفاظ اور ترکیبوں کو ترجیح دی جاتی ہے مثلاً روزمرہ گفتگو کا ایک فقرہ یوں ہے۔ "میں بھول گیا" تو علمی گفتگو میں بھول کی جگہ لفظ "سہو" کو ترجیح دی جائے گی۔ عام بول چال میں ایک جملہ اگر یوں ادا ہو گا کہ "جان بوجھ کر ایسا نہ کرو" تو علمی گفتگو میں "جان بوجھ" کی جگہ "قصداً" لے لے گا۔ اس کی غالباً ایک وجہ یہ ہے کہ ہندو پاک کے مسلمان عربی، ترکی اور فارسی کلچر سے محبت رکھتے ہیں اور ان کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھتے ہیں کیونکہ ان کے ساتھ ایک ہم مذہبی کا برادرانہ رشتہ ہے۔ اسی لیے

علمی گفتگو میں ان کے ذخیرۂ الفاظ کو ترجیح دیتے ہیں۔ اردو میں اللہ کو "خدا" اور "یزداں" تو کہا جاتا ہے لیکن "بھگوان" یا "ایشور" کہنے کی کوئی روایت نہیں۔ ہندوستان اور پاکستان کے مسلمانوں کے یہاں افراد کے نام بھی فارسی، ترکی، عربی ذخیرۂ الفاظ سے لیے جاتے ہیں یا مقامی زبانوں سے نام رکھے جاتے ہیں۔ ہندی ناموں کا یہاں کوئی رواج نہیں۔ مثلاً عمر، عابد، نسیم، فہیم وغیرہ پاکستانی مسلمان بچوں کے نام ہیں۔ "بھگوت، دیال، ببر شیر، مہندر، پرکاش" نہیں۔

مراتب اور طرز تخاطب کے حوالے سے اردو زبان کی ایک اہم روایت جمع کے صیغہ کی مناسبت سے الفاظ کا استعمال ہے۔ "تو" کا استعمال کم حیثیت ملازموں اور بے تکلف دوستوں تک ہے۔ بعض غیر تعلیم یافتہ گھرانوں میں بچوں کو بھی "تو" کہہ کر مخاطب کیا جاتا ہے۔ یا صرف اللہ کی ذات کے لیے توحید کے حوالے سے استعمال ہوتا ہے۔ "تم"، ہم عمروں، دوستوں، بچوں، شاگردوں اور چھوٹوں کے لیے مخصوص ہے۔ "آپ" والدین، اساتذہ، بزرگوں، اجنبیوں یا ایسے اصحاب کے لیے ترجیحاً استعمال ہوتا ہے جن سے رسمی ملاقات ہو یا زیادہ بے تکلفی نہ ہو۔ "جناب" اور "حضور" انگریزی کے "سر" کے ہم معنی ہے۔ "حضور والا"، "عالی جناب" قسم کے القاب اب پاکستانی گفتگو میں کم ہی استعمال ہوتے ہیں۔ پڑھے لکھے اور مہذب گھرانوں میں گھریلو ملازمین، بڑھئی، موچی، نان بائی اور اسی قسم کے طبقوں کے لوگوں کو بھی اب "تم" اور "تو" کہہ کر مخاطب کرنے کی روایت ختم ہوتی جا رہی ہے۔ اسی طرح حکومت میں کمتر درجے کے ملازمین بھی اب اپنے اعلیٰ عہدوں پر فائز ملازمین کے ساتھ تخاطب میں ایسی خاکساری کا مظاہرہ نہیں کرتے جتنا تقسیم ہند سے پہلے کرتے تھے۔ اپنے لیے شاہی جمع متکلم "ہم" اب استعمال نہیں ہوتا۔ جس سے پتہ چلتا ہے کہ ان لوگوں میں بھی عزت نفس بڑھی ہے۔

خاندان کے افراد ایک دوسرے کو مخاطب کرتے وقت عمر اور مراتب کا لحاظ رکھتے ہیں۔ اسی طرح اس خاندان سے قریبی تعلق رکھنے والے افراد بھی افراد خاندان کو مخاطب کرتے وقت وہی القاب استعمال کرتے ہیں جو خود اس خاندان میں رائج ہیں۔ مثلاً سلیم اگر سعید کا دوست ہے تو سعید کے چھوٹے بہن بھائی اسے "سلیم بھائی" پکاریں گے۔ جبکہ والدین "سلیم بیٹا" کہیں گے۔ اسی طرح بہن کی سہیلیاں اگر بڑی ہیں تو "شازیہ آپا"، "طلعت باجی" وغیرہ پکاری جاتی ہیں۔ ورنہ "منی، بی بی" وغیرہ۔

خاندان اور دوستوں کے حلقوں سے باہر بھی اس روایت کی توسیع نظر آتی ہے۔ چنانچہ اجنبیوں کو بھی "بھائی"، "چچا"، "اماں"، "خالہ"، "آنٹی"، "بڑے میاں" کہہ کر پکارنا عام سی بات ہے۔ یہ روایت اسلامی تہذیب کا ورثہ ہے۔ جس میں قوم کو ایک برادری تصور کیا جاتا ہے۔ اس روایت کے بعض پہلو بڑے دلچسپ ہیں۔ مثلاً عمر رسیدہ عورت کو اجنبی نوجوان عورت یا مرد اکثر "خالہ" یا "آنٹی" (دیہاتی اور شہری، نچلے اور درمیانے طبقے کی تفریق کے ساتھ) کہہ کر بلاتے ہیں لیکن "پھوپھی" کہنے کا کوئی رواج نہیں۔

"تمہارے چچا کا گھر ہے؟"، "تمہاری خالہ کا گھر؟" قسم کے طنزیہ جملے چچا اور خالہ کی فضیلت اور ان سے توقعات کے ترجمان ہیں لیکن ماموں اور پھوپھی سے توقعات کچھ کم ہی وابستہ ہیں۔ کبھی کبھی ماموں کی حیثیت سمٹ کر ایک خیالی فرد کی سی رہ جاتی تھی جیسے "چندا ماما" تاہم پاکستانی معاشرے میں ماما ایک ذمہ دار رشتہ ہے جو خاص طور پر بیٹیوں/بھانجیوں کے سلسلے میں اپنی ذمہ داری ادا کرتا ہے۔ اردو کی ایک روایت گھریلو ملازمین کے القاب سے متعلق ہے۔ گھروں میں کام کرنے والی غیر مستقل ملازمائیں "ماسی" کے لقب سے پکاری جاتی ہیں۔ "ماسی" کے معنی "خالہ" کے ہیں۔ بعض علاقوں میں "مائی"، "اماں" بھی کہا جاتا ہے۔ مرد ملازم "چچا" یا "بابا" کہلاتے ہیں ورنہ نام سے

پکارے جاتے ہیں۔ البتہ خاتون ملازمہ کو صاحب خانہ نام سے پکارنے سے گریز کرتا ہے کیونکہ پاکستان میں عموماً کسی مرد کا غیر عورتوں کو نام سے پکارنا معیوب سمجھا جاتا ہے۔ کیونکہ نام سے پکارنا بے تکلفی ظاہر کرتا ہے۔

پاکستانی اردو میں جیسا کہ ڈاکٹر عطش درانی نے بھی واضح کیا ہے۔ ایک نمایاں تبدیلی انگریزی کے زیر اثر آئی ہے۔ انگریزی ذریعۂ تعلیم کا فروغ بھی اس کا ایک اہم ذریعہ ہے۔ بے شمار پاکستانیوں نے تعلیم اور اقتصادی مواقع حاصل کرنے کی غرض سے انگلستان، امریکہ اور دوسرے مغربی ممالک میں ہجرت کی۔ ان میں سے بعض نے وہاں مستقل رہایش اختیار کی اور بعض اقتصادی اور تعلیمی اغراض پوری ہونے کے بعد پاکستان واپس آگئے نیز پاکستان میں ریڈیو، ٹیلی وژن اور سینما ہالوں میں انگریزی فلمیں بکثرت دکھائی جاتی ہیں۔ ان کے علاوہ مختلف موضوعات پر انگریزی میں تبصرے بھی ٹیلی وژن اور ریڈیو سے نشر ہوتے ہیں۔ ان حالات میں انگریزی الفاظ کا اردو میں شامل ہونا ایک قدرتی امر ہے جو تیزی سے جاری ہے۔

تعلیم یافتہ اور خوشحال گھرانوں میں تو خصوصاً بچے، بڑے گفتگو میں انگریزی الفاظ کا بکثرت استعمال کرتے ہیں۔ خالص اردو سیکھنا اور بولنا اب صرف ادبی اور علمی حلقوں کی روایت ہے۔ خوشحال اور تعلیم یافتہ گھرانوں کے بچوں کے لیے اب انگریزی الفاظ کی ملاوٹ کے بغیر اردو بولنا تقریباً ناممکن ہوتا جا رہا ہے۔ ملاحظہ ہو چند انگریزی الفاظ اور فقرے جو روزمرہ اردو گفتگو میں بکثرت استعمال ہوتے ہیں:۔

"Please", "Thankyou", "Wow", "Not at all", "Really", "No, way", "Absolutely", "Sorry", "Take easy", "Great", "Good Heavens", "for God's sake", "Stop it", "Mind your language" وغیرہ۔ اس قسم کے فقرے اب خوشحال گھرانوں

کی اردو روزمرہ کا حصہ بن کر رہ گئے ہیں۔ اردو ڈراموں میں ایسے تعلیم یافتہ اور خوشحال گھرانے کے نوجوانوں کی زبان، بود و باش، احساسات اور توقعات کی عکاسی کی جا رہی ہے۔ انگریزی فقروں کے استعمال کی وجہ سے ایک غریب اور کم حیثیت نوجوان (عورت یا مرد) اور ایک خوشحال گھرانے کے فرد میں با آسانی فرق کیا جا سکتا ہے۔ ان کی وجہ سے ہمارا معاشرہ اب دو طبقوں میں بٹ گیا ہے۔ "کلچرڈ" طبقہ جو انگریزی الفاظ کے استعمال پر قادر بھی ہے اور مجبور بھی۔ دوسرا "اَن کلچرڈ" طبقہ جو انگریزی الفاظ یا فقروں کے استعمال پر قدرت نہیں رکھتا اور سیدھی سادی اردو کے استعمال پر مجبور ہے۔

ہمارا نوجوان "کلچرڈ" طبقہ البتہ ایک مشکل صورت حال سے دوچار ہے۔ ان نوجوانوں کے لیے سیدھی سادی اردو میں چار جملے لگاتار ادا کرنا تقریباً ناممکن سا ہوتا جا رہا ہے۔ اگر بمشکل دو جملے اردو میں ادا کرتے ہیں تو تیسرا جملہ لازماً انگریزی میں ادا کرنے پر مجبور ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ "کلچرڈ" نوجوانوں کو یقین ہی نہیں کہ وہ کس زبان میں گفتگو کرنا چاہتے ہیں۔ بار بار انگریزی سے اردو اور پھر اردو سے انگریزی کی طرف پلٹنے سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ یہ نوجوان واضح طور پر اپنا ثقافتی تشخص طے نہیں کر پا رہے اور اپنے کلچر کے معاملے میں بے یقینی کا شکار ہیں۔ آج سے بیس تیس برس پہلے یہ صورت حال نہ تھی۔ اس وقت پاکستان میں تعلیم یافتہ نوجوانوں میں دو رجحانات تھے یا تو صرف انگریزی بولنا یا صرف اردو بولنا۔ انگریزی سکولوں اور کالجوں کے پڑھے ہوئے بعض نوجوان عام طور پر انگریزی میں گفتگو کرنے میں فخر محسوس کرتے تھے۔ اس طبقے نے یوں بھی انگریزی کلچر کو کسی حد تک اپنا لیا تھا یا کم از کم اس سے مرعوب تھا، جبکہ اردو ذریعۂ تعلیم کے تحصیل یافتہ اردو میں گفتگو کرتے تھے، لیکن انگریزی سے اردو کی طرف پلٹنا اور پھر اردو سے انگریزی کی طرف پلٹنے والی کیفیت دونوں میں کسی طبقے پر بھی طاری نہ تھی۔ ڈپٹی نذیر احمد کا ناول "ابن الوقت" اسی کا تجزیہ کرتا ہے۔

بزرگوں اور سنجیدہ تعلیم یافتہ اور خوشحال افراد گھر میں انگریزی اور اردو کے درمیان جدوجہد کی یہ کیفیت نظر نہیں آتی کیونکہ پختہ عمری میں عام طور پر اپنی ثقافت سے محبت اور اس پر بھروسا ایک قدرتی امر ہے یا پھر وہ پرانی نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔

۔ اردو زبان میں علاقائی زبان کے الفاظ کی شمولیت بھی ڈاکٹر عطش درانی نے ایک اہم خصوصیت قرار دی ہے اور شمولیت کی یہ رفتار بھی تیز تر ہو کر پاکستانی ثقافت کا اہم رویہ بنتی جا رہی ہے۔ بے شمار پنجابی، سندھی، بلوچی، سرائیکی اور پشتو الفاظ اردو زبان کا حصہ بن گئے ہیں۔ "لشکارہ" (چمک)، "سائیں (صاحب، جناب)، "شاوا" (کلمۂ تحسین) اب اردو روزمرہ کا حصہ بن چکے ہیں۔ "بندہ" انکسار کے لیے بھی بولا جاتا تھا، کیونکہ اس کے معنی غلام یا فدوی کے ہیں۔ پنجابی کے زیر اثر اب "بندہ" کسی بھی "فرد" یا "آدمی" کے لیے بولا جاتا ہے۔

پاکستانی اردو بول چال میں "عین قاف" کا کوئی مسئلہ نہیں۔ اب "ق" کی حلق سے ادائیگی پر کوئی زور نہیں اور "ق" اور "ک" کے فرق کے مٹ جانے کو ذہنی طور پر قبول کر لیا گیا ہے۔ روزمرہ بدل چکا ہے۔ "میں نے کرنا ہے" یا "میں نے جانا ہے" اب غلط العام فصیح ہیں۔ "جگنی" (خچر) "کھوتا" (گدھا) عام اردو بول چال میں شامل ہو گئے ہیں۔ "لڈی"، "بھنگڑہ"، "ہوجمالو" جیسے الفاظ صرف اردو زبان کا حصہ ہی نہیں بنے بلکہ شادی بیاہ کے موقعوں پر لڑکیاں بالیاں گھروں میں بھی یہ رقص کر کے ہلہ گلہ کرتی ہیں۔ "اجرک" اب صرف اردو زبان کا حصہ ہی نہیں بلکہ اجرک پہننے کا رواج بھی عام ہو گیا ہے۔ اسی طرح "رلی" نے اردو کے ذخیرۂ الفاظ ہی میں اضافہ نہیں کیا بلکہ "رلی" گھروں میں سجاوٹ کے لیے بھی استعمال ہونے لگی ہے۔ "سجی" کا لفظ محض کھار کے لیے استعمال نہیں ہوتا بلکہ یہ بلوچستان کا معروف بھنا گوشت ہے۔

معاشرتی مسائل اور حالات کے ساتھ ساتھ نئے محاورے اور نئے الفاظ اور نئے

پیرائے جنم لیتے ہیں اور ثقافت کی نئی سمتوں کا تعین کرنے میں مدد دیتے ہیں۔ ترقی یافتہ قوموں کی زبانیں بھی اسی حساب سے ترقی کرتی ہیں اور اپنے اندر وقت کے نئے تقاضوں کے بیان کی صلاحیت رکھتی ہیں۔ زبان کی یہ تبدیلی ایک فطری عمل ہے۔ چونکہ زبان ابلاغ کا سب سے مؤثر ذریعہ ہے لہٰذا اس کی پرورش میں صحت مند روایتوں کی پرورش کا خاص خیال رکھنے سے معاشرے میں تہذیب یا تمدن بڑھتا ہے۔ غالب نے اپنے خطوط میں طویل القاب و آداب کو ترک کر کے محبت اور یگانگت کی ایک نئی روایت ڈالی تھی۔ اس کے برعکس مغلیہ سلاطین نے اپنے اور رعایا کے درمیان فرق قائم کرنے کی غرض سے طویل القاب و آداب پر زور دیا تھا۔ مساوات اور بھائی چارے کی جو تعلیم اسلام نے دی ہے اس قسم کے طویل آداب و القاب سے اس کی نفی ہوتی ہے۔ امن و سلامتی کا پیغام لوگوں کے دلوں میں پہنچانے کے لیے قرآن حکیم نے "السلام علیکم" (سلامتی ہو تم پر) اور "و علیکم السلام" (آپ پر بھی سلامتی ہو) کہہ کر ایک دوسرے سے ملاقات کا آغاز کرنے کی ہدایت کی اور شائستہ گفتگو پر زور دیا۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستانی اردو میں "آداب"، "تسلیمات" کی جگہ "السلام علیکم" کہا جاتا ہے البتہ "و علیکم السلام" کہنا معیوب سمجھا جاتا ہے، جواباً بھی "السلام علیکم" کہا جاتا ہے۔ آداب کی تبدیلی بھی پاکستانی ثقافتی رویوں کا اہم مظہر ہے۔ ایسے ہی مظاہر کا مطالعہ ہمیں پاکستانی اردو کا صحیح تجزیہ کرنے میں مدد دے گا۔

حصہ ششم

مذاکرہ

پاکستانی اردو پر مذاکرہ

محمد بخش ہاشمی

فکری تحریک کے ہفتہ وار تنقیدی اجلاس ۲۶ جنوری ۱۹۹۶ء میں مقتدرہ قومی زبان کے صدر نشین افتخار عارف کی صدارت میں ڈاکٹر عطش درانی نے اپنا مقالہ "پاکستانی اردو کے خدوخال" پیش کیا۔ کارروائی کا آغاز بشیر حسین ناظم نے تلاوت کلام پاک سے کیا۔ فکری تحریک کے معتمد جناب خالد صدیقی نے سابقہ اجلاس کی کارروائی پڑھ کر توثیق کے لیے پیش کی۔

ڈاکٹر عطش درانی کا بنیادی فرضیہ (Hypothesis) یہ تھا کہ پاکستان میں مستعمل اردو زبان اپنے قدیم، کلاسیکی اور معاصر ملکوں کے انداز سے جدا، ممتاز اور منفرد ہو چکی ہے۔ اس کے لیے انھوں نے دلائل، شواہد اور مثالیں بطور حوالہ پیش کیں، جن میں انگریزی آمیزی اور مقامیت کے اثرات بنیادی اہمیت رکھتے ہیں۔ انھوں نے ایک تحقیق کار کی طرح محض حقائق پیش کرتے ہوئے کہا کہ معلوم نہیں آگے چل کر اردو کا انداز کیا ہو کیونکہ اب تو بڑے چھوٹے اکثر ادیب، نقاد اور صحافی ان رجحانات پر عمل کر رہے ہیں۔ یقیناً اس سے زبان کا کینڈا بدلا ہے۔ پچھلے پچاس برسوں میں اردو پاکستان میں آ کر اپنے املا، ہجوں، حروف تہجی، معانی، تراکیب، مرکبات، محاوروں، روزمروں، لہجوں، اسلوبوں اور استعمالات کے لحاظ سے بہت بدل چکی ہے۔ بول چال، لین دین اور رابطے کے حوالے سے تو زبان میں یہ عمل تیزی سے جاری تھا، اب ادبی سطح پر بھی زبان کی رنگت مختلف ہو رہی ہے۔

بحث کا آغاز کرتے ہوئے احمد جاوید نے کہا کہ مقالہ نگار نے ایک اہم موضوع

کی طرف ہماری توجہ مبذول کرائی ہے۔ تاہم انھوں نے ان اسباب سے آگاہ نہیں کیا، جو الفاظ و معنی کو اس نہج پر لاتے ہیں۔ ادیب تو زبان کی پرتوں کو آگے بڑھاتے رہتے ہیں۔ وہ لکھنے کے لیے الفاظ تلاش کرتے رہتے ہیں، لیکن وہ کون سے عناصر ہیں جو انھیں اپنی طرف کھینچتے ہیں۔

ڈاکٹر انعام الحق جاوید نے رائے دیتے ہوئے کہا کہ یہ مقالہ بڑی محنت اور توجہ سے تیار کیا گیا ہے اور مقالہ نگار جس طرح مثالیں تلاش کر کے لائے ہیں، اس کی داد دینی چاہیے البتہ یہ بات قابل توجہ ہے کہ جوں جوں ہم آگے بڑھ رہے ہیں، توں توں انگریزی ہم پر بُری طرح غلبہ پا رہی ہے۔ یہ غلبہ بہت حد تک بے جا اور غیر ضروری ہے۔ ڈاکٹر حامد سلیم نے کہا کہ جب کوئی کلچر سائنس اور ٹکنالوجی کے حوالے سے غلبہ حاصل کرتا ہے تو وہ دوسرے کلچر پر حملہ آور ہوتا ہے لہٰذا ہمیں اس طرف توجہ دینی چاہیے۔ یہ اثرات تو یقیناً آ کر رہیں گے۔ ڈاکٹر گوہر نوشاہی نے گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ پاکستانی اردو کے خدوخال کو وہ الگ نہج سے دیکھتے ہیں اور اس بارے میں اپنی الگ رائے رکھتے ہیں۔ ایک زبان کا کسی دوسری زبان میں داخل ہو جانا کسی نئی زبان کی تشکیل کا سبب نہیں بنتا۔ بطور مثال انھوں نے کہا کہ جہاں تک انگریزی الفاظ کے استعمال کا تعلق ہے، یہ انیسویں صدی میں بھی عروج پر تھا۔ سرسید کے دور میں ان کے رفقا کے ہاں انگریزی الفاظ کی کثرت ہے۔ اقبال کے دور میں بھی یہ استعمال کم نہیں ہوا۔ یہ ایک لسانیاتی کلچر کا مسئلہ ہے اور آج کے مقالے کو ہمیں اسی حوالے سے دیکھنا چاہیے تاہم مقالہ نگار نے اس موضوع پر قلم اٹھانے میں پہل کی ہے۔ دوسرے لوگ بھی طبع آزمائی کریں اور پاکستانی کلچر کے حوالے سے اس موضوع کے مختلف پہلوؤں پر اپنے اپنے نقطۂ نظر سے جائزہ لیں۔ ڈاکٹر انعام الحق جاوید نے ایک بار پھر اپنی رائے دیتے ہوئے کہا کہ سرسید کے رفقا کے ہاں انگریزی کی چند ایک مثالیں اس

دور کے سارے اردو ادب اور زبان کے لیے کلیہ نہیں بنتیں، اگر کوئی محمد حسین آزاد کے یہاں اس کثرت کو تلاش کر دے تو پھر ہم کہیں کہ اردو کے ساتھ زیادتی ہو رہی تھی۔ البتہ موجودہ دور میں اردو میں انگریزی کا استعمال بہت بڑھ چکا ہے۔

انجم خلیق نے اظہار رائے کرتے ہوئے کہا کہ دراصل مقالہ نگار کو دیگر زبانوں کے الفاظ کے دخل سے خوف محسوس ہوا ہے جبکہ اردو زبان میں دوسری زبانوں سے اخذ و اکتساب کی اہلیت موجود ہے۔ ان کے خیال میں مسائل گھبرانے کے نہیں۔ سلیم گیلانی نے کہا کہ ڈاکٹر سید عبداللہ نے کہا تھا کہ اب تراڈ کھل سے کراچی تک اردو زبان وہ ہوگی جو ٹرک ڈرائیور بولیں گے۔ ڈاکٹر ڈبلیو ایم ذکی نے اس کی توثیق کرتے ہوئے کہا کہ اسی لیے پاکستان میں اردو کا انداز بدلا بھی ہے اور مزید بھی بدلے گا۔ ہمیں اس مقالے کو اسی تناظر میں دیکھنا چاہیے۔ فکری تحریک کے صدر ڈاکٹر اعجاز حنیف نے کہا کہ اس موضوع پر اپنی نوعیت کا یہ پہلا مقالہ ہے جو ایسے موضوع کو سامنے لاتا ہے جس پر مزید بحثیں ہو سکتی ہیں اور جاری رہ سکتی ہیں۔

آخر میں صاحب صدر افتخار عارف نے اپنے صدارتی کلمات میں کہا کہ ڈاکٹر عطش درانی نے ایک بالکل سامنے کے موضوع کو پیش کیا ہے۔ ان کی بعض باتوں سے اختلاف ہو سکتا ہے، تاہم انھوں نے بڑا کام کیا ہے اور بنیادی حیثیت کا سوال اٹھایا ہے کہ جو اردو اب بولی اور لکھی جا رہی ہے، اس میں آزادی کے بعد سے کتنا فرق آچکا ہے، اس کا لب و لہجہ کیا وہی ہے جو پہلے تھا کیونکہ لب و لہجہ زبان پر اثر انداز ہوتا ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ "قضیے" اسی لیے ہوتے ہیں کہ ان پر گفتگو ہو سکے۔ تحقیق کے ذریعے اس کا تناظر فراہم ہوتا رہنا چاہیے۔ اردو گذشتہ پچاس برسوں سے چلن اور استعمال میں ہے۔ زبان کسی حکم سے نافذ نہیں ہوتی۔ اس کا اثر و نفوذ اس کے چلن سے وابستہ ہوتا ہے۔ پاکستانی اردو، آزادی سے پہلے کی اردو اور ہمسایہ ملکوں کی اردو سے یقیناً مختلف

ہو چکی ہے۔ ان کے بعض ادیب ہمارے اسلوب کے تتبع میں لکھ رہے ہیں جبکہ ان کے سینکڑوں دیگر ادیبوں کا انداز اور کینڈا مختلف ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ ہمیں ان سیاسی، سماجی اور دیگر تقابلی و پس منظری عوامل کا تجزیہ کرنا چاہیے جو پاکستان میں اردو کے اس جدا اور منفرد کینڈے کا سبب بن رہے ہیں۔ ڈاکٹر عطش درانی پہلے محقق ہیں جو ہماری توجہ اس کے خدوخال کی طرف کھینچنے میں کامیاب رہے ہیں۔

اس نشست میں ریاض الحسن، احسان اکبر، خلیق انجم ، سعید احمد، اختر شیخ اور بہت سے دوسرے اہل علم و قلم نے شرکت کی۔ نظامت کے فرائض خالد صدیقی نے انجام دیے۔

PAKISTANI URDU
KE
KHAD-O-KHAL

Ed. by

DR. ATTASH DURRANI

NATIONAL LANGUAGE AUTHORITY
PAKISTAN